ماہنامہ
چیف ایڈیٹر: محمود شام
انتہاؤں میں رابطہ

# اطراف

کراچی
123
اکتوبر 2024

## پاکستان۔ ذہنی مریضوں میں اضافہ

## قوم ایک دوراہے پر

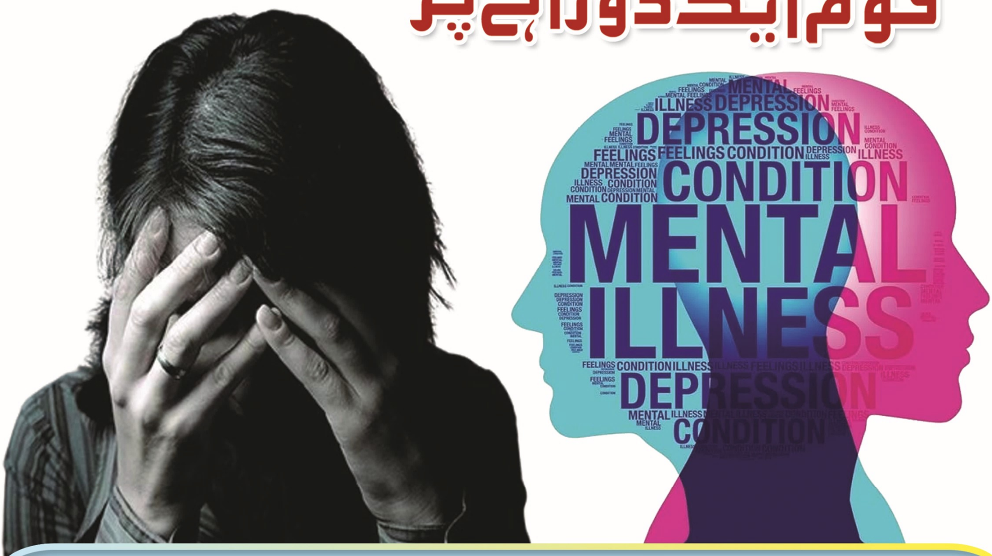

میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی۔؟

دنیا بھر سے 'اطراف' کے کرم فرماؤں کے جوابات۔ جائزہ 1

قیمت: پاکستان میں 400 روپے
بیرون پاکستان۔ 5 ڈالر

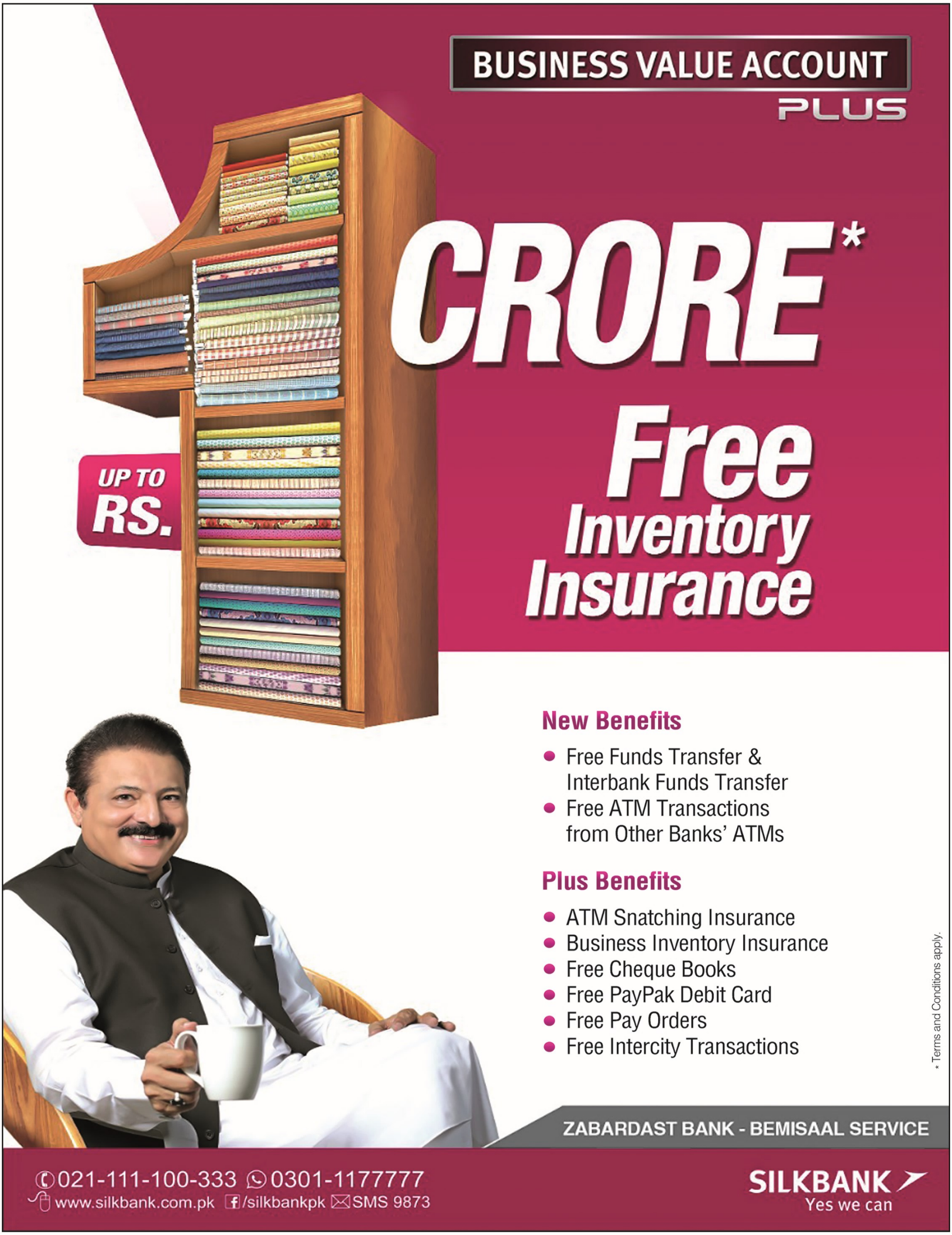
BUSINESS VALUE ACCOUNT
PLUS
UP TO RS.
1 CRORE*
Free Inventory Insurance
New Benefits
Free Funds Transfer & Interbank Funds Transfer
Free ATM Transactions from Other Banks' ATMs
Plus Benefits
ATM Snatching Insurance
Business Inventory Insurance
Free Cheque Books
Free PayPak Debit Card
Free Pay Orders
Free Intercity Transactions
* Terms and Conditions apply.
ZABARDAST BANK - BEMISAAL SERVICE
021-111-100-333
0301-1177777
www.silkbank.com.pk
/silkbankpk
SMS 9873
SILKBANK
Yes we can

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

# اطراف

کراچی

جلد 11 شمارہ: 10

اکتوبر 2024

قیمت فی پرچہ: 400 روپے۔ سالانہ: 4000 روپے۔ بیرون ملک۔ 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر : محمود شام
mahmoodshaam@gmail.com

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا)

نگراں شعبۂ اولاد۔ تربیت۔ تواضع : رخشندہ محمود  نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ)

ڈیزائن: محمد شاہد رفیق : عکاسی: شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

ویب سائٹ اہتمام : www.launchpad.pk

پبلک اور میڈیا ریلیشنز : دی پیسیج : www.thepassagepr.com

قانونی مشیر : نفیس صدیقی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ nafislaw@cyber.net.pk

اکتوبر خاص
میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟
قارئین کے دلچسپ اور قیمتی خیالات 17-36

ذہن بیمار۔ ریاست بیمار
اطرافیہ 05

پاکستان کی ذہنی صحت
☆ پریا خان (متحدہ عرب امارات) 09-10

امریکی انتخابات 2024 اور اہم عالمی مسائل
☆ عاصم متین، نمائندہ خصوصی امریکہ 11-13

Feel Like
☆ غزالہ خالد 16

زندگی سے بڑے لوگ
☆ سینئر صحافی حسین نقی سے انٹرویو 37-41

ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم
☆ اطراف رپورٹ 42-46

عمر کا سورج
☆ سعیدہ افضل کی آپ بیتی 47-50

پیر الٰہی بخش۔ قائداعظم کے رفیق کار
☆ علی اصغر 51-54

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا
☆ فرید ذکریا 55-58

اسکردو کا حسن و جمال
☆ ظہیر قندیل 59-62

کراچی پریس کلب کی اعزازی رکنیت
تقریب سے محمود شام کا خطاب 63-66

ٹی وی ڈرامامافیا
☆ عمران سلیم 67-69

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟
☆ سید ارتقا احمد زیدی 71-72

بنگلہ دیش فسطائیت سے حقیقی آزادی کی طرف
☆ فرح فیصل خان 69-74

تذکرہ کتابوں کا
☆ خان ظفر افغانی 83-84

یونیورسٹیاں | تربیت | ٹی وی ڈرامہ | حسن و زیبائش | تیمارداری | یادداشتیں

لائبریریاں | سائنسی ادارے | معیشت | سیاحت | مشترکہ خاندان | بین الاقوامی کتابیں

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت: اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

# Kundun

**Now Introduces 3 - 5 Pieces New Design Trolly Bags With Small Beauty Case Different Colour Original Fiber Material JIAN LUGGAGE Is The Best Way For Travelling**

**Also Deals in Shawls , Kashmir Shalws, Pashmina, Embroidery Shahtoosh, Kalamkar & Jamawar**

**Address: Adullah Haroon Road Opp. Hotel Metropole.**
**Ph: +92 21 35686641-42 Fax: +92 21 35684349**

# ذہن بیمار۔ ریاست بیمار

پاکستان کو پہلے دن سے ہی فکری مغالطوں۔ مخمصوں اور مباحثوں میں الجھایا گیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں اپنے لیے ایک الگ وطن ہی ضروری خیال کیا۔ جو اِن علاقوں میں قائم کیا جائے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ اپنی زندگی اپنے دینی شعائر کے مطابق آسانی سے گزار سکیں۔ مسلمانوں کا ہی ایک گروہ ایسا تھا۔ جو قیام پاکستان کے فلسفے سے متفق نہیں تھا۔ وہ آل انڈیا کانگریس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں موجود تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ہم متحدہ ہندوستان میں اقلیت میں ضرور ہوں گے۔ لیکن حساس صوبوں میں اکثریت میں ہونے کی وجہ سے سیاسی طور پر غالب حیثیت میں ہوں گے۔ پھر انڈیا پر قابض برطانوی سرکار نے جاتے جاتے مسلمانوں سے ریڈکلف ایوارڈ میں زیادتی کی۔ حیدرآباد دکن، جونا گڑھ ریاستوں پر بھارت کو قابض ہونے دیا۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود اس کا الحاق زبردستی بھارت سے کروادیا۔

پاکستان کے قیام کی خوشی، غموں میں لپٹی ہوئی ملی۔ لاکھوں مسلمان ہجرت پر مجبور کیے گئے۔ پاکستان پہنچنے سے پہلے شہید کردیے گئے۔ وطن کے حصول کی جدوجہد میں پاکستان مسلمان۔ مہاجر۔ انصار کامیاب تو ہوئے لیکن مایوسیوں، بے یقینیوں کے حصار میں۔ پاکستانیوں سے مشترکہ اثاثوں کی تقسیم میں ناانصافیاں ہوئیں۔ پھر بانی پاکستان ایک سال بعد ہی چل بسے۔ ایک نئی ریاست کے شہریوں کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ 4 سال بعد وزیراعظم لیاقت علی خان۔ قائداعظم کے دست راست راولپنڈی میں شہید کردیے گئے۔

ایک ایسی قوم جس کی تاریخ کا آغاز ہی المیوں سے ہوتا ہے۔ پھر ایک بڑے دشمن ہمسائے کی طرف سے کسی وقت بھی حملے کا خطرہ۔ اپنے حکمرانوں کی لوٹ مار۔ پاکستانیت کی بجائے صوبائیت۔ لسانیت کی یلغار۔ قائداعظم نے جن برائیوں کا احساس دلایا تھا۔ اور جن اقدامات سے گریز کی ہدایت دی تھی۔ ان میں بھی الجھایا گیا۔ قائداعظم کے 11 اگست 1947 کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب میں انہوں نے رہتی دنیا تک پاکستانی معاشرے کے خدوخال بیان کیے تھے۔ ان پر عمل نہ کیا گیا۔

پاکستان کے قیام کے چھٹے سال میں ہی ان مذہبی تنظیموں اور جماعتوں نے ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ جو مسلّمہ طور پر قیام پاکستان کے نظریے کی مخالف تھیں۔ اسلام جیسے امن پسند مذہب کو فرقہ پرستی کے لیے استعمال کیا گیا۔ ایک ریاست کے استحکام کے لیے معاشی طور پر جو تدابیر اور پالیسیاں ناگزیر ہوتی ہیں انہیں اختیار ہی نہیں کیا گیا۔ اداروں میں اختیارات کی تقسیم پر عملدرآمد نہ ہونے کے باعث حکومتیں ڈانوا ڈول رہیں۔ فوج کو مداخلت کے مواقع ملتے رہے۔ پھر 1971 میں پاکستان کا اکثریتی صوبہ کشت وخون کے بعد پاکستان سے الگ ہوگیا۔

یہ سارے عوامل اور 1971 کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں بھی جس طرح حکمرانی ہوتی رہی ہے۔ سیاستدان ایک دوسرے پر وطن دشمنی۔ خزانہ لوٹنے کے الزامات عاید کرتے رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہوگا جب کہیں نہ کہیں، کسی نوجوان کو لاپتہ نہ کیا گیا ہو۔ جس روز میڈیا پر ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ بازی نہ ہوئی ہو، سیاسی اختلاف پر جیل کے دروازے نہ کھولے گئے ہوں۔

سرحد پار سے بھی خدشات۔ اندرون ملک بھی خطرات۔ معاشی رفتار ناموزوں۔

نسل در نسل کمتری اور عدم تحفظ کے احساسات۔ پھر مشترکہ خاندان بکھرتا چلا گیا۔ لسانی تعصب۔ فرقہ واریت گلی گلی پھیلتی چلی گئی افغانستان پر امریکہ روس کی کشمکش میں ہم نے امریکہ کے اتحادی بن کر ملک میں کلاشنکوف اور منشیات کے راستے کھول دیے۔ ہر پاکستانی میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا گیا ہے۔ روزمرہ زندگی کا کوئی سسٹم نہیں ہے۔ بے روزگاری ہے۔ سوشل سیکورٹی کا کوئی سسٹم نہیں ہے۔ دین اسلام کے نام نہاد مبلغ عافیت کی بجائے خوف کا سماں پیدا کرسکتے ہیں۔ مقامی حکومتوں کا نظام بہت کمزور ہے۔ پاکستان کے بڑے حصے میں قبائلی سردار۔ جاگیردار۔ نودولتیے۔ سرمایہ دار۔ مافیا اپنی اپنی مملکت بنائے ہوئے ہیں۔ رات دن جھوٹ بولا جاتا ہے۔ پھر اسے سیاسی بیان کہہ دیا جاتا ہے۔

یہ سارا منظرنامہ ایک ذمہ دار۔ مہذب۔ اصول پرست انسان کو ذہنی مریض بنانے کے لیے کافی ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں ترقی یافتہ ملکوں میں زندگی کی آسانیاں اُجاگر کی ہیں۔ حکمرانوں اور شہریوں کی خواہش تو یہ ہے کہ زندہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت پہنچائی جائے۔ اپنے ملک میں جب آپ اسپتالوں۔ سرکاری دفتروں۔ یونیورسٹیوں۔ بازاروں۔ ریلوے اسٹیشنوں۔ ایئرپورٹوں پر امتیازی سلوک دیکھیں تو ذہن جواب دینے لگتا ہے۔

ذہنی امراض کے ماہرین کی تحقیقی رپورٹیں یہ کہہ رہی ہیں کہ پاکستان میں سکون آور ادویات کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ لوگ ماورائے عقل قصے کہانیوں میں۔ جادوگری میں۔ عملیات میں پناہ لے رہے ہیں۔

ریاست کے تحفظ کے ذمہ دار اداروں۔ قومی سیاسی جماعتوں۔ عدالتوں۔ درسگاہوں۔ علمائے کرام۔ سب کو اس تشویشناک صورت حال کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ذہنی امراض۔ قوم کو آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ ذہن ہی نظریاتی اور فکری ارتقا کا سرچشمہ ہے۔ اگر وہی بیمار ہے تو وہ قوم صحیح فیصلے کیسے کرے گی۔؟

محمود شام

کفالتِ یتیم سے --- جنت کا حصول بھی ... رفاقتِ رسولﷺ بھی
الخدمت
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
"دُعاء"
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ و عطیات دے کر شامل ہو جائیں ---لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

قارئین کے خطوط

# السلام علیکم اطراف

## 'اطراف' پر ایک نظر اور تجاویز

بزمِ مکالمہ: نقطہ نمبر 7 کے ضمن میں آپ نے کچھ تبادلہ خیال نہیں کیا اس چھ سالہ دور سے ایک بادِ بہاری کی طرح گزر گئے۔ کچھ تو اظہار خیال کیا ہوتا۔ آپ اس کمی کو پورا کریں۔ صفحہ 113 والی تصاویر دو مرتبہ شامل کی گئی ہیں۔ کوئی بات نہیں وقت تو ان کا صرف ہوگا جو جریدہ پڑھتے ہیں۔ English Print Media میں بھی اغلاط ہوتی ہیں۔ لیکن نسبتاً کم۔ سمندر پار پاکستانیوں کے بارے میں Reports قابل قدر اضافہ ہے۔ صفحہ نمبر 35 جو معلومات قارئین کرام تک پہنچائی گئی ہیں وہ ممکن ہے دیگر ذرائع سے آپ تک پہنچی ہوں۔ بندہ ناچیز نے یکم جولائی 2024 کو آپ کو بذریعہ Whatsapp ارسال کی تھیں۔ اجازت ہو تو پوچھوں کہ آپ نے طبع کرنے سے قبل ان کے درست ہونے کی NHA سے تصدیق کی تھی؟ اگر واقعتاً ایسا ہی ہے تو یہ معلومات ہر Toll Plaza پر جلی حروف میں تحریر کی جانی چاہئیں۔ اور جو کچھ بیان ہوا ہے ہر Toll Plaza تمام سہولتیں پہنچانے کے لیے Practically Equiped ہے؟

ہاؤسنگ سوسائٹیاں قائم ہو جانے کے بعد اپنے رہائشیوں کے لیے پیسہ نکالنے، وصول کرنے، جائز ناجائز میں مسلک رہتی ہیں۔ صفحہ 32 پر کتب کے اشتہار کے بارے میں عرض ہے کہ کتب کی فہرست طبع کی جاسکتی ہیں؟

پاکستان میں مجموعی طور پر سالانہ کتنی کتابیں چھپتی ہوں گی؟

ہمیں اقتصادی طور پر فی کس آمدنی کا تو علم ہے لیکن نصاب کے علاوہ کتب کا مطالعہ کرنے والے کتنے پاکستانی ہیں اور ان کی عمر کی تفویج Age Grouping کیا ہے؟

9 ستمبر 2024 Dawn Business Finance Review کے مطابق گوگل، 2026 تک پاکستان پانچ لاکھ کروم بکس منظر عام پر لائے گا۔ ان کے عنوانات کیا ہوں گے؟ سر دست کچھ معلوم نہیں۔ پاکستان کی 60 فیصد آبادی جو نوجوانوں پر مشتمل ہے پر مذکورہ کتب کے کیا اثرات مثبت یا منفی، کچھ اندازہ نہیں۔ نوجوان نسل کی بروقت تعلیم و تربیت نہ کی گئی تو پہلے سے مشکلات میں گھرا ملک اپنا علمی دفاع کیسے کر پائے گا؟

جن سیاسی جماعتوں نے وفاق اور صوبوں میں تین تین مرتبہ اور ہر ایک نے مجموعی طور پر تین دہائیوں سے زائد عرصہ حکمرانی کی ترقی اور مسائل کی وہ ذمہ دار ہیں یا PTI جس نے صرف ساڑھے تین سال (بشمول کرونا کے حالات) وہ ذمہ دار ہے؟ بجلی کے معاملات میں جو عوامل بے قابو ہیں ان میں گردشی قرضے، آئی پی پیز، لائن لاسز، بجلی چوری، وغیرہ شامل ہیں۔ اور اربوں روپے کی بجلی محکمے کے افراد کو مفت مہیا کی جاتی ہے وہ کہاں کی اور کیسی ضرورت یا حکومت کی مجبوری ہے؟ فارغ البال شیدہ Retired اہلکاروں کو مراعات کی صورت میں جو کچھ دیا جارہا ہے وہ اس لیے ظلم ہے کہ ملک کے کروڑوں عوام خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

ہم بجلی کے بلز کی رقوم دیکھ کر واویلا تو مچاتے ہیں لیکن کبھی بل کو غور سے نہیں پڑھا۔ نگراں حکومت کے دوران جب یہ مسئلہ گرم ہوا تھا تو ARY کی اینکر پرسن مہر بخاری صاحبہ نے اپنے ایک پروگرام میں کہا تھا کہ 14 قسم کے ٹیکسز بجلی کے بل میں شامل کیے جاتے ہیں کیا ہم چیک کرتے ہیں؟

ملکی معیشت Packages, Relief اور Subsdies سے درست نہیں ہوسکے گی اور نہ ہماری معیشت کا مولا جٹ آئی ایم ایف ایسا کرنے دیتا ہے۔ ہاں ایک اور بات بجلی محل استعمال میں پہنچ کر Installed Capacity کا 20 فیصد تک ضائع ہو جاتی ہے۔ اس فضول خرچی پر جو صارفین کی عدم توجہی کے باعث ہوتی ہے گھریلو صارفین کو خاص توجہ کرنا ہوگی اگر راقم الحروف چیف جسٹس آف پاکستان ہوتا تو سوموٹو ایکشن کے ذریعے تمام سیاسی مقتدر، متعلقہ سرکاری افسران سے استفسار کرتا کہ منگلا اور تربیلا کے نصف صدی میں قابل ذکر ڈیمز کیوں نہ بنائے؟

اولمپکس گیمز 2024: پیرس میں 17 دن تک جاری رہنے والے اولمپکس کھیل اختتام پذیر ہوئے۔ کبھی پاکستان ہاکی جو اس قوم کا سرکاری کھیل ہے کے حوالے سے عالمی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا باعث بنتا تھا۔ سرکاری عدم دلچسپی کے باعث یہ احساس تفاخر بھی چھن گیا۔

1960 کی دہائی مدارس، جامعات کے مابین انتظامی سطح پر کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے، آہستہ آہستہ سست روی کا شکار ہوگئے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی اور تازہ دم پھرتیلے مہارت کار سامنے آتے اور یوں جوش و جذبہ کو ولولہ بخشتے۔ پی ٹی آئی کے عہد اقتدار میں کھیلوں کے ساتھ بے اعتنائی یوں سامنے آئی کہ اس کی وزارت کی ذمہ داریاں ایک خاتون ایم این اے کے سپرد کر دی گئیں۔ دودھ بلونے، چرخہ کاتنے یا آٹا گوندھنے کے مقابلوں کی تیاری تو نہ کرنا تھی کہ ایک خاتون ہی ملی وزارت کھیل کے امور چلانے کے لیے۔

قومی تفاخر کا کوئی کام ہو، سیاستدانوں کو غرض اور پرواہ نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ احساس زیاں بھی

جا تا رہا۔ ذرائع ابلاغ نے ذکر تک نہ کیا کہ کبھی ہا کی کا کھیل بھی فاتحانہ طور پر قوم کا سرمایہ افتخار تھا۔ کیا ہی بہتر ہو کہ حکومتی ادارے ملک بھر کھیلوں کی سرگرمیوں کو پھر سے نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنائیں اور ایک بار پھر آئندہ اولمپکس جو امریکہ میں ہوں گے پاکستان کامیابیاں حاصل کرے۔ امریکہ نے مجموعی طور پر 124 تمغے حاصل کیے جبکہ چین نے 91 اور پاکستان نے صرف ایک۔ واحسرتا! کہ اب پاکستان ہا کی کھیل تاریخ کا حصہ بن کر سوشل میڈیا پر دکھائی دیتا ہے اور ہمیں زوال ہا کی کا دکھ احساس تک نہیں۔ یاد رہے کہ حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ۔ ’’اپنی اولاد کو گھڑسواری، تیراندازی اور تیراکی سکھاؤ۔‘‘ کھیلوں کی ہی رغبت دلاتی ہے۔

(طارق محمود۔ ساہیوال)

## ’اطراف‘ میں بہت عمدہ، اعلیٰ اور تحقیقی مواد

’اطراف‘ ایک ایسا رسالہ ہے جو عالمی سطح کی معلومات فراہم کرتا ہے ، بہت عمدہ، اعلیٰ اور تحقیقی مواد شایع ہوتا ہے جس کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے، محمود شام صاحب جمعرات اتوار کو رات ساڑھے نو بجے فیس بک پر آن لائن وڈیو پر مذاکرہ کرتے ہیں اور بہت ساری معلومات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

ماہنامہ اطراف جون 2024 کا پرچہ ہماری عثمانیہ لائبریری چنیہانی کنڈیارو نوشہرو فیروز سندھ میں پہنچ چکا ہے، ہمارا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں تقریباً 40 گھر ہیں جس زیادہ تر لوگ علم و ادب سے چاہ رکھنے والے ہیں اور اس بنیاد پر میرے والد محترم محمد عثمان عباسی صاحب نے اپنے بل بوتے پر پرائمری اسکول کے استاد ہونے کے ساتھ ایک بہت شاندار لائبریری قائم کر رکھی ہے۔ بہت نایاب نئی اور پرانی 13 ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں جس میں روزانہ قریبی گاؤں اور شہروں یہاں تک کے پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر یہاں تک کہ کراچی سے بھی لوگ اپنی علم کی پیاس بجھانے کے لیے اپنی تحقیق کے حوالے سے آتے رہتے ہیں، اس وقت ماہنامہ اطراف کو ہماری لائبریری میں پہنچے ہوئے پانچ دن ہوئے ہیں اور 30 لوگ اس رسالے کا مطالعہ کر چکے ہیں جن کو بہت پسند آیا ہے۔

(محمد عرفان عباسی۔ کنڈیارو)

## ’اطراف‘ اگست کا شُمارہ

محترم محمود شام صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا اطراف اگست 2024 کی آزادی نمبر ایک چمکتے دمکتے ٹائیٹل کے ساتھ ڈاک سے موصول ہوئیں۔ ایک ہی جست میں اطراف کے اطرافیہ میں پہنچے جہاں محترم محمود شام صاحب فطرت سے قربت حقیقی آزادی کی ضمانت پر نغمہ سرا تھے۔ جو قلم کی نوک سے لفظوں کے پھولوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیر رہے تھے۔ محمود شام صاحب کی اطرافیہ سے بزم مکالمہ میں محمود شام کے سیاسی نظام کی ناکامی کے اسباب (ہم کون ہیں۔۔۔ 1947 سے اب تک گونجتا سوال) سے ہوتے ہوئے کہانی اُردو بازار کراچی کی (علی اشعر انجم/ عایشہ سلمان) میں قدم رنجا فرمایا۔ جو مزے لے لے کر پڑھی۔ اُردو بازار کراچی کی تاریخ وغیرہ سے شناسائی اور اُردو بازار کراچی کے حوالے سے بہت مستند معلومات حاصل ہوئیں۔ اس تحریر میں محترم علی اشعر انجم صاحب اور عایشہ سلمان صاحبہ نے پوری تفصیل سے اُردو بازار کراچی کا ذکر کیا ہے۔ اللہ کرے کہ اردو بازار لاہور کے بارے میں بھی لاہور سے کوی بندہ بشر اسی طرح تفصیل سے لکھ دیں۔ اس کے بعد زندگی سے بڑے لوگ حسین نقی صاحب سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی گفتگو دوسری قسط پڑھی۔ اس کے بعد نیشنل ہای وے پر گاڑی چلانے والے ڈرائیورز متوجہ ہوں کے عنوان سے اچھی معلومات ملیں۔ ادارہ اطراف کے پابند کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ گروپوں اور دوست احباب کے ساتھ شیر کرلیا۔

محترمہ سعیدہ افضل صاحبہ کی سسکیاں (عمر کا سورج) کی قسط نمبر 11 دل کی آنکھوں سے مطالعہ کیا تو فلسطینیوں کے حالات کا سن کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اللہ رب کریم مظلوم فلسطینیوں پر اپنا خصوصی رحم وکرم فرمائیں۔ آمین

ظہیر قندیل کی وہ گوری ہی کیا جو ناز نخرے نہ دکھایے۔۔۔۔ قسط 2 پروفیسر شاداب کی تحریر پیر الٰہی بخش سندھ میں تعلیم کی اشاعت کے سربراہ۔۔۔ پروفیسر شاداب صاحب ہی کی تحریر 12 ویں صدی عیسوی میں نصر پور میں جنم لینے والا وتایو معلوماتی تحریر تھی۔ خصوصا وتایو فقیر ایک عظیم لوک کردار جن کے بارے میں قارئین اطراف کو بہت معلومات فراہم ہوئیں۔ جہالت کا سبب غیر متوازی معیشت پروفیسر نزہت پروین کی سوچیں اور سعیدہ افضل کی خاص تحریر مٹی کا ساتھ بھی بہت پسند آئی۔

محترم خان افغانی صاحب کی تحریر تذکرہ کتابوں کا۔۔۔۔ میں بہت انہماک اور دلچسپی سے پڑھتا رہتا ہوں۔ محترم خان افغانی صاحب بہت تفصیل سے کتابوں کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں۔ مگر مہنگای کے اس دور میں کتابوں کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اور ہم ویسے تبصروں ہی پر گزارہ کر لیتے ہیں۔

(بہ احترامات فراواں۔ خلیق ربانی انجم)

## پاکستان کی ذہنی صحت

رپورٹیں آرہی ہیں کہ پاکستان میں ذہنی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ پاکستان کے عوام جن بحرانوں سے دوچار ہیں۔ اور جب قیادت کا بھی بحران ہو تو لوگوں میں بے بسی اور بے کسی کا تاثر ذہنی پریشانی بڑھا دیتا ہے۔ متحدہ عرب امارات میں مقیم پریسا خان مشاورت (کونسلنگ) کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس انتہائی اہم موضوع پر انہوں نے ہماری درخواست پر ایک تحریر سے نوازا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

# نئی قانون سازی حکومت کی طرف سے ذہنی صحت کی اہمیت کا اعتراف

پریسا خان (متحدہ عرب امارات)

ملک کو ذہنی صحت کے دائرے میں کئی چیلنجوں کا سامنا ہے، بیداری بڑھانے، بدگمانی کو کم کرنے اور ذہنی صحت کی خدمات تک رسائی کو بہتر بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ حالیہ برسوں میں، پاکستان میں دماغی صحت کے حوالے سے نمایاں تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ اس کی نشاندہی نئی قانون سازی کے ذریعے ہوتی ہے جس کا مقصد ذہنی صحت کے مسائل سے دوچار افراد کو مسائل سے نمٹنے کے قابل بنانا ہے۔ حکومت نے ذہنی صحت کے خدشات کو دور کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔ پاکستان مینٹل ہیلتھ ایکٹ 2001 میں نافذ کیا گیا

**صحت کی مجموعی دیکھ بھال میں ذہنی صحت کی خدمات کی شمولیت بہت اہم**

تاکہ ذہنی امراض میں مبتلا افراد کے حقوق کے تحفظ، علاج اور دیکھ بھال کا ڈھانچہ فراہم کیا جاسکے۔ یہ قانون سازی نہ صرف ذہنی صحت کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے بلکہ دیکھ بھال کے ایک جامع نظام کے لیے فریم ورک کا بھی تعین کرتی ہے۔ اس فریم ورک کا مقصد دماغی صحت کے مسائل سے دوچار افراد کے حقوق پر زور دینا، علاج کے لیے رہنما خطوط کی فراہمی، اور دماغی صحت کی خدمات کو قابل رسائی اور سستی بنانے کے لیے میکانیت قائم کرنا ہے۔ لیکن، ذہنی صحت سے متعلق قانون سازی اور اس کے موثر نفاذ کے درمیان فرق تشویش ناک ہے۔

قوم ذہنی صحت کی پیچیدگیوں سے دوچار ہے اور یہ قانون سازی بیداری کو فروغ دینے، دیکھ بھال تک رسائی اور بدعملی کو دور کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ اگرچہ چیلنجز برقرار ہیں لیکن اب تک کیے گئے اقدامات ایک روشن مستقبل کی جانب اشارہ ہیں جہاں ذہنی صحت کے ساتھ اس سنجیدگی کا سلوک کیا جاتا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنا بہت ضروری ہے جو ایک جامع اور معاون ذہنی صحت کے نظام کے حصول میں رکاوٹ ہیں۔

لائسنسنگ ادارہ (نگرانی، شفافیت اور احتساب): دماغی صحت کی خدمات کے معیار کو یقینی بنانے کے لیے، پاکستان کو فوری طور پر ایک مرکزی نگراں ادارے کی ضرورت ہے۔ یہ ادارہ دماغی صحت کے پیشہ ور افراد کو باقاعدگی عطا کرے

**دماغی صحت کے معالجین کے لیے ایک مرکزی نگراں ادارہ**

گا اور اس بات کو یقینی بنائے گا کہ وہ سخت معیار قائم کریں، اس طرح مریضوں کی فلاح و بہبود کا تحفظ ہوگا۔ ایک لائسنس دینے والا موثر ادارہ باقاعدگی سے نگرانی، اور جانچ پڑتال کرے گا اور جوابدہی کا مکینزم (میکانیت) قائم کرے گا جو اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ذہنی صحت کی

پالیسیوں کو حسب منشا نافذ کیا جا رہا ہے۔ وسائل کی تقسیم اور پیشرفت سے باخبر رہنا ضروری ہے اور اس میں شفافیت بہتری کے عمل کو آسان بنا کر مداخلتی عناصر کی نشاندہی کر سکتی ہے۔ لائسنس دینے سے ماہر نفسیات، مشیران اور دماغی صحت کے دیگر ماہرین کے لیے اچھی پریکٹس کی راہ ہموار ہو گی۔

پیشہ ورانہ تربیت: مؤثر دیکھ بھال کی فراہمی کے لیے اچھی تربیت یافتہ ذہنی صحت کی افرادی قوت ضروری ہے۔ قانون سازی صحت کی دیکھ بھال کرنے والے پیشہ ور افراد کے لیے تربیتی پروگراموں کا مطالبہ کرتی ہے، انہیں ذہنی صحت کے حالات کی شناخت اور ان کا انتظام کرنے کی مہارتوں سے آراستہ کرتی ہے۔ یہ دماغی صحت کے مسائل کے حل میں مدد کی ایک مضبوط بنیاد بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ایک لائسنس دینے والا ادارہ دماغی صحت کے پریکٹیشنرز کی مسلسل پیشہ ورانہ ترقی کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ باقاعدہ تربیت، ورکشاپس اور تازہ ترین طریقہ کار کی فراہمی سے دیکھ بھال کے معیار کو بلند کیا جا سکتا ہے اور پیشہ ور افراد کو اس شعبے میں ہونے والی تازہ ترین پیشرفت سے آگاہ رکھا سکتا ہے۔

**علاج میں باخبر رضامندی رازداری اور مریض کا احترام ناگزیر**

آگاہی: پاکستانی معاشرے میں دماغی صحت کے حوالے سے بدگمانی پیدا کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مدد اور علاج حاصل کرنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ دماغی صحت کے بارے میں غلط فہمیاں اور بیداری کی کمی بدگمانی کو برقرار رکھنے میں معاون ہے۔ نئی قانون سازی دماغی صحت کے بارے میں خرافات اور غلط فہمیوں کو ختم کرنے کے لیے آگاہی مہم کو ترجیح دیتی ہے۔ کھلے مکالمے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، یہ مہمات ایک ایسا معاشرہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں جو مدد کے خواہاں افراد کے لیے زیادہ سمجھدار، باشعور اور معاون ہو۔

صحت کی دیکھ بھال کے وسیع نظام میں ذہنی صحت کی خدمات کا انضمام بہت ضروری ہے۔ یہ اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ افراد جامع نگہداشت حاصل کر سکتے ہیں جو ان کی ذہنی اور جسمانی تندرستی دونوں کی ضامن ہے۔ دماغی صحت کو بنیادی نگہداشت میں ضم کر کے، مناسب ذہنی صحت کی دیکھ بھال سے متعلق افراد کی شناخت، تشخیص اور حوالہ دہی کے لیے انہیں ضروری مہارتوں سے آراستہ کیا جا سکے۔ اس طرح پاکستان میں ان خدمات تک رسائی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور علاج کے فرق کو کم کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے ذہنی صحت کے منظر نامے میں ایک بڑا چیلنج علاج تک محدود رسائی ہے۔ نئی قانون سازی کا مقصد ملک بھر میں ذہنی صحت کی سہولتوں اور خدمات کی فراہمی کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ یہ قدم اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اہم ہے کہ دور دراز علاقوں کے افراد کو ضرورت کی دیکھ بھال تک رسائی حاصل ہو۔

اخلاقی معیارات: نئے قوانین ذہنی صحت کے حالات کے حامل افراد کے حقوق اور وقار کے تحفظ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ وہ باخبر رضامندی، رازداری، اور علاج کے خواہاں افراد کی خودمختاری اور احترام کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اخلاقی علاج بلکہ مریضوں اور صحت کی دیکھ بھال فراہم کرنے والوں کے درمیان اعتماد کو بھی فروغ ملتا ہے۔

دماغی صحت کے حوالے سے پاکستان کی قانون سازی میں پیش رفت قابل ستائش ہے، لیکن قوم ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ارادوں کو عملی جامہ پہنانا ضروری ہے۔ مضبوط ذہنی صحت کا بنیادی ڈھانچہ بنا کر ہی ایسا کرنا ممکن ہے۔ پاکستان اپنے شہریوں کو وہ مدد فراہم کر سکتا ہے جس کی انہیں ذہنی طور پر صحت مند رہنے اور بھرپور رہنمائی کے لیے ضرورت ہے۔

عمل درآمد میں درپیش چیلنجوں سے نمٹ کر، بدگمانی سے نمٹنے، اور ذہنی صحت کے پیشہ ور افراد کو باقاعدگی عطا کرنے کے لیے ایک لائسنسنگ ادارہ قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے اجتماعی پالیسیوں اور موثر فریم ورک کا قیام ضروری ہے۔

(ترجمہ: سید عرفان علی یوسف)

**مصنفہ ایک کاؤنسلنگ پروفیشنل ہے اور اسے کاؤنسلنگ، گائیڈنس، سائیکو ایجوکیشن، انٹر پرسنل تھراپی، سماجی ہنر کی تربیت اور تدریس اور ٹیچر ٹریننگ میں 10 سال سے زائد کا تجربہ ہے۔**

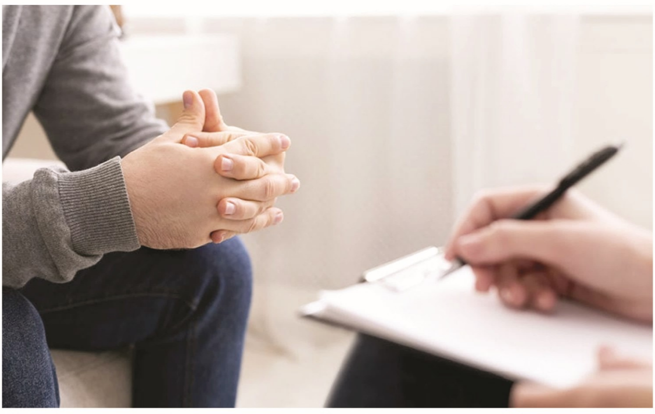

"امریکہ میں 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی عاصم متین خان نے نومبر میں ہونے والے انتخابات کے موضوعات۔ مسائل۔ ٹرمپ اور کمالا ہیرس کے افکار کا تجزیہ کیا ہے۔ 'اطراف' کو یہ فخر ہے کہ وہ اپنے قارئین کو امریکہ کی پالیسیوں سے مسلسل آگاہ کرتا ہے کیونکہ امریکہ پاکستان کے معاملات پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے پاکستانیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ امریکہ کیا سوچ رہا ہے۔"

# کارپوریٹ امریکہ کمالہ کے ساتھ یا ٹرمپ کے

## عاصم متین خان کا معروضی تجزیہ

امریکی آئین کے تحت ہر چار سال بعد نومبر کے پہلے منگل کو امریکی رائے دہندگان اگلے چار سال کے لیے اپنا نیا صدر منتخب کرتے ھیں۔ اس سال بھی پانچ نومبر کو امریکی عوام اپنا حق رائے دہی استعمال کریں گے۔ اس سال کے اوائل سے امریکی صدر کے ریپبلکن امیدوار سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار موجودہ صدر جو بائیڈن تھے۔ تاہم عمر رسیدہ صدر جو بائیڈن کی صحت کئی مہینوں سے امریکی رائے عامہ میں اور میڈیا میں زیر بحث تھی کہ وہ آیا صدر کے عہدے کے لیے اگلے چار سال کے لیے بھی موزوں رہیں گے یا

## کمالہ ہیرس۔ الیکٹرک کار اور سیاہ فام امریکیوں کی حامی

نہیں۔ اگرچہ جو بائیڈن اس بات پر بضد تھے کہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پہ صحت مند ہیں اور اگلے چار سال کے لیے صدر بننے کے اہل اور بہترین امیدوار ہیں۔ تاہم کئی بار وہ نہ صرف مطمع نظر صحیح طور سے بیان نہ کرسکے بلکہ کئی بار جہاز کی سیڑھیوں پر اور دیگر کئی جگھوں پر وہ لڑکھڑائے اور گر بھی گئےلیکن ہر بار عمر رسیدہ جو بائیڈن اپنے جواں عزم ھونے کا پرچار کرتے رہے۔

اس دوران میں اگرچہ ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر سے بھی یہ آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ جو بائیڈن کو صدارتی امیدوار کی ریس سے الگ ہوکر کسی اور کو آگے آنے کا موقع دینا چاہیے ورنہ شکست ڈیموکریٹک پارٹی کا مقدر بن جائے گی۔ تاہم صدر جو بائیڈن نے اس بات پر کوئی کان نہیں دھرا۔ لیکن امریکی انتخابی روایت کے مطابق جب صدر جو بائیڈن کی اور سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی پہلی صدارتی بحث ہوئی تو اس میں جو

بائیڈن کی کارکردگی انتہائی خراب رہی۔ دوران بحث وہ متعدد بار اپنا موقف صحیح طور سے بیان بھی نہیں کرسکے۔ اب نہ صرف امریکی رائے عامہ بلکہ ڈیموکریٹک پارٹی کے اندر بھی بائیڈن کی صدارتی بحث میں خراب کارکردگی سے انتہائی مایوسی پھیلی۔ آخرکار صدر جو بائیڈن نے بادل نخواستہ صدارتی دوڑ سے الگ ہونے کا اعلان کردیا اور کمالہ ہیرس کو صدارتی امیدوار کی حیثیت سے آگے کردیا۔ اس طرح سے حادثاتی طور پر صدارتی امیدوار بننے والی کمالا ہیرس پانچ نومبر کو سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا مقابلہ کریں گی۔

شاید امریکی انتخابات پر اثر ہونے والی سرکاری اسٹیبلشمنٹ اور امریکی کارپوریٹ اسٹیبلشمنٹ دونوں ہی یہ چاہ رہے تھے کہ صدر جو بائیڈن صدارتی ریس سے الگ ہوجائیں۔ صدر بائیڈن کی ہٹ دھرمی پر چند امریکی اخبارات نے یہاں تک لکھنا شروع کردیا تھا کہ اگر صدر بائیڈن خود دستبردار نہیں ہوتے تو ان کی کیبنٹ کو چاہیے کہ وہ ان کو باہر نکال دے۔ اسی دباؤ کی وجہ سے کمالہ ہیرس صدارتی ریس کے لیے تیار نہ ہونے کے باوجود بھی تیار ہوکر صدارتی امیدوار ہو گئیں۔ کمالہ ہیرس کے امیدوار ہونے کے اعلان کے بعد کارپوریٹ امریکہ نے فوری طور پہ کروڑوں ڈالر کمالہ ہیرس کے انتخابی فنڈ میں جمع کرادیے۔ سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو بھی امریکہ کی سلیکون ویلی کے سرمایہ کار اور وال سٹریٹ کے چند مضبوط کرداروں کی حمایت حاصل ہے جو آج بھی ٹرمپ کے لیے اپنی دولت لٹانے کے لیے تیار

## ٹرمپ۔ کمالا دونوں فلسطین کے معاملے پر گومگو کا شکار

ہیں۔ تاہم بائیڈن کی صدارتی ریس سے دستبرداری کے بعد اور کمالہ ہیرس کے امریکی صدارتی امیدوار بننے کے بعد ڈیموکریٹک پارٹی کے اگلے امریکی صدارتی انتخابات جیتنے کے امکانات بہت روشن ہوگئے ہیں۔ اس سے قبل ڈونلڈ ٹرمپ کے جیتنے کے امکانات بہت زیادہ تھے۔

کمالہ ہیرس اور ڈونلڈ ٹرمپ کے درمیان ہونے والی صدارتی بحث میں کمالہ ہیرس نے ڈونلڈ ٹرمپ کو آڑے ہاتھوں لیا اور اب تک صدارتی ریس میں برتری رکھنے والے ڈونلڈ ٹرمپ کمالہ ہیرس سے کافی پیچھے رہ گئے۔ صدارتی بحث کے فوراً بعد ہونے والے پول میں رائے عامہ نے کمالہ ہیرس کو 63% اور ڈونلڈ ٹرمپ کو 37% کامیاب قرار دیا۔ اگر امکانات کے مطابق کمالہ ہیرس امریکی صدر منتخب ہوگئیں تو وہ پہلی خاتون امریکی صدر اور پہلی بھارتی نژاد امریکی صدر بھی ہونگی۔ تاہم اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی بھارتی صدر ہوں گی وہ ہوں گی تو امریکہ کی صدر اور پوری دنیا میں وہ ان تمام امریکی مفادات کا تحفظ کرتی نظر آئیں گی جو پچھلے امریکی صدور بھی ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ وہ امریکہ کی داخلی پالیسی پر تو اثر انداز ہوسکتی ہیں تاہم خارجہ پالیسی حسب معمول ان طویل مدتی مقاصد کے حصول کے لیے وہی رہے گی جو امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور تھنک ٹینکس نے امریکہ کے لیے طے کیے ہیں۔ داخلی معاملات میں دونوں امیدواروں کی پالیسی یکسر مختلف ہے۔ 6 جنوری 2021 کو ہونے والے امریکی دارالحکومت پر ریپبلکن پارٹی کے حمائتیوں کے حملے کو ڈونلڈ ٹرمپ نے جائز قرار دیا تھا بلکہ وہ اس کو ایک قریبی مقام سے

## ٹرمپ۔ چین کے سب سے بڑے مخالف نئے گھروں کے حق میں

دیکھ رہے تھے اور کسی حد تک لیڈ بھی کررہے تھے وہ پچھلے چار سال میں مستقل یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ 2020ء کا الیکشن تو وہ جیت گئے تھے۔ وہ اس بات کے بھی حمائتی ہیں کہ وہ صدر منتخب ہوکر 6 جنوری کو واشنگٹن پر یلغار کرنے والے قوم پرست امریکیوں کی اکثریت کے لئے صدارتی معافی کا اعلان کریں گے۔ جبکہ کمالہ ہیرس اس حملے کو امریکی جمہوریت پر حملہ تصور کرتی ہیں۔

داخلی معاملات میں کمالہ ہیرس یہ سمجھتی ہیں کہ امریکیوں کو اپنے گھر کا خواب پورا کرنے کے لئے ایک شفاف طریقہ کار ہونا چاہیے جس میں غیر مساوی رویئے کو ختم کرنا ہوگا اور نئے گھرداروں کو ٹیکس کریڈٹ بھی دینا چاہیے۔ تاہم جن لوگوں کی آمدنی زیادہ ہے ان پر مزید ٹیکس لگایا جائے اور کارپوریٹ ٹیکس میں بھی اضافہ کیا جائے۔ وہ تمام بیرونی درآمدات پر یکساں ٹیکس کی مخالفت کرتی ہیں تاہم چین سے وہ اسٹیل اور المونیم پر ٹیکس لگانے کی حمایت کرتی ہیں تاکہ امریکی صنعت کو فروغ دیا جائے۔ بنیادی تعلیم کو فروغ دینے کی حمایت کرتی ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج اور یونیورسٹیز میں طلبہ کے لئے قرض کے بغیر تعلیم کا حصول ممکن بنانا چاہتی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ اساتذہ کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا جائے اور سیاہ فام یونیورسٹیوں کو زیادہ سپورٹ دی جائے تاکہ سیاہ فام امریکی آبادی کو آگے آنے کا موقع ملے۔ وہ گاڑیوں کی انڈسٹری میں الیکٹرک کار کی انڈسٹری کو آگے بڑھانے کی حمایت کرتی ہیں۔

خارجہ پالیسی کے معاملے میں وہ چین کے رویئے کو کو جارحانہ اور علاقے میں کسی حد تک خطرہ محسوس کرتی ہیں اور اس خطرے کو کنٹرول کرنے کے لیے چین کے خلاف علاقے کے دوسرے ممالک سے اتحاد کرنے کی حمایت کرتی ہیں

وہ چین کو سیمی کنڈکٹرز کی برآمدات کی بھی مخالفت کرتی ہیں ان کے خیال میں چین اس ٹیکنالوجی کو اپنی فوجی طاقت کو بڑھا کر تائیوان کو کنٹرول کرنے کے لیے استعمال کرسکتا ہے کچھ عرصہ قبل انہوں نے چینی صدر سے ملاقات میں یہ کہا تھا کہ ہمیں بات چیت کو قائم رکھنا چاہیے تاکہ ہمارا آپس کا مقابلہ کہیں کسی زیادہ بڑے مسئلے کا پیش خیمہ نہ بنے۔ تاہم انہوں نے کبھی کھل کر اس بات کا عندیہ نہیں دیا کہ وہ صدر جو بائیڈن کی طرح تائیوان پر کسی بھی ممکنہ چینی حملے کی صورت میں تائیوان کی مدد کریں گی۔

داخلی معاملات میں سابق امریکی صدر ٹرمپ شہر سے باہر گردونواح میں نئے گھروں کو تعمیر کرنا چاہتے ہیں تاکہ نئے گھروں کی قیمتوں کو کنٹرول کیا جائے اور امریکی انرجی کو بھی آزاد کرکے گھروں کی قیمتوں میں کمی لائی جائے اور افراط زر کو قابو میں لایا جائے۔

ٹیکس کی چھوٹ کے معاملے میں ابھی تک ٹرمپ نے کوئی واضح موقف نہیں دیا ہے تاہم وہ ٹیکس کٹ کو اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔

درآمدات کے معاملے میں وہ تمام درآمدات پر 10 فیصد ٹیکس لگانا چاہتے ہیں جبکہ بعض اوقات یہ ٹیکس 60 فیصد تک بھی جاسکتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح امریکی صنعت کو فروغ ہوگا اور بیرونی درآمدات اور خاص طور پر چین سے درآمدات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ تاہم ماہرین معیشت کا خیال ہے کہ اگر ٹرمپ دوبارہ صدر منتخب ہوگئے تو دنیا ایک نئی تجارتی جنگ میں پھنس جائے گی اور اس کا سب سے زیادہ نقصان چھوٹے ممالک کی معیشت کو ہوگا۔

تعلیم کے معاملے میں وہ تعلیمی ڈیپارٹمنٹ کو ختم کرکے ریاستوں کو حق دینا چاہتے ہیں کہ وہ انفرادی طور پر اپنے کالج اور یونیورسٹیز کے معاملات کو اہتمام کریں۔ وہ طلبہ کے قرض کو معاف کرنے کی حمایت نہیں کرتے کیونکہ اس سے پہلے جو لوگ اپنے تعلیمی اخراجات ادا کر چکے ہیں ان کے ساتھ یہ ناانصافی ہوگی۔

خارجہ پالیسی کے معاملے میں ٹرمپ چین کے بڑے مخالف ہیں وہ چین کی درآمدات پر بھاری ٹیکس لگانے کی حمایت کرتے ہیں تاکہ

## سیاہ فام۔ ٹرمپ کے زہر آلود بیانات ابھی تک نہیں بھولے

امریکی صنعت کو فروغ دیا جائے اور امریکی ورکرز کو فائدہ ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ غیر مساوی تجارتی پالیسی کے نتیجے میں امریکی ورکرز کو بہت نقصان ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ امریکی صدر منتخب ہوگئے تو اگلے چار سال کا منصوبہ بنائیں گے تاکہ امریکی صنعت کو فروغ دیا جاسکے اور چین کی مصنوعات پر انحصار نہ کیا جائے وہ امریکی انفراسٹرکچر میں چین کی بہت زیادہ سرمایہ کاری کی مخالفت کرتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب وہ متعدد بار چینی صدر کی تعریف بھی کرچکے ہیں۔

اسرائیل فلسطین اور غزہ کے معاملے پر کمالہ ہیرس صدر بائیڈن کی پالیسی کی حمایت کرتی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ جنگ ختم کی جائے اور تمام یرغمالیوں کو رہا کیا جائے اور دو ریاستی منصوبے پر عمل کیا جائے تاہم وہ اس بات کی حمایت کرتی ہیں کہ اسرائیل کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے اور حماس کو ختم کیا جانا چاہیے کچھ عرصہ قبل کمالہ ہیرس نے الاباما میں خطاب کرتے ہوئے غزہ کی صورتحال کو ایک تباہ کن انسانی آفت قرار دیتے ہوئے فوری جنگ بندی کی بات کی تھی تو بائیڈن انتظامیہ فوری طور پر اسرائیل کی حمایت کے لیے میدان میں کود آئی تھی۔ اس کے علاوہ جولائی میں اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کی کانگریس میں تقریر کا بھی انہوں نے غیر اعلانیہ بائیکاٹ کیا تھا۔ اکثر امریکی ان کے اس

## امریکی انتخابات 2024 اور اہم عالمی مسائل

روئیے کو ترقی پسندانہ روئیہ قرار دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ کمالہ ہیرس کے نانا ایک کیمونسٹ تھے اور کمالہ ہیرس نے ابتدائی سیاسی تعلیم اپنے نانا کے زیر سایہ ہی حاصل کی۔

ٹرمپ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اس وقت امریکہ کے صدر ہوتے تو پچھلے سال سات اکتوبر کو حماس اسرائیل پر کبھی بھی حملہ نہیں کرتا۔ وہ بھی اس جنگ کا فوری خاتمہ چاہتے ہیں تاہم انہوں نے موجودہ غزہ مسئلے سمیت دیرینہ فلسطین اسرائیلی مسئلے کے لیے کوئی واضح حل نہیں بتایا کہ اسرائیل کو کس طرح اپنے جارحانہ روئیے کو قابو میں رکھنا چاہیے اور کس طرح سے فلسطینیوں کو ان کے حقوق دیے جائیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نیٹو کے پہلے سپریم کمانڈر صدر آئزن ہاور صدر کا خیال تھا کہ نیٹو مغربی ممالک کو دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر اپنا دفاع کرنے میں مدد دے گا نیٹو کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ امریکی فوجی مستقل بنیادوں پر مغربی یورپ کے دفاع کے لیے گارڈ بن جائیں۔ آج بھی 90 ہزار سے زیادہ امریکی فوجی جرمنی برطانیہ اٹلی سمیت دیگر یورپی ممالک میں تعینات ہیں۔ اور اس کا زیادہ تر خرچہ امریکی ٹیکس دہندگان ادا کرتے ہیں۔ صدر بائیڈن کی طرح کمالا ہیرس بھی نیٹو کے اتحاد کی بڑی حمایتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ روس کے خلاف نیٹو کا اتحاد ایک بڑی قوت ہے اور یوکرین کے معاملے میں بھی نیٹو اتحاد نے روسی جارحیت کی مزاحمت میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ورنہ روس کی جارحیت کا دائرہ کار مزید پھیل سکتا تھا۔ امریکی تھنک ٹینکس کا خیال ہے کہ اگر روس یوکرین میں کامیاب ہو گیا تو اس کا اگلا نشانہ پولینڈ ہوگا۔

جبکہ سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ ''امریکہ سب سے پہلے'' کے نعرے کے حامی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نیٹو اتحاد امریکہ پر ایک بوجھ ہے اور ہمیشہ امریکہ نے نیٹو اتحادات کے اخراجات سب سے زیادہ اٹھائے ہیں جبکہ مغربی ممالک نے اپنے حصے کے اخراجات صحیح طور سے ادا نہیں کئے حالانکہ اس اتحاد کا سب سے زیادہ فائدہ مغربی یورپ کے ممالک کو ہوا ہے۔ وہ کئی مواقع پر اس بات کا عندیہ دے چکے ہیں کہ وہ نیٹو اتحاد سے الگ ہو جائیں گے۔ وہ اقوام متحدہ کی کارکردگی سے بھی مطمئن نہیں ہیں وہ گلوبل ازم کے خلاف ہیں اور اقوام متحدہ میں ایک تقریر میں وہ یہ عندیہ دے چکے ہیں کہ وہ بین الاقوامیت کے خلاف ہیں اور نیشنلزم کے حامی ہیں۔ ٹرمپ کے ان خیالات کی وجہ سے ہی ان کے پچھلے دور حکومت میں امریکہ میں سفید فام اکثریت کی نسلی منافرت کھل کر سامنے آ گئی۔ نہ صرف امریکہ میں غیر ملکیوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت بڑھی بلکہ سیاہ فام اور سفید فاموں کے درمیان بھی خلیج بڑی حد تک وسیع ہو گئی۔ اگرچہ یہ نسلی منافرت ہمیشہ سے اور قدرتی طور پر موجود تھی لیکن ٹرمپ کے دور میں یہ کھل کر سامنے آ گئی اور اس کا کھل کر اظہار بھی کیا گیا۔ اب انتخابات سے قبل ٹرمپ سیاہ فام ووٹرز کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں پچھلے دنوں وہ سیاہ فاموں کے چرچ میں گئے اور انہوں نے کہا کہ ابراہم لنکن کے بعد وہ سیاہ فاموں کے لیے بہترین صدر ہیں۔ لیکن سیاہ فام ابھی تک ان کے پچھلے دور صدارت کے دوران ان کے سیاہ فاموں سے اور دیگر نسلوں سے منافرت انگیز بیانات کو نہیں بھولے۔

**یوکرین۔ کمالا روس کے خلاف۔**
**ٹرمپ امداد نہیں قرض دینے کے حامی**

روس اور یوکرین کے معاملے میں کمالہ ہیرس یوکرین کی مدد میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اس معاملے میں مغرب سمیت بین الاقوامی حمایت حاصل کی جائے اور روس کی مزاحمت کو روکا جائے۔ یوکرین پر روسی حملے سے قبل کمالہ ہیرس نے یوکرین کے صدر سے چھ دفعہ ملاقات کی تھی وہ چاہتی ہیں کہ امریکہ اور مغربی ممالک یوکرین کی اتنی مدد کریں کہ روس کو بات چیت کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکے اور یوکرین امن مذاکرات کے لیے بہتر پوزیشن میں ہو۔

سابق صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ وہ اگر صدر ہوتے تو روس یوکرین پر کبھی حملہ نہیں کرتا تاہم انہوں نے کبھی یہ کھل کر نہیں بتایا کہ وہ کیا پالیسی اختیار کرتے جو روس کو مجبور کر دیتا ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پروگرام کو خفیہ رکھنا چاہتے ہیں تا کہ بات چیت کے وقت وہ روس سے بہتر پوزیشن میں ہوں۔ اپنے پچھلے دور حکومت میں بھی امریکی صدر ٹرمپ نے پیوٹن سے نرم رویہ رکھا تھا تاہم وہ روسی جارحیت کے خلاف یوکرین کی مدد کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو بھی فنڈز یوکرین کو دیے جائیں وہ ایک قرض کی صورت میں ہوں اس امداد کو وہ یوکرین کے لئے امریکی ٹیکس دہندگان کی طرف سے مفت کا کوئی تحفہ نہ سمجھا جائے۔

ماحولیات سے متعلق بھی کمالہ ہیرس معاہدہ پیرس کی حمایت کرتی ہیں وہ گرین نیو ڈیل کی حمائت کرتی ہیں اور ایسی صنعتوں کے اوپر جرمانہ لگانا چاہتی ہیں جن کی وجہ سے ماحولیات میں آلودگی پیدا ہو رہی ہے اور انسانی جانوں کو خطرہ ہو رہا ہے وہ چاہتی ہیں کہ ماحولیات کو بہتر بنانے کے لیے اس میں زیادہ سے زیادہ انویسٹمنٹ کی جائے۔ جبکہ ڈونلڈ ٹرمپ معاہدہ پیرس سمیت دیگر بین الاقوامی معاہدات برائے ماحولیات کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اس بات کا عندیہ بھی دیا ہے کہ وہ جیسے ہی امریکی صدر منتخب ہوں گے امریکہ دوبارہ معاہدہ پیرس سے باہر آ جائے گا۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ کے پاس بے انتہا انرجی کے ذخائر ہیں جن کو استعمال کیا جانا چاہیے اور ماحولیات کو وہ ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔

تارکین وطن کے معاملے میں بھی دونوں صدارتی امیدوار دو مختلف رائے رکھتے ہیں۔ کمالہ ہیرس سمجھتی ہیں کہ تارکین وطن کے خاندانوں کو یکجا کیا جانا چاہیے اور اس سلسلے میں غیر قانونی تارکین وطن کو گرین کارڈ دیئے جانے چاہئیں۔ ویسے ڈیموکریٹس کے پچھلے چار سالہ دور میں تارکین وطن کا مسئلہ ایک سنگین صورتحال اختیار کر گیا ہے جہاں امریکی بارڈر سے غیر قانونی تارکین وطن کا ایک سیلاب آیا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کئی امریکی ریاستوں کے درمیان تارکین وطن کی آبادکاری کے سلسلے میں آپس میں ہی سنگین اختلافات کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ تارکین وطن کی مخالف ریاستیں غیر قانونی تارکین وطن کو بسوں میں بٹھا کر تارکین وطن کی حمایت کرنے والی ریاستوں میں بھیج رہی ہیں۔ نیو یارک سمیت دیگر بڑی امریکی ریاستوں میں غیر قانونی تارکین وطن کی وجہ سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔

تارکین وطن کے معاملے پر ڈونلڈ ٹرمپ انتہائی سخت رویہ رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ اگر صدر منتخب ہوگئے تو وہ غیر قانونی تارکین وطن پر کریک ڈاؤن کریں گے وہ امریکی بارڈر کو بالکل بند کر دیں گے وہ امریکی نیشنل گارڈ سمیت مقامی قانون نافذ کرنے والے اداروں کو استعمال کر کے تمام غیر قانونی تارکین وطن کو، ان کے گینگز کو اور ان کی وجہ سے جنم لینے والے جرائم کو ختم کریں گے۔ ٹرمپ نے ایک بار پھر اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ وہ اگر صدر منتخب ہو گئے تو کئی مسلم ممالک سے تارکین وطن کی آمد کا سلسلہ بالکل بند کر دیا جائے گا جیسا کہ وہ اپنے پچھلے دور حکومت میں بھی کر چکے ہیں۔

اب سے چند ہفتوں کے بعد پانچ نومبر کو امریکی رائے دہندگان یہ فیصلہ کر چکے ہوں گے کہ ان کا اگلے چار سال کے لیے کون صدر ہوگا۔ ٹرمپ کے حامی بہت امید سے ہیں کہ ٹرمپ یہ الیکشن جیت جائیں گے لیکن کمالا ہیرس نے اپنے پہلے صدارتی مباحثے میں ہی ثابت کر دیا وہ بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکتی ہیں۔ ان انتخابات کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو امید یہی ہے کہ اب کی بار ہارنے والے امیدوار کے حامی دارالحکومت پر دھاوا نہیں بولیں گے اور امریکی انتخابات میں بڑھتے ہوئے تشدد کے رجحان کو مزید آگے بڑھنے سے روکیں گے!

"اطراف" کے قارئین جاننا چاہتے ہیں کہ امریکہ میں مقیم مسلمان بالخصوص پاکستانی انتخابات میں کس امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ عاصم متین خان نے چند ایسے پاکستانی سے بات کی ہے جو پاکستانی امریکیوں کی کسی حد تک نمائندگی کرتے ہیں۔ جن کا اپنا ایک حلقہ ہے۔ تنظیمیں ہیں۔ ٹرمپ کی تارکین وطن دشمنی، اسرائیل کی حمایت اور مسلمانوں کے خلاف بیانات کے باعث زیادہ تر امریکی پاکستانی کمالہ ہیرس کے حق میں نظر آتے ہیں۔

# ٹرمپ۔ کمالا۔کس کی حمایت۔ پاکستانیوں کے لیے مشکل فیصلہ۔ ڈاکٹر اعجاز احمد

**رپورٹ: عاصم متین خان**

اب سے کچھ عرصہ قبل تک پاکستانی امریکن امریکی انتخابات میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے تاہم پچھلے چند سالوں میں ایک مثبت تبدیلی آئی ہے اور پاکستانی امریکن نہ صرف امریکی انتخابات میں امیدوار بھی بنے ہیں بلکہ سیاسی بحث اور دیگر سیاسی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے ہیں۔ آنے والے امریکی انتخابات کے سلسلے میں چند پاکستانی امریکنز نے ان خیالات کا اظہار کیا جو اس بات کی عکاس ہے کہ یہ خواتین وحضرات امریکی سیاست کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں بلکہ ان انتخابات کے نتیجے میں ہونے والے مضمرات سے بھی بخوبی واقف ہیں جو نہ صرف امریکہ بلکہ پاکستان اور دیگر دنیا پر بھی اثر انداز ہوں گے۔

6 جنوری کو ٹرمپ کے حامیوں کا امریکی دارُالحکومت پر دھاوا

## ڈاکٹر اعجاز احمد

پچھلے چند سالوں میں امریکی سیاسی بساط پر پاکستانیوں کو آگے لانے میں APPAC یعنی امریکن پاکستانی پبلک افیئرز کمیٹی نے ڈاکٹر اعجاز احمد کی سربراہی میں جو کام کیا ہے وہ پچھلے 50 سالوں میں کوئی پاکستانی تنظیم نہیں کرسکی۔ یہ تنظیم اس قدر منظم اور مؤثر ہے کہ امریکی صدر جو بائیڈن براہ راست ان سے رابطے رکھتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز نے آئندہ امریکی انتخابات کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا کہ اس انتخابات میں ہم ایک المیے کا شکار ہیں جہاں ایک طرف کمالہ ہیرس ہیں اور دوسری طرف ڈونلڈ ٹرمپ جنہوں نے مسلمانوں پر سفری پابندیاں لگائی اور انتہائی درجے کے تارکین وطن مخالف جذبات کا برملا اظہار کیا ان کی سابقہ پالیسی کی وجہ سے ہمیں ایک چیلنج کا سامنا ہے کہ ہم ان کی کیسے حمایت کریں جب کہ وہ ہماری ان اقدار کے خلاف ہیں جو ہمیں بہت عزیز ہیں۔ دوسری طرف نوزائدہ کمالہ ہیرس ہیں جو ہماری کمیونٹی کی ناتجربہ کار اتحادی ہیں ماضی میں اگرچہ ہم نے جو بائیڈن کی حمایت کی تاہم کمالہ ہیرس کی مکمل حمایت

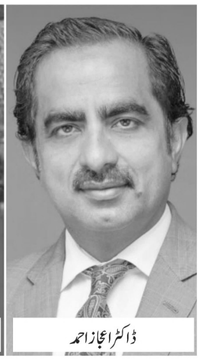
ڈاکٹر اعجاز احمد

احتشام قاضی

محترمہ طلعت ہمدانی

ڈاکٹر ندیم شبیر

مہر خان

کرنے میں ہمیں مشکل ہو رہی ہے جبکہ وہ بائیڈن کی صدارت کا ہی تسلسل ہوگا اسرائیل کے معاملے پر ان کے خیالات پر ہمیں تشویش ہے وہ فلسطینیوں کے حقوق کے معاملے پر فوری توجہ دینے پر زور نہیں دیتیں۔ اور وہ مسلمانوں کی خاص طور پر فلسطینیوں کی کھل کر حمایت نہیں کرتیں جہاں بچے مظالم کا شکار ہیں اور دنیا مشکلات میں گھری ہوئی ہے معصوم انسانوں کے جاری رہنے والے قتل عام اور مظالم پر ہمارے ضمیر پر ایک بھاری بوجھ ہے اور کمالہ ہیرس کی خاموشی ہمارے لیے باعث تشویش ہے ایک پاکستانی مسلم کی حیثیت سے ہمارے لئے ایک بہت ہی مختلف فیصلہ کرنے کی صورتحال ہے ہمیں اگلے چند ہفتوں میں ایک بے حد مشکل فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس کو ووٹ دیں گے اور کس کی حمایت کریں گے بھی یا نہیں ہم ابھی انتظار کر رہے ہیں جب تک صورتحال واضح نہیں ہو جاتی ان کی پالیسی کی شفافیت اور زیادہ سامنے نہیں آجاتی ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔

## احتشام قاضی

پاکستانی بزنس مین احتشام قاضی کا خیال ہے کہ وہ کمالہ ہیرس کو ووٹ دیں گے کیونکہ کمالہ ہیرس ٹرمپ کے مقابلے میں بہتر شخصیت کی حامل ہیں وہ قابل بھی ہیں اور اعتدال پسند بھی۔ تاہم وہ بھی کمالہ ہیرس کی فلسطین کے لیے پالیسی پر خوش نہیں ہیں ان کے خیال میں

**کمالا ہیرس کے ٹرمپ پر تمام الزامات سے متفق۔ طلعت ہمدانی**

ٹرمپ کے مقابلے میں کمالہ نے معاشرے میں جرائم پر کنٹرول کے لئے، قانون کی بالادستی پر، صحت اور تارکین وطن کے معاملے پر درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی اعتدال پسند پالیسی کی وجہ سے دونوں پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام بھی کر سکتی ہیں بلکہ ان کو اعتدال پسند اور کنزرویٹوز کی حمایت بھی حاصل ہوگی جبکہ ٹرمپ انتہا پسندی کی طرف جا کر جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں جو نفرت اور معاشرے میں تقسیم پیدا کرتی ہے۔ احتشام قاضی کے خیال میں اگرچہ کمالہ ہیرس بھی بہترین امیدوار نہیں تاہم ان کی لیڈر شپ ٹرمپ کے مقابلے میں بہتر رہے گی جو نہ صرف امریکہ بلکہ باقی دنیا کے لیے بھی بہتر ہوگا۔

## طلعت ہمدانی

پاکستان کے انتہائی اعلیٰ تعلیمیافتہ گھرانے سے تعلق رکھنے والی اور مقامی امریکی انتخابات میں حصہ لینے والی پاکستانی نژاد امریکی سیاستدان خاتون طلعت ہمدانی کے خیال میں بھی کمالہ ہیرس ایک بہتر صدارتی امیدوار ہیں۔ وہ کمالہ ہیرس کی پچھلی صدارتی بحث میں کارکردگی پر بھی بہت خوش ہیں ان کے خیال میں کمالہ ہیرس نے ٹرمپ کو ٹریپ کر لیا تھا خاص طور پر 6 جنوری 2020 میں واشنگٹن میں ہونے والے ریپبلکن حمائتیوں کے حملے والے واقع پر، ٹرمپ کی سیاہ فاموں کے لیے پالیسی پر اور خواتین کے بارے میں ٹرمپ کے خیالات پر کمالہ ہیرس نے ٹرمپ کو زیر کر دیا۔ محترمہ طلعت ہمدانی نے کمالہ ہیرس کے ٹرمپ پر تمام الزامات سے اتفاق کیا۔

**کمالا ہیرس ٹرمپ کے مقابلے میں بہر حال بہتر ہیں۔ احتشام قاضی**

طلعت ہمدانی کے جواں سال صاحبزادے گیارہ ستمبر کی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی دہشت گرد کارواءی میں اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔

## ڈاکٹر ندیم شبیر

ریاست ایریزونا میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر ندیم شبیر کے خیال میں

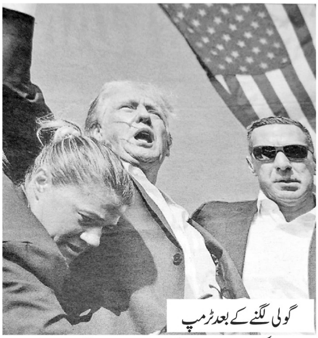

گولی لگنے کے بعد ٹرمپ

ایک امریکی مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ کمالہ ہیرس ایک موزوں صدارتی امیدوار ہیں اور ان کا ووٹ کمالہ ہیرس کے لیے ہی ہوگا ٹرمپ امریکہ کے مفاد میں بھی نہیں اور مسلمانوں کے لیے بدترین صدر ثابت ہوں گے وہ اسرائیل کی

**ٹرمپ امریکی معاشرے کا توازن کھو دیں گے۔ مہر خان**

حمایت کرتے ہیں ان کے خیال میں فلسطین کا موجودہ تنازع پچھلے ٹرمپ دور کی غلط پالیسی کا شاخسانہ ہے جس کے مطابق انہوں نے اسرائیل میں امریکی سفارت خانے کو کہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کر دیا تھا اور پھر ٹرمپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کو چاہئے کہ جو کام انہوں نے شروع کیا ہے اسے تیزی کے ساتھ مکمل کر لیں اور اس کام کی خبریں بھی باہر کی دنیا میں نہ آنے دیں اور یہی وجہ ہے کہ اسرائیل نے اب صحافیوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا ہے ٹرمپ نے جنگ بندی کی بھی کوئی بات نہیں کی اور بعض مسلمان سمجھتے ہیں کہ ٹرمپ بہترین صدر ثابت ہوں گے تو وہ غلط ہیں ان کے خیال میں کمالہ ہیرس بھی کوئی بہت بہترین امیدوار نہیں انہوں نے بھی فلسطینیوں کے قتل عام کے لیے امریکی ہتھیاروں کی اسرائیل کو ترسیل کی حمایت کی اور ڈیموکریٹک کونیشن میں فلسطینی نژاد امریکی کو بولنے کا موقع نہیں دیا لیکن وہ فلسطین کے معاملے میں ٹرمپ کے مقابلے میں چھوٹی شیطان ہیں۔ ڈاکٹر ندیم شبیر کے مطابق ٹرمپ کہتے کچھ ہیں خارجہ پالیسی کے معاملے میں اور کرتے وہ ہیں جو ان کے کارپوریٹ دوست ان کو کہتے ہیں اپنے وائس پریزیڈنٹ کا انتخاب بھی انہوں نے کارپوریٹ امریکہ کے دوستوں کی فرمائش پر کیا۔ ٹرمپ نے سعودی عرب کو اس لیے سپورٹ کیا کیونکہ وہاں سے ان کو پیسے ملے جبکہ قطر کی انہوں نے مخالفت کی جب تک قطر نے ان کو اپنے ناکام ہوٹل کے قیام کی اجازت نہیں دے دی روس کے معاملے میں بھی ٹرمپ کی پالیسی غلط رہی اور ٹرمپ نے بجٹ کا خسارہ بھی تین گنا کر دیا اور درامدات پر ٹیرف کے نتیجے میں امریکہ میں مہنگائی بڑھی اور بڑی بڑی سپر مارکیٹ میں سامان میں کمی واقع ہوئی ان کے خیال میں کمالہ ہیرس صدر بائیڈن کی معاشی پالیسیز کو جاری رکھیں گی جس کے نتیجے میں کووڈ کے بعد بھی امریکی معیشت میں بہتری آئی

**کمالا فلسطین کے معاملے میں ٹرمپ سے چھوٹی شیطان۔ ڈاکٹر ندیم شبیر**

اگرچہ ٹرمپ نے امریکی انفراسٹرکچر کو مضبوط بنانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس کام کو بائیڈن اور کمالہ ہیرس کی ٹیم نے آگے کیا وہ تارکین وطن کے معاملے میں بھی ٹرمپ پر جھوٹ کا سہارا لینے کا الزام لگاتے ہیں۔

## مہر خان

لانگ آئیلینڈ نیویارک میں نارتھ ویل ہیلتھ کیئر سسٹم میں پاکستانی نژاد کلینیکل لیباریٹری منیجر مہر خان بھی ڈیموکریٹک امیدوار کمالہ ہیرس کو ووٹ دیں گی ان کے خیال میں کمالہ ہیرس ایک بہتر امیدوار ہیں جبکہ ٹرمپ نے اپنے پچھلے دور حکومت میں بھی نفرت کو فروغ دیا خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ ٹرمپ انتظامیہ کا رویہ انتہائی نامناسب تھا۔ 34 سال امریکہ میں گزارنے کے بعد ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آج کے دور میں کوئی امریکی صدر اس قدر کھل کر دوسری قومیتوں کے لوگوں کے لیے نفرت کا اظہار کرے گا۔ ڈونلڈ ٹرمپ غیر جمہوری اقدار کو فروغ دینا چاہتے ہیں جس سے امریکی معاشرے کا توازن خراب ہوگا۔

## Feel LIke

> شگفتہ تروتازہ تحریروں سے مرصع 'ان کہی' کی مصنّفہ غزالہ خالد صاحبہ نے ہماری درخواست پر ہر مہینے تازہ ترین درجہ حرارت پر کچھ لکھنا شروع کیا ہے۔ Feel Like پاکستان میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہت حساس ہیں۔ احساس سے سرشار۔ یہ احساس ہی انہیں عقوبت خانوں میں لے جاتا ہے۔غزالہ خالد کی تحریر میں سرجن کے نشتر کی کاٹ بھی ہے۔اللہ کرے ان کی سرجری کامیاب رہے۔درجہ حرارت اور Feel Like بھی ایک پیج پر آجائیں۔

# 12 ربیع الاوّل پر ہر سال کی طرح امسال بھی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں

تحریر: غزالہ خالد

ملک خداداد اپنی اسی پرانی بے ڈھنگی چال سے رواں دواں ہے۔ بے یقینی، بے چینی، تشویش، اضطراب، خوف و دہشت سب ہمارے ساتھ قدم بقدم ہیں پھر بھی ہم جی دار پاکستانی کسی نہ کسی طرح خوشی کے مواقع نکال ہی لیتے ہیں اور کچھ نہیں تو مذہبی تہواروں پر ہی ہنسی ٹھٹول کر کے اپنے آپ کو Feel like پرسکون پرسکون" کر لیتے ہیں۔

## صبح مولانا۔شام مولانا۔ صحت کا پیغام مولانا

مذہبی تہواروں پر بھی وقت گذرنے کے ساتھ نئی نئی باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں میرے عزیز ہم وطن جب feel like بے حس بے حس" کرتے ہیں تو پھر شاید اسی واسطے ننھی ننھی خوشیوں پر دیوانہ وار لپکنے لگتے ہیں۔

بارہ ربیع الاول پر ہر سال کی طرح اس برس بھی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں پچھلے سال ٹرک پر "حور" گھوم رہی تھی تو اس بار" مدنی سانتا کلاز" ٹرک پر چڑھا بچوں میں تحائف بانٹ رہا تھا۔ کراچی کے ایک علاقے میں گٹکے کی نیاز بانٹنے کی وڈیو ہم نے اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھی یعنی وہ دن گئے کہ جب اس بات پر بحث ہوا کرتی تھی کہ بارہ ربیع الاول ہمارے پیارے نبی صلی آللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت ہے یا یوم وفات یا میلاد منانا جائز ہے یا نہیں؟ اب تو بس دیکھئے اور سر دھنئے اگر غلطی سے بھی کچھ بول گئے تو خدانخواستہ Feel like دائرہ اسلام سے خارج تک ہوسکتا ہے اس لئے بس دیکھو، دیکھتے رہو اور منہ پر انگلی رکھے بیٹھے رہو بھیا۔

اللہ کا شکر ہے کہ گرمی کی لہر کم ہوئی اور موسم بہتر ہوگیا، اوائل ستمبر تو Feel like اسلام آباد" گذرا پھر آخر میں دوپہریں تھوڑی گرم گذریں لیکن پھر بھی ستمبر نے اس بار"ستمگر" بن کر نہیں دکھایا شاید پچھلے دنوں کی بارشوں کا اثر ہو یا ستمبر نے سوچا ہو کہ ستمگری کرنے والے پہلے ہی کیا کم ہیں جو میں بھی ان بیچاروں کو نڈھال کردوں اسی لئے" جا بچہ معاف کیا" کہہ کر گذر گیا۔

ستمبر نے تو گرمی نہیں دکھائی البتہ سیاسی صورتحال خوب گرما گرم رہی کئی دن سے یہی ہو رہا تھا کہ جب خبریں سننے کے لئے ٹیلیویژن کھولتے ہنستا ہوا نورانی چہرہ دیکھنے کو ملتا ہم ٹھہرے ایک معصوم پاکستانی وہ بھی گھریلو عورت جو زیادہ گہرائیوں کی سیاست سے نابلد ہے اس لئے جب "صبح مولانا شام مولانا صحت کا پیغام مولانا" ہوتا دیکھا تو پہلے تو خوشی ہوئی کہ شاید گلے شکوے ختم ہونے والے ہیں اور مولانا کی سرکار میں پہنچ کر سبھی ایک ہونے والے ہیں ابھی feel like شکر گذاری" شروع ہی ہوئی تھی کہ پتہ چلا کہ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

جب مسلسل یہ "مصافحے اور معانقے" چلتے رہے تو مولانا سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی کہ" ہائے بیچارے مولانا گلے مل مل کر بھی تھک گئے ہونگے" پھر دل میں کھد بدھ ہوئی کہ معلوم تو کریں آخر ماجرا ہے کیا؟ جس محفل میں جاؤ یہی موضوع گفتگو، جب ٹیلیویژن کھولو"انیسویں آئینی ترمیم، دوتہائی اکثریت اور مولانا مولانا" سننے کو مل رہا ہے۔

اول تو ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہر تھوڑے دن بعد یہ ترمیم کا شوشا چھوڑا ہی کیوں جاتا ہے کبھی تیرھویں ترمیم کبھی پندرھویں ترمیم اور اب انیسویں ترمیم یعنی میم کو"تر" کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے آخر میم کو "خشک" ہی کیوں نہیں رہنے دیا جاتا، مطلب یہ کہ جو کرنا ہے ایک ہی بار کردو لیکن نہیں بھئی کیوں کردیں اگر کردیں گے تو یہ سب تماشے کیسے دیکھنے کو ملیں گے آخر کار جب ان معاملات میں لاعلمی کے باعث feel like "بدھو بدھو" شروع ہوا تو ہم نے سوچا کہ تھوڑی سی محنت کر کے اس معاملے کو کھوج ہی لیا جائے کہ آخر یہ چکر کیا ہے!

آئینی ترمیم ہوگئی مصیبت ہوگئی، مسئلہ کشمیر ہوگیا، فلسطین اور اسرائیل کا جھگڑا ہوگیا جو کسی طرح حل ہونے کا نام نہیں لے رہا (ہوسکتا ہے جب تک آپ لوگ یہ سب پڑھیں مسئلہ حل ہو چکا ہو لیکن فی الحال تو نہیں ہوا ہے)

خیر تو معاملہ کھوجنے پر معلومات میں اضافہ ہوا یعنی آئینی ترمیم کے لئے دوتہائی اکثریت درکار ہے جو مولانا کے بغیر ممکن نہیں اب مولانا کو Feel like" باس باس" تو ہونا ہی تھا ایسے کیسے کسی کے حق میں فیصلہ دے دیں، ناں جی ناں!! آخر"تر"میم کرنے کے لئے"تر" نوالہ بھی تو چاہیئے لہذا اب تیل دیکھیں تیل کی دھار دیکھیں لیکن سوچنے کی ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ چلیں"تر" نوالے کے بعد"تر"میم بھی ہو ہی جائے گی جو"وہ" لوگ چاہ رہے ہیں وہ سب بھی ہوجائے گا لیکن پھر وہی شعر کہ

تجربہ یہ بھی رہا ناکام تو!
پہلے جیسا ہی ہوا انجام تو!

اور مزے کی بات یہ کہ اگر مولانا راضی بھی ہوجائیں تب بھی تین چار ووٹ اور چاہیئے ہونگے اس کے لئے کچھ بیچارے پتلی گردن والے بھی خوفزدہ ہونگے کیونکہ ہمارا ریکارڈ تو یہی ہے کہ ارکان کو وی آئی پی قیدی بھی بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اپنی پسند کا ووٹ نہ لے لیا جائے۔

## پتلی گردنوں والے عوام کا کام۔تماشے دیکھنا

ویسے چلیں چھوڑیں ہمیں کیا!

ہم تو خود پتلی گردنوں والے عوام ہیں ہمارا کام تماشے دیکھنا ہے سو دیکھ رہے ہیں اور ہر بار کی طرح اس بار بھی یہی کہیں گے کہ"ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں"

لیکن اللہ کے بندو ہم عوام کا بھی تو کچھ سوچ لو ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔

ادھر"شیر" ہو یا"تیر" سب کی حالت پتلی ہے"شیر افگن" قید میں ہے اور بقول"کسی" کے ملک ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہے شاباش ہے بھئی شاباش ہے۔

میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

# ماہنامہ ’اطراف‘ کراچی کے دل کے تار چھیڑتے سوالات

## دنیا بھر سے ’اطراف‘ کے کرم فرماؤں کے گدگداتے جوابات

اطراف رپورٹ

”ماہنامہ ’اطراف‘ اُردو کا وہ واحد معیاری جریدہ ہے جو انتہائی اہم مسائل پر پاکستان کے عوام کی رائے حاصل کرنے کو اہمیت دیتا ہے۔” آپ نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟ “گزشتہ 11 سال میں کیے گئے ’جائزوں‘ میں سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ اس میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بھی بہت فراواں رہی۔ ہمارا خیال تو یہ تھا کہ ہم اسے ایک ہی شمارے میں شامل کرلیں۔ لیکن جیسے جیسے قارئین کے قیمتی خیالات کو مرتب کیا گیا۔ تو اندازہ ہوا کہ ایک شُمارے میں ان کا احاطہ مشکل ہوگا۔ ’اطراف‘ اپنے ان تمام کرم فرمائوں کا ممنون ہے کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات نکالے۔ اپنی یادوں کو زحمت دی۔ اس طرح پاکستان کے تعلیمی نظام کے مختلف مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔ ایک نو آزاد ملک میں حکمرانوں۔ والدین اور بچوں نے کس طرح جدو جہد کی۔ ’اطراف‘ کو امید ہے کہ یہ جائزہ پاکستان کے محکمہ تعلیم مرکز اور صوبائی کے بھی کام آسکتا ہے۔ پرائمری تعلیم کے سلسلے میں تحقیق کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں بھی استفادہ کرسکتی ہیں۔ نومبر میں ہم جن کرم فرمائوں کے خیالات شائع کریں گے ان کی فہرست بھی آخر میں نذر قارئین ہے۔ آپ نے اگر اس سروے میں حصّہ لیا اور آپ کو اکتوبر کے شُمارے میں اور نومبر کی فہرست میں نام نظر نہیں آتا تو 0300-8210636 فوری رابطہ کرکے بتائیں۔“

فیل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا۔ پہلی یا دوسری پوزیشن کے لیے مقابلہ چلتا۔ **درشہوار قادری** (برطانیہ)

امی کے ہاتھ کے سینڈوچ۔ اسکول کی بلڈنگ بہت اعلیٰ۔ **پروفیسر ڈاکٹر نعمان احمد** (کراچی)

بغداد کے ٹیچر نے مسلمانوں کیخلاف بات کی۔ میں رونے لگی۔ اگلے دن سے وہ ٹیچر نظر نہیں آئی۔ **نضیرہ اعظم**، واشنگٹن (امریکہ)

اسکول کرائے کے ایک کھلے مکان میں۔ کھیل کا میدان نہیں۔ **پروفیسر قدرت اللہ شہزاد** (بہاولپور)

کڑھی چاول گھر میں پکتے تو اسکول بھیجے جاتے۔ **حسن راشد** (حیدرآباد)

سوراخ دار کارڈوں پر سوئی۔ رنگ برنگ دھاگوں سے پھول کاڑھتی تھی۔ **عفت سلطانہ** (کراچی)

اساتذہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے۔ الگ سے بلا کر سمجھا دیا کرتے تھے۔ **انجم عثمان** (کراچی)

پڑھائی پر بہت توجہ۔ افسر اسکول کا دورہ کرتے تھے۔ **الطاف احمد** (کراچی)

بچپن کی تعلیم وہاں جہاں گنگا رام اور گورونانک جیسے لوگ رہے۔ **تنویر شہزاد** (لاہور)

اساتذہ مارتے نہیں تھے۔ بریک بند کردیتے تھے۔ **منزہ سہام مرزا** (کراچی)

## میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

اسکول کی بلڈنگ سوسال پہلے اپنی مدد سے بنائی گئی تھی۔ **آفتاب میمن** (کراچی)

ایک کلاس میں سارے مضامین ایک ہی ٹیچر پڑھاتی تھی۔ **کرن فرشوری** (کراچی)

اسکول کے باہر خالی زمین میں اسمبلی بھی تقریبات بھی۔ **رمضان بلوچ**، لیاری (کراچی)

اسکول کی عمارت بہت کھلی وسیع۔ دونوں اطراف کلاس روم۔ درمیان میں میدان۔ **عبدالرشید** (کراچی)

اساتذہ مرغا بناتے تھے۔ دو انگلیوں کے درمیان پینسل بھی دباتے تھے۔ **محمد حسین** پروگرام منیجر، ریڈیو پاکستان (حیدرآباد)

لڑکیوں کا اسکول نہیں تھا۔ تیسری جماعت تک لڑکوں کے اسکول میں پڑھا۔ ماہر تعلیم **شبنم گل** (حیدرآباد)

اساتذہ بہت شفیق۔ نرم خو۔ چار پانچ وسیع کھیل کے میدان۔ **اسماء مشتاق** (اسلام آباد)

تختی لکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ ایک حوض پر تختی کو چکنی مٹی سے پوتتے۔ **پروفیسر ڈاکٹر رئیس صمدانی**۔ منہاج یونیورسٹی (کراچی)

ڈانٹ کم تھی مار زیادہ۔ سبق یاد نہ کرنے والے پٹتے تھے۔ **پروفیسر محمد نجیب خان لودھی** (حیدرآباد)

اپنے گاؤں کی پہلی لڑکی جس نے پرائمری سے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔ 50 سال پہلے کا اسکول آج بھی پانچ جماعتوں پر ہی مشتمل ہے۔ ممتاز مصنفہ، **نازیہ آصف** (گجرات)

اسکول کی بلڈنگ بہت چھوٹی سی تھی۔ پلے گراؤنڈ نہیں تھا۔ **فہیم صدیقی** (کراچی)

امریکی تحفہ خشک دودھ پانی میں گھول کر سب طالب علموں کو پلایا جاتا تھا۔ **مقبول خان** (کراچی)

پانچویں کا امتحان کسی دوسرے اسکول میں۔ پرچوں کی جانچ بھی اسی اسکول کے اساتذہ کرتے تھے۔ **حرا شبیر** (کراچی)

ہماری پرائمری تعلیم کا آغاز ڈگری کالج میں ہوا۔ **جویریہ یاسمین**، میرپور (آزاد کشمیر)

اسکول جانے کے لیے قریباً 20 منٹ پہاڑی چڑھنی پڑتی تھی۔ **صحافی فخر عالم قریشی**، تھک بابوسر (گلگت بلتستان)

اسکول کی عمارت بہت کشادہ۔ سیمنٹ کا سخت پلے گراؤنڈ بھی تھا۔ **محمد یعقوب**، ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن (حیدرآباد)

بیگم مرزا ظفر الحسن اتاترک سے متاثر تھیں اس لیے اتاترک اسکول کھولا۔ مصنف **میر حسن علی امام** (کراچی)

پرائمری کے لیے ہم جماعتوں سے جتنے تعلقات استوار ہیں شاید کالج یونیورسٹیوں والوں سے بھی نہیں۔ **پروفیسر پرویز احمد** (پٹارو)

غیر نصابی سرگرمیاں نہیں۔ کبھی کبھی ایک مداری تماشا دکھانے آتا تھا۔ ناول نگار **زیب سندھی** (حیدرآباد)

پرائمری تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ لہٰذا دوست نہیں بنے۔ **شاہین رشید**، خواتین ڈائجسٹ (کراچی)

پہلی سے چوتھی تک ہر سال اوّل رہا۔ امی جلیبیاں منگواتیں پورے محلے میں بانٹتیں۔ شاعر۔ نثر نگار، **انجم جاوید** (کراچی)

انجمن حمایت اسلام لاہور کی درسی کتب چوتھی تک پڑھائی جاتی تھیں۔ **احمد جاوید**، جامعہ نگر (نئی دہلی)

## یادیں پرائمری کی۔ باتیں پرائمری کی

### درشہوار قادری۔ برسٹل۔ برطانیہ

1۔ 1961 میں پہلی کلاس میں میرا داخلہ ہوا۔ داخلہ کرانے مجھے لے کر میرے ماموں گئے۔ چند روپے آفس میں ادا کیے اور میرا داخلہ ہوگیا۔ اسکول کا محل وقوع بتاتی چلوں۔ کراچی میں متوسط سرکاری ملازمین کی کالونی 1956 میں فیڈرل کیپٹل ایریا کے نام سے بسائی گئی تھی جہاں بنیادی سہولتوں کے ساتھ گرلز اور بوائز کے لیے الگ الگ اسکول بھی قائم کیے گئے۔ گلابی رنگ کی کسادہ عمارت آج بھی نظروں میں سمائی ہوئی ہے۔ ہمارا سرکاری فلیٹ اور اسکول اتنے جڑے ہوئے تھے کہ جب اسکول کی گھنٹی بجتی تب میں بستہ لے کر دوڑ لگاتی اور اسمبلی کی قطار میں شریک ہوجاتی۔

2۔ پرائمری سطح پر سارے ہی مضامین بنیادی طور پر پڑھائے جاتے تھے جس میں اُردو۔ حساب (ریاضی)۔ معاشرتی علوم۔ جنرل سائنس۔ ڈرائنگ۔ اسلامیات وغیرہ تھیں جبکہ پرائمری سطح پر انگریزی نہیں تھی وہ ہم نے چھٹی کلاس سے پڑھی۔

3۔ قاعدے کتابیں کورس کی آج بھی نظر میں گھومتی ہیں مگر نام یاد نہیں۔

4۔ اساتذہ نہ مارتے تھے اور نہ ڈانٹتے تھے بس آنکھیں دکھاتے تھے اور ہمارے لیے وہی کافی تھیں بہت قابل اور مشفق اساتذہ جو آج بھی میری دعاؤں میں شامل ہیں۔ پرائیویٹ ٹیوشن اور کوچنگ سینٹرز ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔

5۔ سرکاری اسکول کی یونیفارم نیلی فراک سفید شلوار اور سفید (وی V) کی شکل میں دوپٹہ تھا۔

6۔ امی ٹفن میں ڈبل روٹی۔ انڈا یا کوئی پھل رکھ کر دیتیں اور جب کبھی ہمارا دل اسکول کینٹین سے کھانے کو چاہتا تو گھر کے ٹفن کی چھٹی ہوجاتی۔

7۔ اسکول کے باہر ٹھیلے اور پتھارے والوں کا ہجوم ہوتا جہاں سے رش کی وجہ سے ہم نے کبھی نہیں خریدا۔

8۔ الحمدللہ کسی جماعت میں فیل ہونے کا سوال ہی نہیں ہوا بلکہ پہلی یا دوسری پوزیشن لینے کا مقابلہ چلتا میرے اور میری ہم جماعت شاہین عابد کے درمیان۔ کبھی وہ فرسٹ آتی اور میں سیکنڈ اور کبھی میں فرسٹ پوزیشن لیتی اور شاہین سیکنڈ۔ یوں صحت مند مقابلے جاری رہتے۔ شاہین پچھلے دنوں امریکہ میں انتقال کرگئی۔ اللہ مغفرت کرے۔

9۔ پانچویں کلاس میں 92 فیصد نمبر آئے تھے۔ یہ بورڈ کا امتحان ہوتا تھا جس کے نتیجے میں مجھے 2 سال کے لیے اسکالرشپ ملا۔ یہ میری تعلیمی زندگی کی پہلی بڑی کامیابی تھی۔ مزے کی بات کہ میرے والدین کو کبھی میرے لیے اسکول آنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی یقیناً وہ میری تعلیمی سرگرمیوں سے بہت مطمئن تھے۔

10۔ جی مارکس شیٹ سنبھال کر رکھی ہے۔

11۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مثلاً نعت خوانی۔ تقریری مقابلے۔ تحریری مقابلے۔ اسٹیج پروگراموں کی اناؤنسمنٹ وغیرہ میں اپنا حصہ ضرور ڈالا۔

12۔ پرائمری اسکول کے کئی ہم جماعت یاد ہیں۔ عائشہ شاہین۔ نگہت افتخار۔ گوہر تاج۔ فوزیہ۔ شمیم وغیرہ مگر اب رابطہ چند سے ہے۔

13۔ اُردو میڈیم تھا مگر اللہ کے فضل سے ہمیں کبھی Complex نہیں ہوا۔

14۔ گلابی رنگ کی ڈبل اسٹوری بلڈنگ کئی پلے گراؤنڈ رکھتی تھی۔ اسپورٹس کا باقاعدہ پیریڈ ہوتا تھا۔

15۔ کلاس ون اور ٹو میں دری پر بیٹھے۔ تیسری جماعت میں ڈیسک والی کلاس ملی۔

16۔ تختی بہت لکھی جس کی بدولت لکھائی نکھر گئی ورنہ ڈاکٹر کے نسخے والا حال ہوتا کہ اس کے لکھے نسخے بس کیمسٹ ہی پڑھ سکتا ہے آپ میری تحریر پڑھ کر کہہ اٹھیں۔ اپنا لکھا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ یا پھر کہنے والے کہتے۔ یہ لکھائی ہے کسی اور کی اور اسے پوچھتا کوئی اور ہے۔

## ہر کلاس میں اول

### پروفیسر ڈاکٹر نعمان احمد، این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی

1۔ لٹل فوک اسکول نارتھ ناظم آباد کراچی 1972 سے 1976

2۔ انگریزی۔ اردو۔ جنرل سائنس۔ سوشل اسٹڈیز۔ اسلامیات۔ ریاضی۔ آرٹس۔ سندھی۔

3۔ عام درسی کتابیں۔ سائنس۔ سوشل اسٹڈیز۔ کاپیاں۔ سنگاپور سے مطبوعہ۔

4۔ کبھی بھی۔

5۔ ہلکے سبز رنگ کا پائجامہ۔ سفید قمیص۔ سیاہ جوتے۔ سرخ ٹائی۔

6۔ امی کے ہاتھ سے بنے سینڈوچ۔

7۔ اسکول کی کینٹین اچھی تھی۔

8۔ ہمیشہ اول۔

9۔ ہر کلاس میں پہلے۔

10۔ جی نویں اور دسویں کی۔

11۔ جی اسکول کی پروگراموں میں۔ کھیل۔ اسکاؤٹنگ۔

12۔ سوشل میڈیا کے ذریعے بعض کلاس فیلوز سے رابطہ ہے۔

13۔ انگریزی میڈیم۔

14۔ اسکول کی عمارت بہت وسیع۔ کھیل کے میدان بھی۔

15۔ اسکول میں فرنیچر بہت عمدہ تھا۔

## فرنچ کانونٹ بغداد میں فرانسیسی

### نصیرہ اعظم۔ واشنگٹن

میری تعلیم کسی ایک شہر یا ملک میں مکمل نہیں ہوئی اور خصوصاً پرائمری تعلیم۔ بچپن میں میری والدہ نے چار سال کی عمر تک گھر پر پڑھایا جس میں پاکستان کے بارے میں بچوں کی ایک کتاب (نام یاد نہیں) حساب، اردو اور انگریزی کے حروف تہجی، رنگوں کے نام، بڑوں کے ساتھ آداب وغیرہ شامل تھے۔ پھر نیوٹاؤن اسکول میں داخلہ ہوا لیکن ڈیڑھ سال کے اندر میرے والد کو حکومت پاکستان کی طرف سے بغداد میں کہربا الوطنیہ (قومی ادارہ برائے بجلی) میں ڈائریکٹر نامزد کیا گیا۔ وہاں میری تعلیم ایک فرنچ کانونٹ میں ہوئی۔ آپ کے سوالوں کے بالترتیب جواب حاضر ہیں۔ :1 فرنچ کانونٹ، بغداد

ہمارے اس اسکول میں فرانسیسی زبان، یورپین اور اسلامک بنیادی تاریخ کی تعلیم، انگریزی، حساب پڑھایا جاتا اور کلاس میں عملی طور پر سچ، محبت اور دوسروں کی امداد اور خیال کے بارے میں چھوٹے اسکٹ کے ذریعے بتایا جاتا تھا۔ پڑھائی بھی تصاویر اور ان کی تفصیل کے ذریعے ہوتی تھی۔ :3 صرف لائبریری میں اینڈ بلائٹن اور فیری ٹیلز یاد ہیں۔ :4 اساتذہ نے کبھی ڈانٹا نہیں، غلطی پر نرمی سے سمجھاتیں، ہوم ورک نہ کرنے پر ٹائم دیتیں کہ جتنی دیر میں دوسرے بچوں کی کاپیاں دیکھ رہی ہوں آپ ہوم ورک کلاس میں ہی کریں اور اس کے ساتھ ہر روز املا اور کلاس ورک بھی ہوتا تھا مار کا کوئی تصور تک نہیں تھا۔ :5 یونیفارم لڑکیوں کے لئے سفید فراک، سفید موزے، کالے جوتے اور بال سرخ یا سفید ربن سے باندھے جاتے جبکہ لڑکوں کے لئے سفید قمیض اور خاکی پتلون اور کالے جوتے یونیفارم کا حصہ تھے۔ :6 لنچ عام طور پر ایک سینڈوچ، کوئی سا موسم کا پھل اور دودھ گھر سے ملتا تھا، کبھی کبھار والدہ ایک پراٹھا اور شہد بھی دیتی تھیں۔ :7 ہمارا اسکول ایک کلیسا کا ہی حصہ تھا اور بغداد کی بڑی شاہراہ رشید اسٹریٹ

پر تھا اور اسکول کی بس ہمیں رشید اسٹریٹ پر بنی ایک انداز اُ سوفٹ کی پکی گلی کے سامنے اتارتی تھی اس گلی کے اختتام پر ہمارے اسکول کا قد آدم دروازہ تھا۔ یہاں کوئی ٹھیلے وغیرہ کا تو رواج نہ تھا، ہاں گلی میں داخل ہوتے ہی ایک آدمی ایک چھوٹی سی چھابڑی لگائے بیٹھا ہوتا تھا جو موسم کے پھل چھوٹے تھیلوں میں بیچتا تھا ہم سب کو کھٹے آلو بخارے بہت پسند تھے اور جس دن وہ لاتا ہم سب کی عید ہو جاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسکی چھابڑی خالی ہو جاتی۔ اسے وہاں بیٹھنے کے لئے اور پھل بیچنے کے لئے اسکول کی طرف سے شاید دو گھنٹوں کی اجازت تھی۔ یہ بھی ہوتا کہ اکثر اس چھابڑی والے کے پاس ایک سسٹر(نن ( بھی نظر آتی تھیں۔ :8 فیل ہونے کا موقع ہی نہ ملا کوشش تو کی مگر ایسا ہو نہ سکا۔ :9 شاید :10 68٪ کوئی سرٹیفکیٹ یا مارکس شیٹ نہیں رہی اور نہ ہی رپورٹ کارڈ۔ :11 غیر نصابی سرگرمیوں میں ڈرامے، ڈانس، ڈبیٹ، تقریری مقابلے تھے اور میں نے سب میں حصہ لیا، ڈانس میں بیلے سیکھ رہی تھی، ڈرامے ، ڈبیٹ اور تقاریر میں بھی حصہ لئے جن کے موضوعات دلچسپ ہوتے تھے مثلاً تقاریر میں دوڑنے کی اہمیت، ہم مدد کیوں کرتے ہیں؟، ہمیں کونسا کھیل پسند ہے اور کیوں؟ ہمارے تمام نصابی مضامین فرانسیسی زبان میں تھے سو یہ سب غیر نصابی سرگرمیاں بھی فرانسیسی میں ہی تھیں انگریزی کا صرف ایک پیریڈ ہوتا تھا اس وجہ سے کبھی کبھار کوئی تقریر یا مباحثہ انگریزی میں بھی ہوتا تھا۔ :12 میرے ہم جماعت یاد ہیں لیکن ان سے رابطہ نہیں، اینٹو، پاول، برینڈا ابی لاشا۔ :13 فرنچ میڈیم :14 ایک کلیسا تھا اور ایسی جگہ پر تھا کہ کوئی بڑا کھیل کا میدان نہیں تھا، ہماری پی ٹی بھی ہوتی تھی اور وہ وہیں پر جہاں ہر روز صبح اسمبلی لگتی۔ اس اسمبلی میں دعا ہوتی تھی اور مسلم اور غیر مسیحی بچوں کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ یہ دعا پڑھیں اور سینے پر صلیب کا نشان بنائیں۔ : 15 لکڑی کا فرنیچر۔ :16 وہاں تختی تو نہیں لکھی جاتی تھی لیکن ہینڈ رائٹنگ درست کرانے کے لئے یہ کلاس ورک کا ہی حصہ تھی۔

مجھے اپنی کئی اساتذہ ابھی بھی یاد ہیں، مادام مشلین جو ہمیں فرنچ اور فرانس کے بارے میں پڑھاتی تھیں، سسٹر ایلزبتھ جو وائس پرنسپل تھیں ہمیں ہفتے میں ایک دن فرنچ بولنے کی تربیت دیتی تھیں، مسز بریگنز ایہ انڈین کرسچین تھیں اور انگریزی پڑھاتی تھیں اور جیسے مجھے اگر کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تو اسے اردو میں بتاتی تھیں مثلاً ایک بار وہ ایک سبق پڑھا رہی تھیں اس میں لفظ آیا eiderdown یہ چوتھی جماعت کا واقعہ ہے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور سمجھ گئیں کہ میں یہ لفظ نہیں سمجھی مگر انہوں نے تصدیق کی اور باقی کلاس سے کہا کہ اسے یہ لفظ سمجھ میں نہیں آرہا ہے میں اس کی زبان میں بتا دوں؟ سب بچوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو بولیں یہ جو آپ رضائی اوڑھتی ہیں اسے انگلش میں آئیڈرڈاؤن کہتے ہیں۔ مادام مونیکا بھی یاد ہیں جو ہمیں اسلامی تاریخ پڑھاتی تھیں ایک روز انہوں نے کلاس کو بتایا کہ مسلمان ظالم ہوتے ہیں وہ سزا کے طور پر لوگوں کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں، عورتوں کے ساتھ سلوک اچھا نہیں کرتے اور بھی کچھ کہا جو مجھے یاد نہیں۔ میں نے رونا شروع کر دیا وہ سمجھیں کہ مجھے کوئی تکلیف ہے بولیں اگر تم باہر جانا چاہتی ہو تو کوئی بات نہیں۔ میں فوراً ہی نکل کر چلی گئی اور باہر ایک بنچ پر بیٹھ گئی تھوڑی دیر میں کلاس ختم ہوئی تو پاول اور اینٹو میرے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے کہا مادام مونیکا نے مسلمانوں کو بہت برا کہا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں سب دوستوں کو یہ بات پتہ چل گئی کہ میں کس لئے روئی تھی۔ اگلے دن ہم پانچ دوست کلاس کے باہر بینچ پر بیٹھ گئے اور مادام مونیکا کی کلاس میں احتجاجاً نہیں گئے۔ آدھا پیریڈ گذر گیا تو سسٹر ایلزبتھ راؤنڈ لیتی ہوئی ادھر پہنچیں اور کچھ حیرت سے ہمیں دیکھا۔ جب انہیں ساری بات کا علم ہوا تو بولیں ابھی تم لوگ کلاس میں جاؤ۔ ہم سب اٹھ کر اندر چلے گئے اور جیسے ہی کلاس ختم ہوئی مادام مونیکا کمرے سے باہر گئیں تو سسٹر ایلزبتھ کلاس میں داخل ہوئیں، اور انہوں نے وہ سب پوچھا جو پس نے اور میرے دوستوں نے بتایا تھا۔ سب ہی نے اس کی تصدیق کی، اور پھر اگلے دن سے مادام مونیکا نے نہ ہماری کلاس لی اور نہ وہ کہیں نظر آئیں۔ انہیں شاید پرنسپل جو فادر تھے انہوں نے شاید کہیں اور بھیج دیا مگر ہمارے سیکشن میں وہ پھر نظر نہیں آئیں۔

# چوتھی جماعت تک تختی لکھی


## پروفیسر قدرت اللہ شہزاد

### سابق صدر نشیں شعبہ اُردو، صادق پبلک اسکول بہاولپور


ہمارا پرائمری سکول میونسپل کمیٹی کے زیر انتظام چلتا تھا۔ اس کا نام تھا " لازمی تعلیم حلقہ نمبر "

1۔ یہ 60 کی دہائی کے دوسرے نصف کی بات ہے۔

2۔ حساب، اردو، واقفیت عامہ، اسلامیات اور سائنس کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔

3۔ تمام سرکاری سکولوں میں حکومت کا منظور شدہ یکساں نصاب تھا۔

4۔ اساتذہ خوب مارتے تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ تو معمول کی بات تھی۔

5۔ کوئی مخصوص یونی فارم نہیں تھا۔

6۔ گھر سے لنچ کا رواج نہیں تھا۔ سکول گھر کے قریب ہی تھا۔ اس لیے بریک میں گھر آکر کچھ کھا لیتے تھے۔

7۔ سکول کے سامنے زمین پر بیٹھ کر سفید ریش بابا پیرو چنے، رواں، شکر قندی، مقامی ساختہ گولیاں جنھیں آجکل کینڈیز کہا جاتا ہے، بیچا کرتا تھا۔ اس کی چھابڑی میں اسی نوع کی دو تین چیزیں اور بھی ہوتی تھیں۔ جیسے سردیوں میں ریوڑی، تل شکری وغیرہ۔

8۔ الحمدللہ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوا۔

9۔ بورڈ کے امتحان کی طرز پر پورے شہر کے سرکاری سکولوں کی جماعت پنجم کے طلبہ کا کسی کھلے سکول میں امتحان ہوتا تھا۔ اسے سنٹر کا امتحان کہتے تھے۔ میں نے پانچویں جماعت کے اس امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ یعنی شہر کے تمام سکولوں میں دوسری پوزیشن تھی۔

10۔ میرے والد محترم دستاویزات بہت سنبھال کر رکھتے تھے۔ اس دستاویز کی کبھی ضرورت پڑی نہ کبھی خیال آیا۔ اس لیے یاد نہیں۔ ہائی سکول میں داخلہ کے لیے اصل سرٹیفکیٹ جمع کرانا ہوتا تھا، قیاس ہے کہ نئے سکول میں جمع ہو گیا ہوگا۔ فوٹو سٹیٹ مشین ابھی آئی نہیں تھی۔ ٹائپنگ سے نقول تیار کرنے کا رواج تھا۔ ممکن ہے والد مرحوم کے بچے کھچے کاغذات میں کوئی نقل موجود ہو۔

11۔ غیر نصابی سرگرمیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ایک آدھ مرتبہ کسی سکول میں تقریری مقابلہ تھا، ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے فرزند کو تیار کرا کر بھیجا تھا۔ اس نے مقابلے میں کوئی پوزیشن بھی لی تھی۔

12۔ پرائمری کلاسوں کے ہم جماعتوں کے نام یاد ہیں۔ مثلاً اظہر بیگ، ماجد مفتی، نسیم، اکبر، نظام الدین، حبیب وغیرہ۔ پہلے کبھی کبھار کسی نہ کسی سے سر راہ ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب کئی برس سے کوئی نہیں ملا۔

13۔ ہمارا اسکول اردو میڈیم تھا۔ انگریزی کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ ہم نے ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں اے بی سی سیکھی تھی۔

14۔ بلڈنگ کہاں۔ سکول کرائے کے ایک ذرا کھلے مکان میں تھا۔ پھر قریب ہی دو منزلہ مکان میں منتقل ہو گیا جو نسبتاً تنگ تھا۔ پلے گراونڈ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بریک میں بچے سکول یا گلی میں ہی کھیلتے تھے۔

15۔ تیسری جماعت تک ٹاٹ پر بیٹھتے رہے چہارم اور پنجم میں دو یا تین نشستی بنچوں پر بیٹھتے تھے۔

16۔ جی۔ بالکل۔ چوتھی جماعت تک تختی لکھی۔ پانچویں میں رف کاپی استعمال کی۔

## ہمارا اسکول مسجد کی حدود میں تھا

### حسن راشد۔صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی حیدر آباد

(متعلم 95-1990ء گورنمنٹ مسجد پرائمری اسکول پھلیلی تھانہ، رشی گھاٹ، حیدر آباد)۔صدر شعبۂ اردو۔گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی حیدر آباد

قیام پاکستان کے بعد میرے آباؤ اجداد ریاست الور سے ہجرت کر کے حیدر آباد سندھ چلے آئے۔ حیدر آباد میں جس جگہ پڑاؤ ڈالا وہ پھلیلی نہر سے نیچے چنگی ناکے کے قریب تھی اور جو مکان ملا وہ اس وقت کے لحاظ سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ دادا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو سرکاری سکولوں کے ذریعے زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ میرے والد مرحوم عبدالحمید قرنی بھی پرائمری سے ہائی تک سرکاری اسکول میں درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ دیگر بہن بھائیوں کی طرح ہمیں بھی بچپن ہی سے سرکاری سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کا اعزاز رہا ہے۔ پانچ سال ہوتے ہمیں جس سکول میں داخل کرایا گیا وہ گھر کے قریب واقع ایک سرکاری اسکول تھا اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں جونیجو حکومت نے 1985ء میں نئی روشنی اسکول قائم کیے عمارتوں کی کمی کے پیش نظر مسجدوں میں سرکاری اسکولوں کا اغاز کیا گیا تھا۔ گورنمنٹ مسجد پرائمری اسکول پھلیلی تھانہ چوک حیدر آباد انھی میں سے ایک تھا۔ یہ اسکول قریب ہی دوسری جگہ وشن نگر نزد پاکستانی چوک پر منتقل ہو گیا ہے۔ اس اسکول میں مخلوط تعلیم دی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زائد تھی آگے لڑکے اور پیچھے لڑکیاں بیٹھتی تھیں۔ بیٹھنے کے لیے دریوں کی فرشی نشستیں ہوتی تھیں۔ ہمارے اسکول کو مسجد اسکول کے ساتھ ساتھ سرکاری اسکولوں کی مانند پیلا اسکول بھی کہا جاتا تھا ہم لڑکوں کے لیے پیلا لباس اور لڑکیوں کے لیے فیروزی اور سفید شلوار پر مبنی یونیفارم تھا۔ شاید غربت کے سبب جوتے پہننے کے معاملے میں رعایت برتی جاتی تھی۔ لکھنے کے لیے ابتدا میں سلیٹ چاک اور بعد میں کاپی اور پنسل رائج تھی۔ عمومی کام کے لیے سیاہ پینسل اور سوال تحریر کرنے کے لیے لال پینسل کی اجازت تھی۔ تمام تر تدریسی عملہ خواتین پر مشتمل تھا پہلی سے پانچویں تک پانچ کلاسیں ہوتی تھیں جتنی کلاسیں تھیں اتنی ہی اساتذہ ہوتی تھیں ہر ایک کے لیے ایک کرسی میز مختص تھی جس پر حاضری رجسٹر، ہوم ورک، کلاس ورک، کھانا پینا سب کچھ ہوتا تھا۔ دیواروں پر پانچ مختلف جگہ 4,4 فٹ کی مربع شکل میں سیاہ رنگ کر کے بورڈ کا کام لیا جاتا۔ اسکول کا تمام تر نصاب سرکاری تھا اور سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ پیون وغیرہ کی سہولت محکمۂ تعلیم نے دی نہیں یا اسکول انتظامیہ نے نہیں لی۔ مردوں سے رابطے اور ریفریشمنٹ کے لیے ہم خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے یوں کبھی ہم اور کبھی ہمارے ہم جماعت ساتھیوں کو موقع ملتا۔

اسکول کے اردگرد کی آبادی تقریباً اردو اسپیکنگ ہے لہٰذا بچے بھی اردو اسپیکنگ ہوتے تھے تمام خواتین اساتذہ سندھی اسپیکنگ تھیں لیکن تمام اساتذہ نہایت محنت اور محبت سے اس طرح پڑھاتی تھیں کہ آج بھی ان کی باتیں دل و دماغ میں رچی بسی ہیں۔ راقم کی دوسری جماعت تک بنیاد کمزور تھی اسی لیے اردو سمیت کوئی مضمون پلے نہیں پڑتا تھا اور جب اردو قاعدہ سمجھ میں آنے لگا تو تمام مضامین گھتیوں کی طرح ایک ایک کر کے سلجھتے گئے۔ پرائمری اسکول کے اساتذہ میں محبت، خلوص اس قدر تھا کہ ان سے ہمارے خاندانی تعلقات ہو گئے جب کبھی گھر میں کڑھی چاول جیسے پکوان تیار ہوتے تو اسکول بھیجنے کے لیے خاص اہتمام کیا جاتا۔ مس راحت، مس فرزانہ، مس نوشابہ، مس تسلیم اور ہیڈ مسٹریس میڈم زرینہ ہماری ہر دلعزیز استانیاں ہیں ان میں سے کچھ سبکدوش ہو چکی ہیں اور کچھ تا حال فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ مس نوشابہ حیدر آباد کے سابق ڈپٹی کمشنر معتصم باللہ کی اہلیہ ہیں ان کے ایک صاحبزادے کو پبلک اسکول حیدر آباد میں راقم نے پڑھایا ہے۔ اسکول چونکہ مسجد میں واقع تھا اس کے لیے مسجد کی پہلی منزل مختص تھی۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک کے طلبہ کے لیے بنیادی دینی تعلیم لازمی تھی ایک ایک کلاس باری باری نیچے مدرسے

میں مولوی صاحب کے پاس جاتی، مولوی رمضان صاحب ملتان کے تھے اور امامت کے ساتھ ساتھ مسجد کے مدرسہ میں بھی پڑھاتے تھے۔ اور چھت پر حجرے میں اہل خانہ کے ساتھ سکونت تھی وہ ہمیں مسجد کے صحن میں دو رویہ کھڑا کر کے باجماعت سورتیں پڑھنے کو کہتے اور خود ٹہلتے جاتے اور سنتے جاتے تھے جہاں ہم غلطی کرتے وہاں فوراً اصلاح ہو جاتی یوں رفتہ رفتہ روزمرہ امور کے لیے سورتیں حفظ ہو جاتیں۔ مولوی رمضان صاحب کی عمر اس وقت 90 برس سے زائد ہے اور ملتان میں پیرانہ سالی کے ایام گزار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری استانیوں اور مولوی صاحب کو ایمان وصحت کے ساتھ عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین

## سب سے اہم یاد۔ پہاڑے جور ٹوائے جاتے تھے

### عفت سلطانہ۔کراچی

پرائمری تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ تعلیم کی بنیاد ہوتی ہے

1۔ ہم نے پرائمری تعلیم کراچی سے حاصل کی سرکاری آفیسرز کی ایک کالونی ہوتی تھی پاکستان کوارٹرز کے نام سے۔ شاید اب بھی ہوگی

یہ 65۔ 70 کا عرصہ تھا

2۔ مضامین میں پہلی سے تیسری جماعت تک تو اردو کا قاعدہ ، گنتی اور تھوڑے بہت سادہ سے جمع تفریق کے سوالات ہوتے تھے اس کے علاوہ ڈاٹ والی خوشخطی کی کتابیں ہوتی تھیں جن پر ہاتھ پھیر کر لکھنا سیکھتے تھے چوتھی ، پانچویں میں اردو ، ریاضی کے ساتھ ساتھ سائنس اور معاشرتی علوم بھی ہوتی تھی اور ڈرائنگ بک ہوتی تھی۔ کلر پینسلز استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سفید رنگ کے سوراخ والے کارڈ ہوتے تھے۔ جن پر پھول یا اشکال بنی ہوتی تھیں۔ ان کارڈوں کو سوئی اور رنگ برنگے دھاگوں سے کاڑھا کرتے تھے۔ اس کام میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ صرف لڑکیوں کے سکولوں میں ہوتا تھا

3۔ قاعدے اور کتابوں کے علاوہ ڈاٹ والی کتابیں ہوتی تھیں نقطوں پر پینسل سے ہاتھ پھیر کر الفاظ مکمل کرتے تھے۔ ڈرائنگ بکس میں بھی اس طرح ہوتا تھا

4۔ خواتین اساتذہ بہت زیادہ تو نہیں مارتی تھیں البتہ ڈانٹتی ضرور تھیں۔ ایک ٹیچر البتہ بچیوں سے خدمت لیتی تھیں کلاس میں سر اور ہاتھ پاؤں دبواتی تھیں

5۔ یونیفارم میں نیلی فراک یا قمیض اور سفید شلوار شامل تھی۔ چوتھی پانچویں جماعت میں وی شیپ سفید دوپٹہ ہوتا تھا۔ البتہ بڑی باجیاں سکول آتے جاتے وقت بڑا دوپٹہ لیتی تھیں۔ سکول ٹائم میں وہ بھی وی پہنتی تھیں

6۔ اس زمانے میں آجکل کی طرح کے لنچ بکس کا تو رواج نہیں تھا۔ امی نے کپڑے کی پوٹلیاں سی رکھی تھیں جن کا منہ دھاگے سے بند ہو جاتا تھا اس میں جو بھی میسر ہوتا تھا ڈال دیتی تھیں۔ لیکن یہ روزانہ نہیں ہوتا تھا۔ کونکہ امی پراٹھے کا ناشتہ کرواتی تھیں تو بھوک نہیں لگتی تھی۔ پرائمری سکولز کے ٹائمنگز بھی کم ہوتے تھے

7۔ سکول کے آس پاس کچھ نہیں ملتا تھا۔ نہ ٹھیلے نہ دکانیں بس ملحقہ سیکنڈری سکول کے ایک کمرے میں کینٹین والا بریک میں کھانے پینے کی اشیا فروخت کرتا تھا اس کا سب سے زیادہ بکنے والا آئٹم بند اور چھولے ہوتے تھے۔ بند درمیان سے کاٹ کر اس میں ابلے ہوئے چھولے ڈال دیتا تھا۔ مرچ مصالحہ جات کے ساتھ

8۔ الحمدللہ فیل کبھی نہیں ہوئے۔ پڑھائی کے معاملے میں امی بہت سخت تھیں خود پڑھاتی بھی تھیں

9۔ پانچویں کلاس میں کتنے نمبر آئے تھے یاد نہیں

10۔ پانچویں کلاس کی رپورٹ یا سرٹیفکیٹ موجود نہیں۔ صرف میٹرک کا ہے

11۔ غیر نصابی سرگرمیاں پرائمری سکول میں تو نہیں ہوتی تھیں

12۔ ہمارے جاننے والوں کی دو بچیاں بھی اسی سکول میں تھیں۔ ان سے کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی ہے۔ باقی کسی سے نہیں۔ یاد بھی نہیں

13۔ ہمارا سکول خالص اردو میڈیم پیلا سکول تھا۔ صرف لڑکیاں پڑھتی تھیں کو ایجوکیشن نہیں تھی اور چھٹی کلاس میں انگریزی کی اے بی سی ڈی سکھائی جاتی تھی

14۔ پرائمری سکول چھوٹا سا تھا جس میں کوئی پلے گراونڈ تھا نہ رفع حاجت کے لیے کوئی بیت الخلا۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کتنی مشکل صورتحال ہوگی۔ اکثر بچیوں سے کنٹرول نہیں ہو پاتا تھا اور کپڑے خراب ہو جاتے تھے۔ پھر اسی طرح گھر جاتی تھیں شرمندگی الگ اور مسئلہ الگ

ہمارے ملک میں بیت الخلا کے معاملات بہت ناگفتہ بہ ہیں

15۔ تیسری کلاس تک تو ٹاٹ پر بیٹھتے تھے پھر چوتھی پانچویں میں کچھ عزت افزائی ہو جاتی تھی تو ٹوٹا پھوٹا فرنیچر نصیب ہوتا تھا

16۔ ہاں تختی لکھی ہے اس پر ملتانی مٹی بھی لگاتے تھے اور سکول لے کر جاتے تھے

گورنمنٹ پرائمری اسکول کی یادوں میں ایک بہت اہم یاد پہاڑے تھے جو بچوں سے چھٹی کے وقت با آواز بلند رٹوائے جاتے تھے پہاڑے یاد نہ ہونے کی صورت میں پٹائی ہوتی تھی

## استاد پریم چند کا سبق۔ ”ہندو مسلم عیسائی سب برابر ہیں“

### الطاف احمد۔ بی کام، ایم اے اُردو، ایم اے پولیٹیکل سائنس۔ کراچی

میں نے پرائمری تعلیم ریلوے اسکول میرپور خاص میں حاصل کی۔ عمدہ معیار تھا۔ اردو انگریزی سندھی تاریخ جغرافیہ پڑھائی جاتی تھی۔ جب اساتذہ سزا دیتے تھے۔ پڑھائی پر بہت توجہ تھی افسر دورہ کرتے تھے کھیل اور تفریح کے مواقع میسر تھے۔ استاد محنتی اور فرض شناس تھے بلگرامی صاحب اچھے لائق ہیڈ ماسٹر تھے رئیس صاحب تاج الدین عزیز صاحب اعلی استاد تھے ریاضی کے استاد پریم چند کا سبق آج تک یاد ہے۔ انسانیت۔ عظیم ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی۔ سب عام انسان ہیں کوئی کمتر نہیں۔ انیس سو ساٹھ کا سبق اب تک چل رہا ہے میں ترقی پسند انقلابی ہوں اور رہونگا

## ٹھیلوں پر چنا چاٹ۔ لال بادام۔ املی کٹارے اور نہ جانے کیا کیا

### انجم عثمان۔ سینئر شاعرہ کراچی

اس وقت کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر ہی میں والدہ سے حاصل کی۔

اس کے بعد پہلی جماعت میں انگلش میڈیم سکول میں انیس سو اٹھاون میں داخلہ حاصل کیا۔

ہمارے مضامین میں اردو ،انگریزی ، میتھس ( حساب ) ،جیوگرافی ، ہسٹری ،سائنس ( کیمسٹری ،فزکس ،بائیولوجی ) ، اسلامیات اور سوشل سٹڈیز شامل تھے

اساتذہ نہ ڈانٹتے تھے اور نہ ہی مارتے تھے۔۔۔۔ کسی بھی خلافِ قاعدہ بات پر سٹاف روم میں بلا کر سمجھا دیا کرتے تھے

گھر سے والدہ صاحبہ کوئی بھی پسندیدہ چیز تیار کر کے لنچ باکس میں دے دیا کرتی تھیں۔ بعض اوقات کسی بھی وجہ سے اگر یہ ممکن نہیں ہو پاتا تھا تو اس صورت میں ہمیں پیسے ملتے تھے تاکہ لنچ بریک میں کینٹین سے کچھ خرید کر کھالیں

نہیں الحمدللہ فیل کبھی نہیں ہوئے۔۔۔۔ بلکہ اگر کبھی فرسٹ کے بجائے سیکنڈ یا تھرڈ پوزیشن آجاتی تھی تو والد صاحب رپورٹ کارڈ پر دستخط کرنے سے پہلے اس گراوٹ کا سبب ضرور پوچھتے تھے کہ کیا کسی مضمون میں ہمیں دشواری پیش آرہی ہے جو پوزیشن میں کمی کا سبب بنی ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔

میٹرک کے بعد تو سنبھال کر رکھے ہیں لیکن اس سے پہلے کا ریکارڈ بوجوہ موجود نہیں ہے

جی۔۔۔ ایک ہم جماعت ، ناہید صدیقی جو بعد میں مشہور و معروف کلاسیکی ڈانسر بنیں ، وہ یاد ہیں لیکن رابطہ نہیں ہے

انگلش میڈیم سکول تھا (اب بھی قائم ہے)

سکول کی نہ صرف یہ کہ بلڈنگ بڑی تھی ( ہے ) بلکہ اس میں کافی کشادہ پلے گراونڈ بھی موجود تھا اور ہفتے میں ایک پیریڈ پی ٹی کا اور ایک پیریڈ گیمز کا بھی ہوتا تھا۔

فرنیچر موجود تھا اور کمرے بھی کشادہ ، روشن اور ہوادار تھے

نہیں اب قاعدے یا کتابیں یاد نہیں ہیں

یونیفارم لڑکیوں کی نیلی چیک کی فراک ،سفید شلوار اور سفید دوپٹہ جو v shape میں پہنا جاتا تھا۔

لڑکوں کی نیلی پینٹ اور سفید شرٹ ہوتی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں ، دونوں کی جیب پر سکول کا مونوگرام کڑھا ہوا ہوتا تھا

سکول کے آس پاس بہت سے ٹھیلے والے کھڑے ہوتے تھے جنہیں اکثر سکول کی انتظامیہ ہٹاتی رہتی تھی لیکن ایک آدھ دن کے بعد وہ دوبارہ اپنا ٹھیلہ لگا لیتے تھے ، جبکہ سکول کی اپنی صاف ستھری کینٹین موجود تھی۔ ان ٹھیلوں پر چنا چاٹ ، لال بادام ، املی کٹارے ، گنڈا گولا ، قلفی ، سنگترے کی گولیاں اور مختلف قسم کی ٹافیاں ، ہرے امرود اور خدا جانے کیا کیا الا بلا ملتی تھی۔۔۔۔ سچ پوچھئے تو ہم بچوں کو گھر کے لنچ یا کینٹین کے کھانے سے کہیں زیادہ یہ ٹھیلے پر ملنے والی اشیاء پسند تھیں!

یہ تو یاد نہیں کہ پانچویں کلاس میں کتنے نمبر آئے تھے لیکن چونکہ پڑھائی میں اچھے تھے اس لئے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ نمبر بہت اچھے ہی آئے ہوں گے

جی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی خاصے سرگرم رہے۔ گیمز میں بیس بال پسندیدہ کھیل رہا۔ ریس میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ ریسز بھی بہت مختلف قسم کی ہوتی تھیں جس میں ایک sack race بھی ہوا کرتی تھی ، جس میں ہمیں دونوں پاؤں ایک بوری میں رکھ کر hop کرتے ہوئے ریس لگانا پڑتی تھی۔

اس کے علاوہ بیت بازی میں بھی بہت حصہ لیا۔ اس وقت حروفِ تہجی کے حساب سے بے شمار اشعار ازبر تھے اور اکثر جیت ہماری ٹیم کے حصے میں ہی آتی تھی۔

جی ہاں۔۔۔۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ تختی لکھنے سے تحریر خوش خط ہو جاتی ہے۔ تختی کو پہلے ملتانی مٹی سے لیپ دیا جاتا تھا۔ پھر اسے خشک ہونے کے لئے رکھ دیا جاتا تھا۔ پھر سرکنڈے کا ایک قلم ، جس کی نوک خود تراشنا پڑتی تھی ، اسے روشنائی میں ڈبو کر تختی پر پہلے حروفِ تہجی۔۔۔۔ اور پھر اردو کی نصابی کتاب سے کوئی تحریر لکھوائی جاتی تھی۔

## ان دنوں ٹیوشن مفت پڑھائی جاتی تھی

### تنویر شہزاد۔ نمائندہ جرمن ریڈیو، ریذیڈنٹ ایڈیٹر 'اطراف' لاہور

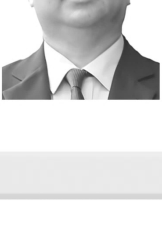

یہ وہ دور تھا جس میں بغیر پیسوں کے ٹیوشن پڑھائی جاتی تھی۔ اور تعلیم صرف نصاب تک محدود نہ تھی۔ میں بزم ادب کا صدر تھا۔ سکاوٹس کا پٹرول لیڈر تھا۔ بیڈمنٹن ٹیم کا رکن تھا اور سکول کی کئی سوسائیٹیوں میں کام کرتا تھا۔ اور میں نے وظیفے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ لیکن ہمارے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اب میری بیٹی کے صرف ایک سمسٹر کی فیس 6 لاکھ ہے اسے غیر نصابی سرگرمیاں تو کیا نصابی سہولتیں بھی پوری نہیں مل رہی ہیں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ شکر ادا کرنے کی تو بہت سی چیزیں ہیں لیکن کیا یہ اعزاز بھی تو کوئی کم نہیں کہ بچپن کی تعلیم اس

علاقے میں ملی جہاں گنگا رام اور گرونانک جیسے لوگ بھی رہے تھے۔

## اسکول میں کینٹین تھی۔ باہر کچھ نہیں ملتا تھا

### منزہ سہام مرزا۔ مدیر دوشیزہ سچی کہانیاں۔ کراچی

1 کنڈر گارٹن پلے ہاؤس سے۔ یہ جرمن مینجمنٹ اور اساتذہ پر مشتمل اسکول تھا پھر کے جی ون سے پانچویں تک پی اے ایف شارع فیصل کراچی سے تعلیم حاصل کی یہ پاکستان ایئرفورس کا اسکول تھا اور اب بھی ہے۔ سن 78-77 ہوگا۔

2 انگلش سائنس۔ اردو۔ اسلامیات۔ سوشل اسٹڈیز۔ آرٹس اور میوزک۔

3 مجھے اردو انگلش پوئٹری اور اسلامیات کی کتابیں اور کچھ اسباق بھی تصویروں کے ساتھ یاد ہیں۔

4 اساتذہ ڈانٹتے تھے کرسی پر کھڑا بھی کرتے تھے اور بریک بند کردیا کرتے تھے مگر مارتے نہیں تھے۔

5 نرسری میں تو یونیفارم نہیں تھی کلاس ون سے ففتھ تک سفید بلاوز اور گرے اسکرٹ تھا۔

6 صبح اسکول جاتے وقت امی بستے میں لنچ بکس رکھتی تھیں اور ساتھ پانی کی بوتل دیتی تھیں۔

7 اسکول میں کینٹین تھی باہر کچھ نہیں ملتا تھا۔

8 ساتویں جماعت میں فیل ہوئی تھی حساب کے مضمون میں۔

9 بمشکل ہی پاس ہوئی تھی حساب میں بہت کمزور تھی اس لئے

10 میٹرک کی مارک شیٹ سنبھال کر رکھی ہے۔

11 تقریباً تمام مگر بیس بال اور اسپرنٹ ریس میں بہت زیادہ۔

12 صرف ایک دوست سے رابطہ ہے جو کلاس 2 کا ساتھی تھا۔

13 انگلش میڈیم۔

14 اسکول کئی بلڈنگز پر مشتمل تھا اور اس میں 3 بہت بڑے پلے گراونڈ تھے۔

15 لوہے کا فرنیچر کرسی اور میز۔

16 جی نہیں تختی نہیں لکھی۔

## دوسری تیسری جماعت میں تختی اور ایک سے تیرہ تک پہاڑے

### آفتاب میمن۔ سابق سیکریٹری حکومت سندھ

1( پرائمری تعلیم زیادہ تر اپنی جنم بھومی ڈیپلو ضلع تھرپارکر اور درمیان میں کچھ عرصہ کے لئے جیمس آباد جو اب کوٹ غلام محمد کے نام سے مشرف بہ اسلام ہے، میرپور خاص اور عمرکوٹ میں ہوئی۔

(2-3) پہلی میں صرف حروف تہجی اور وہ بھی تختی پہ لکھوائے جاتے تھے۔ دوسری اور تیسری جماعت میں تختی کے ساتھ ساتھ ایک سے تیرہ تک پہاڑے۔ تیسری جماعت میں صرف ایک کتاب جو دین، تواریخ، علاقوں کی جغرافیہ اور پاکستان کے متعلق کچھ معلومات جس میں رسول اکرم ﷺ، جناح صاحب کے متعلق اسباق تھے۔ کلاس چہارم میں زبانی پہاڑے، ضرب تقسیم، جمع تفریق ذرا ایڈوانسڈ تھی جیسے اڑھائی کو پونے تین سے تقسیم یا 230 میں سے 683 تفریق۔ ضلع کی سطح پہ ایک مقابلہ کا امتحان ہوتا تھا جس میں کچھ اسکالرشپس ہوتے تھے۔

(4 ڈانٹتے بھی تھے اور ہاتھ پر سونٹی سے مارتے تھے۔

(5 کوئی لازمی یونیفارم نہیں تھی۔ صرف صفائی لازم تھی۔

(6 ایک بجے چھٹی میں لنچ کا کوئی تصور نہیں تھا۔

(7 کچھ بھی نہیں۔ صاف ستھرے پانی سے بھرے مٹکے سکول میں تین جگہ رکھے یاد آتے ہیں۔

(8 نہیں

(9 کلاس چہارم کے بعد پانچویں ہمیں یاد نہیں پڑتی۔ فرسٹ سٹینڈرڈ میں گئے تھے ہائے سکول میں۔

(10 میٹرک کے بعد کی۔

(11 جی ہاں۔

( 12 جی ہاں۔ ڈیپلو کے سب یاد ہیں۔ میرپور خاص کے کچھ اور ایک عمرکوٹ کا۔ کچھ سے رابطہ ہے۔

13) سندھی میڈیم۔

(14 خاصی بڑی بلڈنگ تھی۔ دس کمرے تھے جو سو سال پہلے اپنی مدد آپ کے تحت بنائے گئے تھے۔

15) بینچ تھے۔

(16 تختی لکھتے تھے۔ ملتانی مٹی، سرکنڈے کے قلم اور ہاتھ سے بنی روشنائی۔ سب یاد ہیں۔

## ہمارے استاد مسیح الدین صہبا بیت بازی کے مقابلے کرواتے تھے۔

### مقبول خان۔ سینئر صحافی کراچی

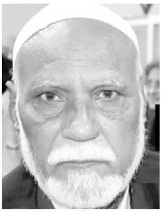

بچپن کی وادیوں میں جھانکنے پر کئی مناظر ذہن کے پردے پر چلنے لگتے ہیں، جن میں ایک تعلیمی منظر بھی ہے، جس پر ہماری توجہ مرکوز ہو جاتی ہے۔ جب ہم بچپن کے اس تعلیمی منظر کو اپنے حافظے کی مدد سے یکجا کرتے ہیں، تو ایک دستاویزی فلم ہمارے ذہن کے پردے پر چلنا شروع ہوتی ہے۔ اس کے پہلے ہی منظر میں جٹ لائن کی ایک جھونپڑی میں رہنے والا 6 سالہ لڑکا خود کو گورنمنٹ بوائز پرائمری اسکول ایک کلاس میں بچھی ہوئی دریوں پر بیٹھا ہوا پاتا ہے۔ جٹ لائن کا یہ پرائمری اسکول اب بھی واقع ہے، جو مندرا اسکول کے نام سے مشہور ہے۔ اس پرائمری اسکول میں ان دنوں پہلی جماعت میں داخلے کی صرف دو شرطیں تھیں۔ پہلی شرط اردو کے حرف تہجی کی پہچان ، دوسری یہ کہ طالب علم کا دایاں ہاتھ ، سر کے اوپر سے بائیں کان تک پہنچ جائے۔ میں اس ٹیسٹ میں کامیاب قرار پایا۔ اور اس طرح پہلی جماعت میں ہمارا داخلہ ہوگیا۔ والد نے براؤن رنگ کے موٹے کپڑے کا بستہ ، سلیم عبداللہ کا تصنیف کردہ الف سے انار، ب سے بلی والا قاعدہ۔ ایک تختی، ایک سلیٹ ، ایک پیکٹ خشک سیاہی کا پاؤڈر اور دو سرکنڈے کے قلم خریدے، ایک چھوٹی بوتل میں ڈال کر پانی کی مدد سے سیاہی تیار کی گئی۔ والد مرحوم کے مطابق یہ تمام چیزیں چھ روپے میں خریدی گئی تھیں۔ یہاں اسکول یونیفارم نہیں تھا۔

مندرا اسکول میں پہلی جماعت پاس کرنے کے بعد والدہ کے ایک کزن جو پی اے ایف میں ملازم تھے۔ ان کے توسط سے محمود آباد میں 120 گز کا ایک پلاٹ 45 روپے میں خرید لیا۔ یہ 1956 کا ذکر ہے۔ ان دنوں محمود آباد دنیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اس سے ملحقہ ایک ریتیلا وسیع میدان تھا۔ جہاں اب پی ای سی ایچ ایس بلاک 6 واقع ہے۔ یہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ دو کلومیٹر کے فاصلے پر المونیم کوارٹرز جسے سلور کوارٹر کالونی بھی کہتے تھے، اس کے ساتھ ایک پرائمری اسکول تھا جو اب بھی موجود ہے۔ یہ علاقہ موجودہ شارع فیصل کے دائیں ہاتھ پر واقع ہے۔ سلور کالونی کے اختتام پر سڑک کے اس پار اے بی سینیا لائن ، ٹنو شیا لائن اور جٹ لائن وغیرہ واقع ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہوگا کہ یہ سلور کوارٹر پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے ایک

حکم پر 1949 کے اواخر میں بنائے گئے تھے، جس میں درجہ سوم اور درجہ چہارم کے ان سرکاری ملازمین کو آباد کیا گیا تھا ، جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے کراچی آئے تھے۔سلور کوارٹرز کو 1964 کے اوائل میں مسمار کر دیا گیا،ان کو نیو کراچی میں تعمیر کئے گئے کوارٹرز میں منتقل کر دیا گیا۔اس زمین پر اب دفتر وزارت خارجہ اور ایف ٹی سی عمارتیں قائم ہیں۔

اس اسکول میں ہمیں دوسری جماعت میں داخلہ مل گیا۔ یہاں لکڑی کے ڈیسک اور بینچوں پر بیٹھتے تھے۔اس اسکول میں سب سے زیادہ طالب علم سلور کالونی ہی کے تھے۔جبکہ اے بی سینیا لائن، اس سے ملحق کچی آبادی جو اب مسلم کالونی کے نام سے پہچانی جاتی تھی اور محمود آباد کے بچے بھی زیر تعلیم تھے۔اس اسکول میں نیلی پتلون اور سفید قمیض ، باٹا کے سفید کپڑے کے جوتے ہمارا یونیفارم تھا۔اس اسکول میں ہم نے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ پی ٹی سی ایل اسٹاف یونین کے سابق صدر حاجی صابر حسین ہمارے ہم جماعت تھے۔ یہ سلور کالونی ہی میں رہا کرتے تھے۔ہمارے اس پرائمری اسکول کی چوتھی جماعت میں ٹی وی اداکار انتظار حسین مرحوم، ان کے بڑے بھائی افتخار حسین لڈن پانچویں کلاس میں تھے۔جبکہ مزاحیہ اداکار شرافت علی مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی لطافت علی (مصور) بھی پانچویں کلاس میں تھے۔انتظار اور افتخار کے سب سے چھوٹے بھائی اخلاق حسین (سابق انکم ٹیکس افسر) تیسری کلاس کے طالب علم تھے۔یہ تمام طالب علم ہماری ثانوی کلاسوں کی مادر علمی گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر ٹو پی ای سی ایچ ایس میں بھی ساتھ رہے تھے۔ پرائمری اسکول میں جب ہم دوسری جماعت میں تھے۔تو خشک دودھ پانی میں گھول کر سب طالب علموں کو پلایا جاتا تھا۔ (واضح رہے کہ یہ دودھ پاکستان کے بچوں کے لئے امریکا سے بطور امداد ملا تھا) طالب علموں کو امریکی دودھ پلانے کا سلسلہ شاید ایک ماہ تک جاری رہا۔

اپنے حافظہ کی مدد سے جب پرائمری اسکول کے اساتذہ کو اپنے ذہن کی اسکرین پر لاتا ہوں تو دوسری جماعت میں ہمارے استاد مطیع اللہ صاحب تھے۔جو بہت اچھی تصاویر بھی بناتے تھے۔ انہوں نے اپنی بنائی ہوئی کچھ تصاویر بھی کلاس روم میں آویزاں کر رکھی تھیں۔تیسری جماعت میں ہمارے استاد جناب حمزہ تھے۔جبکہ چوتھی جماعت میں ہمارے استاد محمد علی صاحب تھے۔پانچویں جماعت میں ہمارے استاد مسیح الدین صہبا صاحب تھے۔ان کا تعلق ہمارے آبائی شہر آگرہ سے تھا۔یہ شاعر تھے۔صہبا صاحب ہمارے والد کے شناسا بھی تھے۔کلاس میں شعر موزوں کرنے کے لئے گنگنایا بھی کرتے تھے۔انہوں نے اپنے طالب علموں میں شعری ذوق پیدا کرنے کے لئے بیت بازی سے آشنا کیا۔وہ کلاس کے چار چار طالب علموں کے دو گروپ بنوا کر ان کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ بھی کراتے تھے، جیتنے والے گروپ کو وہ چار آنے انعام بھی دیا کرتے تھے۔ہم نے 1959 میں یہاں سے پانچویں جماعت پاس کر کے اپنی پرائمری تعلیم مکمل کی ۔بچپن کی یادیں بلاشبہ ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

## تختی لکھنے کی بدولت خوش خطی نصیب ہوئی

### کرن فرشوری۔کراچی

1 ۔پہلی جماعت میں میرا داخلہ 1962 میں ہوا۔ یہ گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول فیڈرل کیپٹل ایریا تھا جہاں مجھے 5 سال گزارنا تھا۔کیا جوش وجذبہ تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

2۔ پرائمری جماعتوں میں سارے تھے مضامین مثلاً ریاضی۔ اُردو۔ اسلامیات۔ جنرل سائنس۔ معاشرتی علوم سوائے انگلش کے پڑھائے جاتے تھے اور ایک کلاس میں سارے مضامین ایک ہی ٹیچر پڑھاتی تھیں ہر سبجیکٹ کے لیے علیحدہ ٹیچر نہیں ہوتی تھیں۔ انگریزی چھٹی جماعت سے داخلِ تدریس تھی۔اسی لیے اسے اُردو میڈیم اسکول کہا جاتا تھا۔

3۔ پرائمری جماعتوں میں کورس کی کتابیں اور قاعدے آج بھی یاد آتے ہیں۔

4۔ اساتذہ میں عموماً مارنے کا طریقہ رائج نہیں تھا مگر بدتمیز۔ نالائق اور ہوم ورک نہ کر کے آنے والوں کو ڈانٹ ضرور پڑتی تھی۔نظریہ ضرورت کے تحت کبھی کبھی ایسی طالبات کو کلاس میں پیچھے سزا کے طور پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

5۔ ہمارے اسکول کی یونیفارم سفید شلوار۔ دوپٹہ V ) کی شکل میں پٹی نما(اور نیلی فراک تھی۔

6۔ ہماری امی ٹفن میں کھانے کی چیزیں اور تھرماس میں پانی ساتھ دیتی تھیں جو ہم بریک میں کھا لیتے تھے۔

7۔اسکول کے باہر قلفی، چورن، چنے ، مرمرے اور امرود والوں کے ٹھیلے پر براجمان رہتے مگر ہم نے وہاں سے خریداری نہیں کی شاید اس وجہ سے کہ گھر پر لذیذ کھانا ہمارا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔

8۔ الحمدللہ کبھی فیل ہونے کی نوبت نہیں آئی بلکہ زیادہ تر مضامین میں Distinction حاصل کیا۔

9۔ پانچویں کلاس میں 80فی صد مارکس آئے تھے۔گھر والے بھی بہت خوش تھے اسی شام مٹھائی منگوا کر پڑوسیوں میں تقسیم کی گئی۔

10۔ بدقسمتی سے مارکس شیٹ محفوظ نہیں۔شاید وہ حوادثِ زمانہ کا شکار ہوگئی۔

11۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا مثلاً تحریری مقابلے۔تقریری مقابلے۔نعت خوانی اور اسپورٹس وغیرہ۔

12۔ پرائمری کا زمانہ بھی خوبصورت اور یادگار ہوتا ہے کئی سہیلیوں کے نام یاد ہیں مثلاً شہناز۔ رفعت۔قمر اور شاہین سے زیادہ دوستی تھی مگر افسوس اب کسی سے بھی رابطہ نہیں ہے۔

13۔ اُردو میڈیم اسکول تھا اور بہت معیاری تدریس کا نظام ہمیں ملا جن سے ہماری تعلیمی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔اگلی جماعتوں میں کامیابیاں بھی بنیادی مضبوطی کی مرہونِ منت ہوئیں۔

14۔ ڈبل اسٹوری کشادہ بلڈنگ وسیع وعریض پلے گراؤنڈ بھی رکھتی تھی۔

15۔کلاس ون اور ٹو میں دری پر بیٹھے اور تیسری جماعت میں ڈیسک تھے۔طالبات کے لیے۔

16۔ تختی لکھی جس کی بدولت خوش خطی نصیب ہوئی۔ تختی کو روزانہ ملتانی مٹی سے لیپنا اور خاص لکڑی کا قلم اور دوات آج بھی یادوں کی حسین وادی میں پہنچا دیتے ہیں۔

## کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئے۔ ہر سال اوّل پوزیشن

### حرا شبیر۔ہیڈ مسٹریس گورنمنٹ بوائز اسکول۔جامعہ ملیہ کیمپس کراچی

میں نے پرائمری تعلیم ملیر میں واقع ایک نجی پرائمری اسکول پروگریسو گرامر سے حاصل کی۔ 1994ء میں پنجم پاس کی۔ اس وقت اردو، انگریزی، حساب، اسلامیات، معاشرتی علوم، سائنس اور سندھی پڑھائی جاتی تھی۔ ہمارا اسکول انگلش میڈیم تھا لیکن انگریزی کے علاوہ صرف حساب انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا تھا۔ سندھی کے علاوہ باقی تمام مضامین اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابیں ہوا کرتی تھیں اردو میں ایک تھے اپنے بھائی بھلکڑ، جاڑا دھوم مچاتا آیا آج تک یاد ہیں۔ اساتذہ نے مارا کبھی نہیں غلطی پر سرزنش کر دیا کرتے تھے۔سفید شلوار، کتھئی رنگ کی قمیض اور سفید وی ہوا کرتی تھی۔کھانے پینے سے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا لہذا گھر سے کبھی لنچ لے کر نہیں گئے اسکول کے پاس چھولے، چاٹ، گول گپے، گولا گنڈا، پاپڑ کے ٹھیلے روزانہ کی بنیاد پر کھڑے ہوا کرتے تھے جہاں

سے کبھی کبھار ہمجولیوں کے ساتھ کچھ کھا لیا کرتے تھے۔ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئے بلکہ ہر سال اول پوزیشن آیا کرتی تھی اس وقت ہمارے اسکول میں پانچویں جماعت کے بورڈ کے امتحان ہوا کرتے تھے یعنی پنجم جماعت کے طلبہ کسی دوسرے اسکول میں جا کر امتحان دیا کرتے تھے اور اسی اسکول کے اساتذہ پرچوں کی جانچ کر کے نتائج تیار کرنے کے بعد متعلقہ اسکول بھیج دیا کرتے تھے خوش قسمتی سے ہم نے نہ صرف جماعت پنجم میں اول پوزیشن حاصل کی تھی بلکہ پورے اسکول میں سب زیادہ نمبر حاصل کرنے والے خوش نصیب بھی ہم ہی تھے جس وقت نتائج کا اعلان ہوا ہماری خوشی دیدنی تھی وہ لمحہ آج بھی یاد ہے آپ کے سوال پر کہ مارکس شیٹ سنبھال کر رکھی ہے اپنے تمام کاغذات نکال کر دیکھے لیکن پنجم کا سرٹیفکیٹ نہیں ملا (شاید امی کے گھر سنبھال کر رکھا ہوا ہو۔)

غیر نصابی سرگرمیوں میں ہماری شمولیت لازمی تھی کھیلوں میں کچھ خاص حصہ نہیں لیتے تھے لیکن کوئز پروگرام ہو، بیت بازی، نعت خوانی یا کچھ لکھنا ہو ہماری شرکت لازم تھی۔ ہمارے اسکول میں یہ تمام سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں تک ہم جماعتوں کی بات ہے چند ناموں سے بھی یاد ہیں لیکن رابطہ کسی سے بھی نہیں۔ اسکول کی عمارت بہت بڑی نہیں تھی نہ ہی کوئی پلے گراونڈ موجود تھا۔ گلی میں دو منزلہ عمارت تھی جس کے اوپر کھلی چھت تھی جہاں اسمبلی ہوا کرتی تھی بریک میں سب بچے گلی میں نکل کر کھیل لیا کرتے تھے اس وقت ماحول کچھ اور تھا۔ اسکول میں فرنیچر موجود تھا ہر کلاس میں طلبہ ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ اسکول میں تختی نہیں لکھی لیکن گھر میں لکھی ہے۔

## چوتھی جماعت میں اسکول کی طرف سے سفید پینٹ اور سفید قمیص بطور یونیفارم ملی

**رمضان بلوچ مصنف 'ایک لاپتہ شہر کا سراغ'، کراچی**

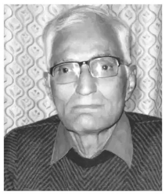

(1 ہماری ابتدائی تعلیم کا آغاز ابراہام ملر پرائمری اسکول ڈی ڈی چودھری روڈ بغدادی لیاری کراچی سے 1951 میں ہوا جو 1954 میں اختتام پذیر ہوا کیونکہ پرائمری تعلیم کی مدت اس دور میں چوتھی جماعت تک ہی تھی۔

(3 & 2 جہاں تک ہماری یادداشت ہے پہلی جماعت میں صرف اردو زبان میں ایک قاعدہ ہمیں پڑھایا جاتا تھا جو اسکول کی طرف سے ہمیں مہیا کیا جاتا تھا۔ دوسری جماعت میں اسی قاعدے سے ہم تختی پر بانس میں سے تراشے ہوئے قلم سے لکھائی کی مشق کرتے تھے۔ تیسری جماعت میں آسان حساب کی ایک کتاب مہیا کی گئی اور تختی ہی پر آسان تفریق وجمع وضرب کی مشق بھی کرائی جاتی رہی۔ چوتھی جماعت میں اردو اور حساب کی الگ الگ کتابوں کے ساتھ کاپیاں (نوٹ بکس) بھی فراہم کی گئیں اور اسی جماعت میں ہمارا تعارف فاؤنٹین پین (غالباً ایگل) بمعہ بلیو سیاہی سے ہوا جس کی وجہ سے انگلیاں نیلی نیلی ہوجاتی تھیں۔ پرائمری تعلیم کے اختتام پر چوتھی جماعت کے امتحانات کراچی تعلیمی بورڈ کے زیر اہتمام لئے جاتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کینڈرل سیکنڈری اسکول ککری گراؤنڈ ہمارا امتحانی مرکز تھا۔

(4 جی نہیں۔ پرائمری کے استاد ہمیں ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے تھے۔ وہ محنتی اور بہت شفیق استاد تھے۔

(5 جہاں تک مجھے یاد ہے تیسری جماعت تک کوئی یونیفارم نہیں تھا۔ البتہ چوتھی جماعت میں ہمیں اسکول کی طرف سے سفید پینٹ اور سفید قمیص یونیفارم کے طور پر مہیا کی گئیں۔

(6 میرا خیال ہے لنچ تک ہم اپنے گھر پہنچ جاتے تھے کیونکہ اسکول ٹائم صبح ساڑھے سات بجے شروع ہو جاتا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہمیں اسکول میں میٹھی ڈبل روٹی (بہت لذیذ) فراہم کی جاتی تھی۔

(7 اسکول گیٹ سے باہر دو خواتین ٹافی چاکلیٹ وغیرہ بیچتی تھیں۔ ایک ٹھیلے والا بھی تھا جو چھوٹی سی ڈبل روٹی تلی چٹنی میں ڈبو کر بیچتا تھا لیکن وہ ہمارے لئے مہنگا" پڑتا تھا۔ جب ہم چوتھی جماعت میں پہنچے تب کہیں جا کر روٹی چٹنی کے مزے لوٹنا افورڈ کر سکتے تھے کیونکہ پڑھائی میں ہماری (کچھ کچھ اچھی) کارکردگی کی بناء پر ہماری پاکٹ منی میں چند پیسوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

(8 جی نہیں۔ پرائمری اسٹیج میں نسبتاً ہماری تعلیمی کارکردگی بہت بہتر تھی اسی لئے ہر سال پاس ہوتے رہے۔

(9 پانچویں کلاس میں تو ہم ایس ایم لیاری سیکنڈری اسکول پہنچ گئے تھے جہاں پہلی مرتبہ انگریزی زبان کے ''اے۔ بی۔ سی'' سے ہمارا واسطہ پڑا۔

(10 بدقسمتی سے پرائمری اسکول کا کوئی ریکارڈ ہم محفوظ نہ رکھ سکے۔

(11 کوئی خاص غیر نصابی سرگرمیاں تو نہیں ہوتی تھیں البتہ سالانہ اسپورٹس ڈے ضرور منایا جاتا تھا جب اسکول کے سامنے کھلی زمین پر مختلف جماعتوں کے طلبا کے درمیان دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے۔ جب چوتھی جماعت میں تھے تو ایک دن استاد حشمت علی صاحب ہمیں دو گھوڑا گاڑیوں میں صدر کی سیر کرانے لے گئے اور پھر واپسی میں گروپ فوٹو بھی بنوایا۔

(12 پرائمری کے کچھ ہم جماعتوں کے نام یاد ہیں لیکن بیشتر یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں۔ اس زمانے کے دو دوست خالق رحمانی اور یعقوب عباسی حیات ہیں لیکن ہماری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ ان دونوں سے ابھی تک رابطہ برقرار ہے۔

(13 اردو میڈیم۔

(14 ہمارا اسکول اتنا بڑا نہیں تھا۔ یہ پیلے رنگ کی تین منزلہ عمارت تھی۔ باقاعدہ گراؤنڈ تو نہیں تھا لیکن عمارت کے باہر وسیع خالی زمین تھی جہاں ہر صبح کلاس شروع ہونے سے پہلے اسمبلی ہوتی تھی۔ سال میں ایک دو بار اسکول کی تقریب بھی یہاں منعقد کی جاتی تھی۔

(15 ڈیسک نما بنچ پر ہم بیٹھتے تھے۔

(16 جی ہاں۔ تختی لکھی تھی۔

## ہماری امی نے ابتدائی تعلیم عربی قاعدہ۔ قرآن پاک ناظرہ پڑھا کر پھر دوسری جماعت میں داخل کروا دیا

**جویریہ یاسمین۔ پرنسپل میرپور سائنس کالج برائے طالبات۔ میرپور آزاد کشمیر**

پرائمری تعلیم کے بارے میں سوال نامہ ملا۔ موضوع دلچسپ تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہماری پرائمری تعلیم کا سلسلہ ہے لہٰذا سوچا کہ ضرور قلمبند کرنا چاہیے۔

ہم آٹھ بہن بھائی تھے چار بہنیں اور چار بھائی۔ امی جان نے ہم سب کو ابتدائی تعلیم گھر پر خود ہی دی جس میں اُردو اور انگریزی پڑھنا ابتدائی ریاضی کے اصول، سائنس کی مروج کتب اور اسلامیات کی مبادیات شامل ہیں۔ اُردو لکھائی کے لیے بطور خاص امی جان نے کارڈز بنا کر رکھے ہوئے تھے جن میں حروف تہجی کی مکمل شکل آدھی شکل اور الفاظ کے توڑ جوڑ لکھے ہوتے تھے جن کی مدد سے انہوں نے ہمیں اُردو لکھنا سکھایا۔ اس

# میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

کے علاوہ وہ میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور مضامین زبانی سنا کر ہمیں اُردو اور انگلش میں لکھنے کے لیے دیتیں جس سے ہمارے لکھنے کی صلاحیت میں بہت نکھار آیا۔ علامہ اقبال کے بیشتر اشعار بھی ہمیں اسی مرحلے پر یاد کروائے گئے۔

ہم سب کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ساڑھے چار سال کی عمر سے ہوا جہاں ہمیں ابتدا میں عربی قاعدہ پڑھایا جاتا جو ہمارے نانا جان مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا۔ اس کے ذریعے ہمیں عربی اعراب رموز واوقات اور قرات کے تمام اصول سکھائے گئے۔ عربی قاعدہ مکمل ہونے کی بعد امی جان ہمیں قرآن پاک شروع کرواتیں اور ساتھ ہی آخری پارے کی تمام چھوٹی سورتیں حفظ بھی کرواتیں۔ عربی قاعدہ مکمل ہونے کے بعد دیگر مضامین کی تدریس اور قرآن پاک کی تعلیم ایک ساتھ شروع ہوجاتی اور تین سال کی عمر تک پہنچتے پر ہم سب قرآن پاک مکمل کر چکے ہوتے تھے اور ہمیں جماعت دوم میں اسکول داخل کرایا جاتا تھا۔ جہاں جہاں ابا جی کی پوسٹنگ ہوتی چھ سال کی عمر کو پہنچنے والا بچہ وہیں کے کسی اسکول میں دوسری جماعت میں داخل کروایا جاتا۔

اسکول انتظامیہ سے امی جان کا کہنا تھا کہ آپ میرے بچے کا ٹیسٹ لے لیں اگر آپ کے معیار پر پورا اترتا ہے تو جماعت دوم میں داخل کرلیں۔

الحمدللہ ہم سب بہن بھائیوں نے امی جان کی محنت کی لاج رکھی اور ہر اسکول کا ٹیسٹ پاس کیا اور جماعت دوم سے اپنی اپنی پرائمری تعلیم کا آغاز کیا۔ جب 1972 میں میری عمر چھ سال ہوئی تو ابا جی کی پوسٹنگ راولاکوٹ کے حسین شہید ڈگری کالج میں ہوگئی اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ پروفیسرز کالونی کے قریب کوئی معیاری پرائمری اسکول نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب راولاکوٹ میں بجلی بھی نہیں تھی۔ لوگ لالٹین اور مٹی کے تیل کے لیمپ استعمال کرتے تھے اور حفظ ماتقدم کے طور پر ابا جی نے پنڈی سے گیس لیمپ بھی خرید کر ساتھ رکھ لیے کہ ان کی روشنی قدرے زیادہ ہوتی تھی۔

معلوم ہوا کہ یہی مسئلہ پروفیسر صاحبان کو بھی درپیش تھا لہٰذا اس مقصد کے لیے حسین شہید ڈگری کالج کے چند کمرے مختص کر دیے گئے تھے جہاں بچوں کے حساب سے فرنیچر رکھا گیا تھا اور پرنسپل صاحب اور پروفیسر صاحبان خود بچوں کو مختلف مضامین پڑھاتے تھے البتہ سالانہ امتحان قریبی سرکاری اسکول میں دلوایا جاتا جہاں سے بچوں کو متعلقہ کلاس کا سرٹیفکیٹ جاری ہو جاتا تھا۔ سو مجھے اور میری بڑی بہن کو جو جماعت چہارم میں تھی اسی اسکول میں داخل کروادیا گیا یوں ہمیں یہ منفرد اعزاز حاصل ہوا کہ ہماری پرائمری تعلیم کا آغاز ڈگری کالج سے ہوا اور ہم نے یہ تعلیم کالج کے فاضل اساتذہ سے حاصل کی جس میں خود میرے والد بھی شامل ہوگئے تھے۔ ادارے میں تعلیم کے علاوہ فرنیچر بھی انتہائی دلکش اور معیاری تھا جو اساتذہ نے اپنی مدد آپ کے تحت جمع کر رکھا تھا ٹاٹ پر تو کبھی نہیں بیٹھے۔

تختی ہم نے نہیں لکھی البتہ گھر میں ایک لکڑی کا تختہ سیاہ ضرور تھا جس پر چاک سے لکھتے تھے ہر پوسٹنگ میں تختہ سیاہ پیکنگ میں سرفہرست ہوتا تھا جو ہر جگہ ہمارے ساتھ رہتا تھا۔

ہاں عربی قاعدے کی تعلیم کے دوران ہمیں کاغذ پر قلم کے ذریعے خوش خطی کی مشق ضرور کروائی گئی۔ ہم خوش خط ہوئے یا نہیں لیکن املا کی غلطی کبھی نہ کی ریاضی کی مشق کے لیے ابتدائی گھریلو تعلیم میں سلیٹ کا استعمال خوب کیا۔

ذریعہ تعلیم ملا جلا تھا۔ ریاضی اور سائنس انگلش میں پڑھائی جاتی تھی باقی مضامین اُردو میں البتہ اُردو کے پیریڈ میں صرف اُردو پر توجہ دی جاتی حتیٰ کہ ہم ہوم ورک کی کاپیوں پر تاریخ بھی اُردو ہندسوں میں لکھتے۔ انگلش میں توجہ صرف انگلش پر ہوتی تھی اور ہوم ورک کی کاپیوں پر تاریخ بھی انگلش میں درج کی جاتی تھی۔ اسلامیات کی ہوم ورک کی کاپیوں پر اسلامی تاریخ اور اسلامی مہینہ درج کیا جاتا تھا۔ یوں یہ بنیادی معلومات ہمیں ابتدا سے ہی فراہم کردی گئیں۔ مضامین میں اُردو انگلش ریاضی سائنس تاریخ جغرافیہ اسلامیات ڈرائنگ اور جیومیٹری شامل تھے۔

یونیفارم لڑکیوں کے لیے سفید فراک اور پاجامہ جبکہ لڑکوں کے لیے سفید شرٹ کے ساتھ گرے پینٹ اور سردیوں میں ڈارک گرین سویٹر۔ اساتذہ ہرگز نہیں ڈانٹتے تھے بلکہ بہت پیار اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ کبھی کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئی بلکہ الحمدللہ ہمیشہ ہر امتحان امتیازی نمبروں اور پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔

گھر قریب تھا لہٰذا لنچ ٹائم گھر پر چلے جاتے تھے کبھی کبھی ابا جی سے فرمائش کر کے کالج کیفے ٹیریا سے بھی سموسے لے کر کھا لیتے تھے۔ بلڈنگ بہت پُرشکوہ اور بڑی تھی جس کے ساتھ بڑے بڑے گراؤنڈ بھی تھے۔ شام کے وقت بچے کالج جمنیزیم میں بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس بھی کھیلتے تھے پروفیسرز کالونی میں رہائش کی وجہ سے یہ گراؤنڈ ہمیں چوبیس گھنٹے کھیلنے کے لیے میسر تھا۔

ہم نصابی سرگرمیوں میں اُردو انگلش میں مضمون نویسی کے مقابلے اور تقریری مقابلے بھی ہوتے تھے خوش الحان بچے نعت اور ملی ترانوں کے مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے لیکن خوش گلو نہ ہونے کے باعث ہم اول الذکر دو مقابلوں میں ہی حصّہ لیتے اور اکثر انعامات بھی حاصل کرتے تھے۔ کالج کی مارننگ اسمبلی میں بچوں کا ایک مخصوص کارنر تھا جہاں کھڑے ہو کر ہم ہر روز اساتذہ کے پُرمغز لیکچرز سن کر دن کا آغاز کرتے۔

کالج کی سطح پر ہونے والی تقریبات میں بھی ہم کالج آڈیٹوریم میں مہمان فنکار ہوتے جہاں ملی ترانے پڑھتے اور مختلف بامقصد ٹیبلوز میں حصہ لیتے۔ یہ ٹیبلوز اکثر اقبال کی بچوں کی شاعری پر مبنی اور مقصدی ہوتے تھے۔

1975 میں ابا جی کی پوسٹنگ گورنمنٹ ڈگری کالج میرپور میں ہوگئی تو مجھے پانچویں جماعت کے آخر میں میرپور آنا پڑا جہاں جنوری اور فروری میں گورنمنٹ ماڈل پرائمری اسکول میں داخلہ لیا اور سالانہ امتحان میں شرکت کی جو مارچ 1975 میں ہوا۔ چونکہ ہم کالج میں پڑھے ہوئے تھے لہٰذا یہاں امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور 89 فیصد نمبر حاصل کیے۔ پرنسپل اور اساتذہ سے خوب داد پائی اور پرنسپل صاحب نے اپنی جیب سے 100 روپے بطور انعام بھی دیا جو کہ اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم تھی راولاکوٹ دوبارہ جانا نہ ہوا لہٰذا وہاں کی کلاس فیلوز میں سے چند ایک کے صرف نام یاد رہ گئے ہیں لیکن میرپور کے اسکول میں پرائمری کے ہم جماعتوں میں سے بیشتر سے ابھی تک بھرپور رابطہ ہے۔

آج میں جو کچھ بھی ہوں ان اساتذہ کی مرہون منت ہوں جنہوں نے ہماری معیاری تعلیم کے ساتھ بہترین تربیت بھی کی۔

ایک دلچسپ بات یہ کہ جس راولاکوٹ سے میری تعلیم کی ابتدا ہوئی وہاں میری سب سے چھوٹی بیٹی کا راولاکوٹ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا اور 2020 میں دوبارہ وہاں جانا ہوا تو میں اپنی بیٹی کو خاص طور پر اپنا پرائمری اسکول یعنی حسین شہید ڈگری کالج دکھانے کے لیے لے کر گئی پرانی بلڈنگ کا زیادہ حصہ زلزلہ 2005 میں تباہ ہوگیا تھا نئی عمارت قائم ہے۔

## ٹاٹ یا دریوں پر بیٹھتے تھے۔ فرنیچر میں صرف استاد کی کرسی

### عبدالرشید۔ کراچی

(1 پرائمری تعلیم گورنمنٹ بوائز آصف اسکول ، گرین ٹاؤن ، شاہ فیصل کراچی سے 1980 تا 1987 چھٹی 6 کلاس تک تعلیم حاصل کی جو کہ اردو میڈیم تھا۔

1988-1986 کے دوران ہونے والے لسانی فسادات کے باعث نقل مکانی کرنا پڑی۔ جس سے تعلیمی سلسلہ متاثر ہوا۔ بعدازاں نئے علاقے (فیڈرل بی ایریا) میں تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔

(3/2 سرکاری (اردو میڈیم) اسکول ہونے کی وجہ سے سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔

(4 اساتذہ انتہائی شفیق اور محنت کرنے والے ملے خصوصاً اردو کے سر تاج محمد ، حساب کی مس تاج (جن کی بعد ازاں باہم شادی ہوگئی تھی) ، سندھی کے سر پریل (جو انتہائی سخت مزاج اور غصہ کے تیز تھے۔ انہوں نے کسی غلطی کی بناء پر ہماری کلاس میں زیر تعلیم اپنے سگے بھانجے کو ڈنڈا مار کر سر پھاڑ دیا تھا)

(5 سرکاری اسکول ہونے کی بناء پر یونیفارم (خاکی / پیلاہٹ مائل کیمل کلر کی شلوار قمیض) ہوتا تھا۔

(6 لنچ میں گھر کے بنے سینڈوچ ، طاہری (سبزی والے چاول ، جو آج کل چائنیز کہلاتے ہیں) (یا پھر پھل دیئے جاتے تھے۔ اگر کچھ نہ ہوتا تو گڑ (شکر) اور دیسی گھی کی چپڑی ہوئی روٹی ملتی تھی۔ ساتھ بطور جیب خرچ ابتدائی کلاسوں میں 50 پیسے اور پھر 1 سے 2 روپے ملتے تھے۔ (جو بہت ہوتے تھے)

(7اسکول کے باہر ٹھیلوں پر بھنی ہوئی مکئی (بھٹے) بھنے ہوئے کالے وسفید چنے، شکر قندی، کٹی ہوئی مصالحہ دار ککڑی وکھیرے ، گولا گنڈا ، کھوئے والی قلفی، نارنجی رنگ کی آئسکریم، دہی بڑے، چنے کی چاٹ، چنے کی بریانی ، پکوڑے، سموسے ، سبزی کے رول یا پھر پھلوں میں بڑے والے بیر، امردو، کیلے وغیرہ ملتے تھے۔

(8پڑھائی میں اتنے اچھے تو نہیں رہے، سہ ماہی وششماہی امتحانوں میں شاید فیل ہوئے۔لیکن سالانہ امتحان میں کبھی فیل نہیں ہوئے۔

(9اسوقت پانچویں کا امتحان بورڈ کا ہوتا تھا۔۔انتہائی سختی ہوتی تھی اور پاس کرنا مشکل ہوتا تھا۔۔ پاس ہوگئے تھے۔۔نمبر یاد نہیں تھے۔

(10جی تاحال ریکارڈ موجود ہے۔

(11 کچھ خاص یاد نہیں شاید ایک بار دوڑ میں اور میوزیکل چیئر کے گیم میں حصہ لیا تھا کس کلاس میں یہ یاد نہیں۔

(12نام تو یاد ہیں ، لیکن نقل مکانی کے بعد رابطہ نہ ہوسکا۔

(13اس زمانے میں سرکاری اسکول (اردو میڈیم) ہی ہوتے تھے۔۔ پرائیویٹ (انگلش میڈیم) اسکول شاذ ونادر ہی ہوتے تھے۔

(14اسکول بہت کھلا اور وسیع تھا۔۔ دونوں اطراف کلاس رومز اور درمیان میں میدان جو صبح اسمبلی پریڈ کے لئے، بریک میں کھیل کود اور خصوصی مواقع پر تقاریب کے لئے بطور پنڈال استعمال ہوتا تھا۔

(15اس زمانے میں ڈیسک ایک عیاشی تھی۔۔ٹاٹ یا دریوں پر بیٹھتے تھے۔۔اور اگر بچے زیادہ ہوں تو فرش پر ہی بیٹھنا پڑتا تھا۔فرنیچر کے نام پر صرف ٹیچر کی کرسی ہی ہوتی تھی۔

(16ہمارے دور میں شہروں میں تختی کی جگہ سلیٹ نے لے لی تھی۔۔ چاک سے لکھا جاتا تھا اور ایک دوسرے کو نشانہ مارنے کے کام بھی آتی تھی۔

## ٹاٹ کرسی کچھ نہیں ننگے فرش پر بیٹھتے تھے

### فخر عالم قریشی۔صحافی۔تھک بابوسر۔گلگت بلتستان

گلگت بلتستان کے ضلع دیامر کا ایک خوبصورت گاؤں، تھک بابوسر، جہاں ماضی میں تعلیمی سہولتوں کا فقدان تھا، میں میری ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔سنہ 2002 میں، جب میں تین سال کا تھا، مجھے والدین نے تھک کوٹ کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا تھا۔اس وقت ہمارے نصاب میں قاعدہ کلاس کے لیے ایک اردو کتاب شامل تھی، جبکہ انگریزی میں اے بی سی اور ریاضی میں گنتی سکھائی جاتی تھی۔ یہ پرائمری سکول، جو چلاس کی معروف روحانی شخصیت بابا چلاسی نے کسی این جی او کی مدد سے تعمیر کروایا تھا، بہت سی ابتدائی مشکلات کا سامنا کرتا تھا۔

پرائمری سکول میں، پہلی سے چوتھی کلاس تک اردو میڈیم میں تعلیم دی جاتی تھی۔اس میں اردو، انگریزی، ریاضی، اسلامیات، اور معاشرتی علوم شامل تھے۔صبح اسمبلی کے بعد، سب طلباء کی تختیاں چیک کی جاتی تھیں، پھر کلاسز کا آغاز ہوتا تھا۔ مجھے ہوم ورک میں ہمیشہ سستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اور تختی پر لکھتے وقت اساتذہ کی مار پیٹ سے ڈرتا تھا۔خوش خطی اور کتاب ریڈنگ میں دلچسپی تھی، مگر باقی ہوم ورک میں سست تھا۔

ایک دن، سکول کے پیچھے ایک چھوٹی سی نہر میں حادثاتی طور پر سکول کا حاضری رجسٹر گر گیا۔اس وقت ہمارے استاد، جام وزیر محمد، نے میرے گال پر زوردار تھپڑ مارا اور گریبان پکڑ کر مار پیٹ کی۔اس واقعے کے بعد میں ایک ہفتے تک سکول نہیں گیا۔سکول یونیفارم ملائیشیا کلر کے کالے کپڑے پر مشتمل تھے اور سکول میں لنچ لے جانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ہم صبح سات بجے سکول جاتے اور بارہ بجے واپس آتے تھے۔سکول میرے گھر سے نصف گھنٹے کی پیدل مسافت پر تھا، اور سکول جانے کے لیے ہمیں تقریباً بیس منٹ پہاڑی چڑھنی پڑتی تھی۔

سکول کے آس پاس ایک دکان تھی، جس میں جلیبی اور ویفر بسکٹ ملتے تھے۔ پانچویں کلاس کے لیے، مجھے چلاس منتقل ہونا پڑا، جہاں میں نے چلاس تکیہ سکول میں داخلہ لیا۔چلاس تکیہ سکول میں پانچویں کلاس میں کتنے نمبر آئے یہ تو یاد نہیں، مگر میں پاس ہو گیا تھا۔اس وقت سکول میں غیر نصابی سرگرمیوں کا کوئی تصور نہیں تھا، اور گھر آ کر ہاکی کھیلنا معمول تھا۔

میرے پرائمری سکول کے اکثر ہم جماعت یاد ہیں، اور ان سے وقتاً فوقتاً رابطہ رہتا ہے۔سکول میں ہمیں اردو میڈیم پڑھایا جاتا تھا، جبکہ انگریزی میڈیم کا نام نویں کلاس میں سنا تھا۔سکول کی عمارت ایک بڑے ہال اور ایک کمرے پر مشتمل تھی، جہاں تمام کلاسز کے طلباء کو اکٹھے پڑھایا جاتا تھا۔سکول میں پلے گراؤنڈ نہیں تھا، اور نہ ہی بیٹھنے کے لیے ٹاٹ یا کرسیاں میسر تھیں، ہم ننگے فرش پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

یہ ابتدائی تعلیم کی کہانی، ہماری ماضی کی مشکلات اور محنت کی عکاسی کرتی ہے، اور ہمارے تعلیمی نظام کی ترقی کی جانب ایک قدم مزید آگے بڑھنے کی نشاندہی کرتی ہے۔

## تختی لکھتے تھے۔ملتانی مٹی لگاتے تھے

### محمد حسین۔پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان حیدرآباد

1۔ پرائمری تعلیم کا آغاز 1978 سے ہوا اسکول کا نام رئیس جڑیل پرائمری اسکول تھا جو گھر کے قریب واقع تھا پرائمری 1982 میں پاس کر کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔

2۔ جواب. تمام مضامین پڑھائے جاتے تھے سوائے انگریزی کے. اردو لکھنے اور پڑھنے پر خاصی توجہ ہوتی تھی. صاف ستھری لکھائی کے لئے تختی استعمال کی جاتی تھی. عموماً طلبہ دوسری تیسری کلاس تک پڑھنا اور لکھنا سیکھ جاتے تھے اکثر بچے خوش خط ہوتے تھے.

3۔ ویسے تو تمام کتب اپنے مضمون کے نام ہی سے ہوتی تھیں لیکن پاک قاعدہ اردو پڑھانے کے لئے رائج تھا اسی طرح پاک خوش خطی اور پہاڑے سیکھنے کے لئے قاعدے ہوتے تھے۔

4۔اساتذہ مارتے بھی اور ڈانٹتے بھی تھے۔سزا بھی دیتے تھے. مثلاً، مرغا بنا دینا، کرسی بنا دینا، یا بینچ پر کھڑا کر دیا، یا دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دیا وغیرہ، اس کے علاوہ پنسل دو انگلیوں کے درمیان دبا دینا، وغیرہ. چھڑی یا بید سے بھی پٹائی لگائی جاتی تھی.

5۔ جب اسکول کی ابتدا کی تو سفید شرٹ اور خاکی پتلون بطور یونیفارم استعمال ہوتی تھی. اس کے بعد ملائشیا رنگ کی شلوار قمیص کا استعمال ہونے لگا.

6۔اسکول سے گھر بہت قریب تھا دوپہر کا کھانا گھر پر کھاتے تھے۔

7۔اسکول کے اس پاس بچوں کے کھانے کے لئے ٹافیاں وغیرہ دستیاب تھیں. ٹھیلوں پر دھی بڑے، چھولے، چنے، کھیر، شربت، وغیرہ ملتے تھے .

8۔آج کل تو بچوں کو پرائمری میں فیل نہیں کیا جاتا تھا مگر اس زمانے میں ناقص پڑھائی کرنے والوں کو اگلی کلاس میں نہیں بھیجا جاتا تھا. الحمدللہ پرائمری سے آج تک کبھی بھی فیل نہیں ہوا .

9۔اس وقت نتائج کا اعلان صرف پاس یا فیل کی صورت میں کیا جاتا تھا پانچویں کلاس تک کبھی بھی رزلٹ کارڈ نہیں ملا. اس لیے نمبرز کا علم نہیں .

10۔ مارک شیٹ یا رزلٹ کارڈ نہیں ملتا تھا. البتہ پرائمری پاس سرٹیفکیٹ موجود ہے .

11۔ ہمارے اسکول میں کوئی خاص ہم نصابی سرگرمیاں نہیں ہوتی تھیں. البتہ ہفتے میں ایک دن ایک استاد آتے تھے جو بچوں کو نعت، کلام اقبال، اور ملی نغمے سکھاتے تھے .

12۔ پرائمری کلاس کے اساتذہ یاد ہیں کئی کی شبیہ ذہن میں ہے. طالب علم ساتھی پرائمری کے بعد مختلف ہائی اسکولوں میں چلے گئے. کچھ کے نام اور کچھ کی شبیہیں ذہن میں ہیں .

13۔ ہمارا اسکول اردو میڈیم تھا. انگریزی چھٹی کلاس سے پڑھائی گئ .

14۔ پرائمری اسکول دو منزلہ عمارت پر مشتمل تھا نیچے پانچ کمرے تھے جبکہ دوسری منزل پر چھ کمرے تھے. اس میں کھیل کا میدان نہیں تھا. البتہ اسکول کے سامنے ایک بڑا گراؤنڈ تھا. جس میں بچے بھاگتے دوڑتے تھے. مختلف اشیاء کے ٹھیلے، خوانچے لگتے تھے .

15۔پہلی کلاس سے پانچویں کلاس تک بینچ تھے اسی پر بیٹھتے تھے اور بستہ یا تو گود میں ہوتا تھا یا پھر جگہ میسر ہونے پر برابر میں رکھ لیتے تھے ۔

16۔تختی لکھتے تھے ۔ ملتانی مٹی لگاتے تھے اسکول سے آنے کے بعد یہ کام ضرور کرنا ہوتا تھا۔

(یہ انٹرویو اطراف ؔ کے بیورو چیف پروفیسر شاداب احمد صدیقی نے لیا ہے)

## انگریزی سے واسطہ پہلی بار گیارہویں میں پڑا بہت مشکل ثابت ہوا

### محمد یعقوب، ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن حیدرآباد

میرا نام محمد یعقوب ہے میں سندھ گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر انفارمیشن کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم سے لیکر میٹرکولیشن تک کی تعلیم خالد میموریل ہائی اسکول حیدرآباد سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان 1995 میں پاس کیا، خالد میموریل ہائی اسکول ایک سرکاری اسکول ہے جو تلک چاڑی کے نیچے سینٹ بوناوینچرز اسکول کے سامنے والی گلی میں واقع ہے۔

میٹرکولیشن تعلیم کے دوران میرے پسندیدہ مضامین میں ریاضی، کیمسٹری ، فزکس شامل تھے جبکہ انگریزی ، اردو ،بائیولوجی ،سندھی اسلامیات اور دیگر مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔

آج بھی مجھے اپنی میٹرک کی کتابوں سے بہت سے اسباق یاد ہیں جبکہ اردو کا ایک سبق ''گزرا ہوا زمانہ'' تو بہت اچھے طریقے سے اس وقت سے ذہن نشین ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت کے اساتذہ بہت ہی زیادہ حساس ہوا کرتے تھے وہ نہ صرف ڈانٹتے تھے بلکہ وقت ضرورت اچھی خاصی چھترول بھی کیا کرتے تھے ، جبکہ میرا یہ ماننا ہے کہ بچہ یا تو شوق سے یا ڈر سے پڑھتا ہے لہذا اساتذہ کا بچے کے ساتھ دوستی کا رشتہ ایک ڈھونگ کے علاوہ کچھ نہیں ،

جب ہمیں اسکول میں داخل کرایا گیا تھا تو اس وقت نارنگی رنگ کی قمیض شلوار یونیفارم ہوا کرتی تھی جو دسویں کلاس تک رہی لیکن دسویں کلاس پاس کرنے سے کچھ عرصہ قبل سفید رنگ کی شرٹ اور خاکی رنگ کی پینٹ ہمارا یونیفارم بنا دیا گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کبھی بھی ہم لنچ باکس گھر سے لے کر نہیں گئے بلکہ گھر سے ملنے والی جیب خرچی سے اسکول میں ملنے والے پکوڑے ڈبل روٹی یا حلیم ڈبل روٹی یا اسی طرح کی کچھ اور چیزیں جو اسکول میں ملتی تھی ہم ہاف ٹائم میں کھاتے تھے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ احسان رہا کہ پہلی جماعت سے لے کے ایم فل مکمل کرنے تک کبھی بھی کس کلاس میں ناکامی کا منہ دیکھنا نہیں پڑا۔

یہ بتانا تو بہت مشکل ہے کہ میرے پانچویں میں کتنے نمبر آئے تھے بالکل بھی یاد نہیں، لیکن میرے پانچویں کے یا اس سے پہلے کے تمام رزلٹ ابتک سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں،

صرف اسکول کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرکٹ اور ہاکی ٹیم کھیلی جبکہ میٹرک میں اسکول کی کرکٹ کا کپتان بھی نامزد کر دیا گیا تھا باقی کالج یا یونیورسٹی لائف میں غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا۔

میرے اسکول فیلوز زیادہ تر اب تک رابطے میں ہیں لیکن کچھ دوست اب رابطے میں نہیں ، جو رابطے میں وہ وہ فیلوز ہیں جو حیدرآباد کے مقامی نہیں تھے انکے خاندان ٹرانسفر ہو کر یا کسی اور مقصد کے لیے کچھ عرصہ حیدرآباد میں مقیم ہوئے اور انہوں نے اپنے بچے اسکول میں داخل کرے صرف وہ ہی دوست رابطے میں نہیں جبکہ جو مقامی ہیں وہ ابتک ایک دوسرے کے ساتھ سلام دعا رکھتے ہیں۔

ہمارا اسکول اردو میڈیم تھا پہلی بار انگریزی سے واسطہ گیارہویں جماعت میں پڑا جو کافی مشکل ثابت ہوا۔

ہماری اسکول کی عمارت ایک کشادہ عمارت تھی جبکہ اس میں پلے گراؤنڈ بھی موجود تھا پر وہ باغیچے جیسا نہیں بلکہ سیمنٹ اور بجری سے بنا ایک سخت میدان تھا۔الحمد للہ اسکول میں فرنیچر ٹوٹا پھوٹا سہی لیکن فرنیچر موجود تھا۔جی اسکول میں داخلے سے قبل ٹیوشن سینٹر میں کچھ عرصہ تختی لکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

(یہ انٹرویو اطراف ؔ کے بیورو چیف پروفیسر شاداب احمد صدیقی نے لیا ہے)

## لنچ لے کر نہیں جاتے تھے۔ پیسے ملتے بسکٹ ٹافی خریدتے

### افسانہ نویس، شاعرہ، ڈرامہ نویس شبنم گل حیدرآباد

1.پرائمری تعلیم سیہون ،جوہی اور جامشورو کالونی سے حاصل کی۔

2.سندھی اور ریاضی

3.یاد نہیں ہیں

4.ابتدائی دور میں لڑکوں کے اسکول میں داخلا ملا کیونکہ اس دور میں لڑکیوں کا اسکول نہیں تھا لہذا لڑکوں کو اساتذہ سے پٹتے دیکھا۔

5.ابتدائی دور کی یونیفارم یاد نہیں البتہ جامشورو کالونی میں واقع اسکول لڑکیوں کا تھا اور بلو قمیص اور سفید شلوار تھی۔

6.لنچ نہیں لیکر جاتے تھے البتہ صبح ناشتہ کر کے جاتے تھے۔ پیسے ملتے تھے۔بسکٹ یا ٹافیاں خرید لیتے۔

7.ٹافیاں ،بسکٹ وغیرہ دستیاب تھے۔

8.فیل نہیں ہوئی۔

9.اچھے نمبر تھے۔

10.جی ہاں

11. نہیں

12.والد ڈاکٹر تھے لہذا سال دو سال میں ان کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔تیسری جماعت تک لڑکوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ دوبارہ ان شہروں میں نہیں گئے۔اس لئے ہم جماعت یاد نہیں ہیں۔

13.سندھی میڈیم

14.اسکول کی عمارت مناسب تھی اور کھیل کا میدان تھا۔

15.فرنیچر تھا۔

16.جی بالکل لکھی۔

(یہ انٹرویو اطراف ؔ کے بیورو چیف پروفیسر شاداب احمد صدیقی نے لیا ہے)

## اسکول کی استانیاں اسی طرح یاد ہیں جیسے اپنی خالہ آنٹی

### مصنف، مضمون نگار میر حسین علی امام کراچی

ماہنامہ اطراف کی یہ خوبی ہے کہ یہ ایک کمیونٹی میگزین ہے یعنی سماجی جریدہ۔لوگوں کی تربیت سازی کرتا ہے جس طرح ڈاکٹری کے نصاب میں پانچویں سال میں کمیونٹی میڈیسن پڑھائی جاتی ہے جسے عام زبان میں ہائی جین کہتے ہیں کہ عام لوگوں کو بیماریوں انفیکشن وبا سے بچاؤ اور حفاظت کے ٹیکے پانی ابال کر پینے ابتدائی طبی امداد بتائی جاتی ویسے شام صاحب اطراف کے ذریعے لوگوں کو سماجی شعور آگہی دے رہے ہیں کہ ملک قوم ریاست محلہ شہر ٹاؤن میں مل جل کر اپنے مسائل حل کریں تعلیم صحت روزگار کے لئے جو بھی ادارے شخصیات کام کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی خدمات کو سامنے لاتے ہیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم پرائمری سکول کی تعلیم کے حوالے سے ایک سوالنامہ ترتیب دیا اور اہل علم و دانش کی

## میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

رائے دریافت کی ہے۔۔یہ دراصل اصل مسئلہ کو جانچنے کی ایک کوشش ہے۔ایک بنیادی وجہ معلوم کرنی ہے کہ پچاس سال پہلے یا چالیس سال پہلے کی نسل کو عدم دستیابی وسائل کی کمی نوزائیدہ ملک کے باوجود دو نسلیں پڑھ کر ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کررہی ہیں تو یہ تیسری نسل میرے آپ کے بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں تمام سہولتوں کے باوجود تعلیم میں انحطاط پذیر کیوں ہیں۔۔کیا ہم ہمارے بچوں کے مستقبل سے مطمئن ہیں کیا ہم اپنے تعلیمی نظام سے مطمئن ہیں۔۔۔ہم سے ہماری نسل سے ہم سے پہلے کی نسل سے کیا غلطیاں ہورہی ہیں یا غلطی ہوچکی ہیں کہ تعلیمی ادارے نظام طالب علم معلم سب زوال پذیر مایوس غیر مطمئن ہیں۔۔۔

میں سمجھتا ہوں کہ اطراف سماجی رابطے کی مہم ایک ٹرسٹ فاؤنڈیشن کی طرف گامزن ہے یا سماجی اداروں کی فیڈریشن کی طرف تاکہ مل جل کر سماجی مسائل خصوصی طور پر تعلیم صحت روزگار کے مسائل حل ہوں۔

اب اصل موضوع یعنی پرائمری اسکول کے حوالے سے باتیں کرتے ہیں اور یادیں تازہ کرتے ہیں۔

یہ 1968 کی بات ہے میں پرائمری میں چوتھی جماعت میں داخل ہوا۔اس سے پہلے عموماً گھر کی خواتین اردو حساب انگریزی سیکھا دیتی تھیں۔لڑکیوں کو تو اور بھی دیر سے اسکول میں داخل کیا جاتا تھا اگر اسکول گھر سے پیدل راستے پر ہے تو داخلہ کرا دیتے تھے۔۔۔

الاعظم اسکوائر نئے نئے بنے تھے کراچی میں یہ فلیٹس کی پہلی اسکیم تھی۔اس کے عقب میں شریف آباد واقع تھا۔شریف آباد میں تین اسکول تھے ایک حیدری اسکول عوامی انداز کا اردو میڈیم دوسرا ملت اکادمی یہ بھی اردو میڈیم تیسرا اتاترک انگریزی میڈیم ۔۔۔ہم ساتوں بھائی بہنوں نے اسی اسکول سے پرائمری کیا اور اساتذہ ہیڈ مسٹریس وغیرہ سب فیملی کی طرح ہو گئے۔

اتاترک اسکول کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ہمارے اسکول کی ہیڈ مسٹریس میڈیم ظفر الحسن تھیں۔غالب لائبریری والے۔مرزا ظفر الحسن حیدرآباد دکن میں نشرگاہ حیدرآباد ریڈیو حیدرآباد سے وابستہ رہے جامعہ عثمانیہ کے طالب علم لیڈر تھے کراچی آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ کے سابق طلبا کی تنظیم بنائی تھی کراچی میں بہت مشہور تھے اور سماجی کام کرتے تھے۔بیگم صاحبہ بھی روشن خیال خاتون تھیں۔اپ مصطفی کمال اتاترک سے متاثر تھیں اور جدید علوم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی قائل۔۔

اتاترک بظاہر 120 گز کے عام تین کمروں کے مکان پر مشتمل اسکول تھا۔جس میں ایک کمرے میں دو کلاس دس دس طلباء وطالبات کی بنائی جاتی ہے۔۔۔کراچی میں میرے خیال میں اسی فیصد اسکول 120 گز کے مکانوں میں قائم ہوئے تھے اور ہمارے لئے وہ اسکول آج بھی قابل احترام ہے ہم اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو داخل کرانے جاتے تھے تو اساتذہ آ کر میرے دوسرے بھائی بہنوں والدہ کا دریافت کرتی تھیں میرے معلومات عامہ اور اخبارات میں مضامین کا اور پھر دیگر نئے اساتذہ اور بچوں سے تعارف کراتی تھیں کہ یہ بھی ہمارے اسکول کے طالب علم ہیں۔

اسکول میں اردو انگریزی سائنس حساب معاشرتی علوم اور اسلامیات پڑھائی جاتی تھی۔سائنس اور میتھ انگریزی میں تھے۔باقی سب اردو میں۔مجھے چوتھی جماعت تک اردو اچھی طرح پڑھنی نہیں آئی میری اردو کی ٹیچر مس احمد نے میری والدہ سے کہا اسے اردو سکھائیں۔۔میرے پڑوس میں بدر آنٹی رہتی تھیں امی نے کہا حسین اردو میں کمزور ہے اس لئے اسلامیات معاشرتی علوم سب پر اثر پڑتا ہے۔بدر آنٹی نے مجھے دو تین دن تک کچھ بھی نہیں پڑھایا نونہال تعلیم وتربیت بچوں کی دنیا ٹارزن کی کہانیاں دیں۔۔میں اٹک اٹک کر ہجے کرکے پڑھنے لگا مجھے یہ رسالے اچھے لگے بدر آنٹی مجھے ایک گھنٹے رسالے پڑھاتی پھر اسکول کا ہوم ورک کراتی۔۔۔میرا حافظہ ماشاءاللہ اچھا تھا میں نانی سے معاشرتی علوم کے سوال جواب زبانی سن کر یاد کرلیتا اور یوں اسکول میں فرفر زبانی جواب دینے میں مشہور ہوگیا لیکن ہجے کرکے پڑھنے اور لکھنے املا میں کمزور جو جلد دور ہوگئی۔

رسالے پڑھنے سے میری اردو اتنی اچھی ہوئی کہ پانچویں میں مجھے مضمون نویسی میں پہلا انعام ملا۔۔میری استانی نے دریافت کیا کہ یہ مضمون امی نے لکھ کر دیا یا خالہ نے۔۔میں نے کہا نونہال رسالہ سے یاد کیا تھا۔مس احمد نے مسکرا کر شاباش لکھا۔۔میں نے کہا مس یہ شاباش کیا ہوتا ہے کہنے لگیں اردو میں گڈ کو شاباش کہتے ہیں میں نے کہا میری امی کو اردو نہیں آتی ہے آپ گڈ لکھیں۔۔مس احمد ہنس پڑیں اور شاباش کے ساتھ گڈ بھی انگریزی میں لکھ دیا۔۔آج پچاس سال بعد میں بھی فیس بک پر بعض تحریر پر شاباش لکھ دیتا ہوں کہ شاباش گڈ کو کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے عام اردو قاعدے ہوتے تھے انگریزی میں so go lo جیسے کتب بعد میں چوتھی پانچویں میں ریڈر ریڈنگ کی سیریز۔۔۔ایک مرتبہ ایک کلاس میں میں بیماری کی وجہ سے غیر حاضر ہوا جو سبق پڑھایا میں غیر حاضر تھا پپا سے کہا اس سبق کے سوال کے جواب لکھ دیجئے۔پپا نے لکھ دیا میں نے یاد کرکے امتحان دیا۔مس نے کہا تم کلاس میں نہیں آئے تو سوال کے جواب کس سے لئے۔۔میں نے کہا انگریزی اور میتھ پپا پڑھاتے ہیں۔

اساتذہ اور والدین دونوں رشتہ دار لگتے تھے۔پرائمری میں کبھی بھی ڈانٹ ڈپٹ بچوں کو نہیں کرتے تھے البتہ کسی بچے کے کپڑے میلے بدبودار ہوتے یا بال کی مانگ نہیں ہوتی تو مس سمجھاتی تھیں کہ بچوں کو صاف ستھرا رہنا چاہیے وغیرہ چھٹی ساتویں کے بچے شرارت کرتے مذاق کرتے تو مصنوعی ڈانٹ پڑتی تھی۔

اس زمانے میں تین طرح کے رنگ کی یونیفارم اسکولوں میں چلتی تھی سفید قمیص اور خاکی پتلون حکومت کے پیلے اسکول میں سفید قمیص اور نیوی بلیوز یادہ اسکولوں میں اور بعض میں سفید قمیص گرے۔پرائمری میں اتاترک اسکول میں سفید قمیص نیوی بلیو پتلون چلتی تھی جب سیکنڈری میں بہادر یار جنگ اسکول گئے تو گرے پتلون تھی

گھر سے لنچ نہیں ملتا تھا اور نہ تصور تھا۔صبح صبح والدہ سب کے لئے پھلکے بناتی تھیں آلو کی ترکاری یا آملیٹ یا خاگینہ سے کھا کر جاتے تھے دودھ یا چائے کا بھی رواج نہیں تھا یا پیسے نہیں تھے صرف بچے یا بڑے بیمار ہو تو دودھ یا چائے کے ساتھ روٹی کھلائے جاتی ورنہ گوشت کی یخنی سوپ میں چور کر۔

اسکول میں ایک آنٹی بسکٹ ہیٹس کریم رول بیچتی تھیں۔جو بچے وہ کھاتے تھے تو دوسرے ان سے دور رہتے کہ یہ بازار کی چیز کھا رہے ہیں۔

اتاترک اسکول چھوٹا اسکول تھا مگر محلے کا سب سے نمایاں۔۔دس بارہ بچوں کی کلاس ہوتی۔تھی رفیع الدین شفیع اور نادرہ فرسٹ سیکنڈ تھرڈ آتے تھے جب میں چوتھی میں آیا تو تیسرے نمبر پر میں آنے لگا لڑکوں لڑکیوں میں مقابلے ہوتے کہ لڑکے جیت جائیں پہلی تینوں پوزیشنز لڑکے لینے لگے۔لڑکیاں بھی محلے کے کسی بھی بھائی کی چھوٹی بہنیں ہوتی تھیں سب محلے والے سب ایک دوسرے کے دوست رشتہ دار جیسے تھے اسکول ایک مرکز تھا دوستی کا۔

میں نے مارکس شیٹ رپورٹ کارڈ کبھی سنبھال کر نہیں رکھی ایک مرتبہ حیدرآباد دکن گیا تو ایک بچی کی ماں نے پورے دس جماعتوں کی رپورٹ دکھائی تو میں حیران رہ گیا شادی کے بعد ہماری بیگم نے کچھ اپنی رپورٹ اور کچھ ہمارے صاحب زادے کی رپورٹ سنبھال کر رکھی ۔۔میٹرک کے بعد کی تمام دستاویزات موجود ہیں کہ نوکری کا معاملہ ہے

پرائمری سکول میں غیر نصابی سرگرمی نہیں ہوتی تھی کلاس میں مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا۔تعریف ہوئی۔ہینڈی کرافٹ کا مقابلہ ہوتا اس میں فلاور باسکٹ بس ویگن بنانا پلاسٹر آف پیرس سے چیزیں بنانا ہوتا۔۔

چونکہ ہمارا اسکول محلہ کا اسکول تھا اس لئے پرائمری کے بعد لڑکے دھلی اسکول بہادر یار جنگ اسکول آغا خان اسکول چلے جاتے تھے لڑکیاں انجمن اسلامیہ حسین ابراہیم رونق اسلام وغیرہ میں۔۔مگر محلے کی وجہ سے سب سے سلام دعا ملاقات رہتی اسکول کے بعد کالجز یونیورسٹیز میں دوبارہ ملاقات ہوجاتی۔رفیع الدین بیس سال سے دبئی میں ہوں جب بھی کراچی آتے اکادمی میں ملاقات ہوجاتی اسی طرح بڑے بھائی کے دوستوں سے۔

اسکول انگریزی میڈیم کہلاتے تھے مگر انگریزی سائنس میتھ انگریزی میں ہوتے باقی اردو میں۔

120 گز کا مکان تھا صبح میں پرائمری دوپہر میں لوئر سیکنڈری۔۔۔اسکول میں میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منایا جاتا تھا سب بچے بچیاں تیار ہوکر جاتے تھے والدین بڑے بھائی بہن بھی شرکت کرتے اس وقت فلمی نعتیں پڑھنے کا رواج تھا وہ پڑھا جاتا بچوں میں لڈو یا نوری دانے تقسیم ہوتے تھے۔۔اسکول میں پرائمری میں گیمز نہیں ہوتے تھے مگر لوئر سیکنڈری میں قریبی میدان میں ریس وغیرہ۔

حکومت نے نیشنلائزیشن کرکے اسکول لے لیا تھا میڈیم نے نیا اسکول کھولا تھا اور وہ بھی اپنے معیار کی

بدولت مشہور ہوا۔ میڈیم کے بچوں نے گلستان جوہر میں بڑے پیمانے پر اسکول کھولا ہے۔۔ مگر ہم اپنے تین کمرے کے اسکول اور اپنی استانیوں کو ویسے ہی یاد کرتے ہیں جیسے وہ ہماری خالہ ہوں یا انٹی۔

## تین بڑی بڑی کینٹین۔ درخت سایہ بھی پھل بھی

### اسما مشتاق۔ او پی ایف گرلز کالج اسلام آباد

ماضی کے جھروکوں میں سے ایک حسین جھروکا بچپن کا ہوتا ہے۔ ذہن کے دریچوں پر دستک دوں تو بچپن کے سنہری ادوار اپنے خوبصورت رنگ بکھیرتے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

میں نے پرائمری تعلیم 2004 میں حاصل کرنا شروع کی او پی ایف گرلز کالج اسلام آباد میرا مادر علمی تھا۔ یہ ایک انگلش میڈیم اسکول ہے جو آج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ایف ایٹ ٹو کی شاہراہ پر جلوہ افروز ہے، جس کے پرائمری سیکشن میں چھوٹی چھوٹی بچیاں سفید فراکیں پہنے منڈلاتی دکھائی دیں گی، جو پہلی یا دوسری جماعت سے ہی تعلق رکھتی ہوں گی غالباً اسکے بعد کی جماعتوں میں تو ہمارے دور میں لمبا نیلا فراک ، اس کے نیچے سفید شلوار۔ یہ ہماری نفیس وردی تھی جو یقیناً کسی کے جمالیاتی ذوق کا شاہکار تھا۔

کون کہتا ہے وقت دہراتا ہے اپنے آپ کو
گر یہ سچ ہے تو میرا بچپن تو لوٹائے کوئی

ہمارے اسکول کی عمارت وسیع و عریض تھی ، تاحد نگاہ پھیلے . کشادہ میدان ، خوبصورت رنگ برنگ پھولوں سے سجی سرسبز و شاداب کیاریاں، دل چاہے تو بنچوں پر بیٹھ کر منظر سے دل لبھایئے ، موسم سے لطف اندوز ہوئیے اور جی کرے تو ایک نہیں چار پانچ وسیع پلے گراؤنڈ ، جن میں کوئی جھولوں سے سجا، اور ہر نوع کے کھیل کھیلنے کی سہولت سے بہرہ ور۔ مختلف میدان۔ کوئی گھاس کا میدان کوئی فٹ بال کا، ان میں سے کسی میں بھی جا کر حسب طبع دل بہلایئے اور نہیں تو کیا ، پھلدار درخت ، بڑے اونچے لیے سایہ دار ، پھل اتار کر بھی کھاتے تھے اور اپنی دوپہروں میں ان کے ٹھنڈے سائے سے بھی خوب محظوظ ہوتے تھے۔ شہتوت کا وہ درخت، اس سے شہتوت اتار اتار کر کھانا اور اسکے گہرے رنگ کا اسکول کی وردی پر لگ جانا اور پھر نہ اترنا مجھے آج بھی خوب یاد ہے۔

وہ اینٹوں کی وکٹیں وہ ٹوٹا سا بلا
وہ گلیوں کی رونق وہ اپنا محلہ
وہ جیبوں میں سکے مچاتے تھے شور
امیری کے دن وہ ، وہ مٹی کا گلا
اے بچپن بتا تو کہاں کھو گیا ہے
یا کہہ دے، تو اب بڑا ہو گیا ہے

آہا قلم چل پڑے تو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔۔!

اسکول کے اطراف میں تقریباً تین بڑی بڑی کینٹینیں سامان سے لدی پھندی طلباء کو للچاتی رہتیں۔ موسم کے مناسب گرم ٹھنڈے کی سہولت ماحول کو مزید پرکشش بناتی تھی۔ ہم نے کبھی اللہ کا شکر ہے ٹاٹوں پر نہیں پڑھا، شکر اس بات پر کہ اتنا با مشقت زمانہ نہیں دیکھا ، اسکے متحمل بھی تو نہیں ہیں ! بڑے بڑے آرام دہ کلاس روم تھے ، فرنیچر سے آراستہ تھے الحمدللہ!

اساتذہ بہت ہی شفیق اور نرم خو تھے، مجھے انکے شفیق چہرے آج بھی یاد ہیں، بچوں کو بچوں کے انداز میں پڑھانا، انکی خود ساختہ دنیا میں انکے ساتھ ہی محو سفر ہو جانا، انکے تصورات و تخیلات کو حقیقت کی نظر سے دیکھنا، انکو اہمیت دینا ، انہی کے انداز میں ڈھل جانا، اور اس سب کے ساتھ اخلاقی سماجی تربیت کرنا اپنے قول، فعل، کردار کے ذریعے سے اور تدریس کو پیشہ سمجھ کر نہیں بلکہ ایک عظیم منصب سمجھ کر اپنا فرض ادا کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ مارنا تو بہت دور کی بات، لیکن جہاں تک ڈانٹنے کی بات ہے تو پہلی دوسری جماعت تک تو کوئی قابل ذکر ڈانٹ بھی یاد نہیں پڑتی، البتہ تیسری سے پانچویں تک اساتذہ کی کچھ سرزنش اور تنبیہات یاد ہیں۔ لیکن ان وقتوں میں آج کے مقابلے میں آداب اور اچھے اطوار رائج تھے، اُستاد کی ڈانٹ کھیتی کیلیئے پانی ہی کی طرح سمجھی جاتی تھی اور والدین اسی نہج پر بچوں کی تربیت کرتے تھے۔ اکثر گھروں میں گھر سے لنچ بنا کر دینے کا ہی رواج تھا۔

میری یادداشت کے مطابق میں کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئی ہاں کچھ جماعتوں میں کچھ مضامین میں کمزور ضرور رہی ہوں پرائمری کا تو میرا ظن غالب ہی ہے کہ کوئی سرٹیفکیٹ یا مارکس شیٹ سنبھال کر نہیں رکھی ہوئی ہمیں یہی بنیادی مضامین یعنی اردو ، انگریزی ، حساب ، اسلامیات ، جنرل سائنس اور بنیادی معاشرتی علوم مجھے یاد آرہے ہیں۔ قاعدے کتابیں کچھ خاص یاد نہیں ہیں بس ہلکی سی جھلک۔ کچھ کتابیں صحیح یاد ہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ بھی خوب لیتی تھی، خصوصاً اردو ادب ، نعت خوانی اور کھیلوں میں۔

زندگی کی الجھنوں سے فرار چاہیے مجھے
مجھے بچپن کا ایک دن ادھار چاہیئے

ہم جماعت تو سچی بات ہے پہلی دوسری جماعت کے تو کوئی یاد نہیں ، البتہ بعد کی جماعتوں کے کچھ کچھ یاد ہیں، نام بھی اور کچھ شکل وصورت بھی لیکن رابطہ تو بالکل کسی ایک سے بھی نہیں نہ اتا پتہ۔۔!!

اک بچپن کا زمانہ تھا، خوشیوں کا خزانہ تھا
چاہت چاند کو پانے کی تھی دل تتلی کا دیوانہ تھا
تھک کر آتے تھے اسکول سے پھر کھیلنے بھی جانا تھا
بارش میں کاغذ کی کشتی، ہر موسم ہی بڑا سہانا تھا
ہر کھیل میں ساتھی تھے ، ہر رشتہ نبھانا تھا
رونے کی وجہ نہ تھی ، نہ ہنسنے کا بہانہ تھا
اب نہیں رہی وہ زندگی
جیسے بچپن کا زمانہ تھا

## پرائمری جماعتوں میں نصاب آج کل کی طرح بھاری نہیں تھا

### پروفیسر پرویز احمد، شعبہ اُردو، کیڈٹ کالج پٹارو۔

ہر انسان کی زندگی میں کچھ لوگ اور کچھ ادوار ایسے گزرتے ہیں جنھیں وہ بھلائے نہیں بھول پاتا یا اُن سے عقیدت ومحبت اور انسیت کا ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ کچھ انسان کے آبائی گھر ، شہر اور ابتدائی تعلیم کے حوالے سے درس گاہوں کا ہے۔۔ میری زندگی میں بھی ایسے ادوار گزرے ہیں، ان ہی میں سے ایک دور میری پرائمری تعلیم کا ہے۔ بچپن کے دن جب بھی یاد آتے ہیں بہت سی یادیں تازہ ہو کر ذہن کے پردے پر نمودار ہونے لگتی ہیں۔ میں نے پرائمری تعلیم اپنے شہر حیدرآباد کے علاقے اللہ داد چن گوٹھ میں واقع گورنمنٹ قاضی عابد پرائمری اسکول سے حاصل کی۔ پرائمری تعلیم کے پانچ سال ۱۹۸۴ء میں مکمل ہوئے۔ پھر میں نے مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے شہر کے دوسرے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ حیدرآبا ایک صاف ستھرا شہر تھا اور گلی کوچے بھی صاف ہی ہوا کرتے تھے۔ اسکول کے راستے شہر کے تین اطراف سے ملتے تھے۔ ایک راستہ اللہ داد چن گوٹھ سے۔ دوسرا گڈس ناکہ سے اور تیسرا راستہ حیدرآباد ریلوے اسٹیشن سے اسکول کی طرف آتا تھا۔ پرائمری اسکول میں پڑھائے گئے وہ قاعدے اور کتابیں تو وقت کی دھول میں کہیں دب کر رہ گئے ، مگر وہ قاعدے اور کتابیں پڑھانے والے اساتذہ اپنی پدرانہ شفقت اور محبت کی وجہ آج بھی ذہن کے کسی نہ کسی دریچے میں بند ہیں اور خوشگوار یادوں کے جھونکوں سے وہ ان بند دریچوں سے جھانکنے لگتے ہیں۔

پرائمری جماعتوں میں شامل نصاب آج کے اسکولوں کی طرح بھاری بھرکم اور مشکل نہ تھا۔ تین سے چار کتابیں پڑھائی جاتیں لیکن اس طرح کہ وہ حفظ ہو جایا کرتی تھیں۔ اردو، سندھی ، حساب اور معاشرتی علوم کی درسی کتابیں بڑی شفقت سے پڑھائی گئیں۔ ڈانٹ ڈپٹ بہت کم ہوا کرتی تھی۔ ہمارا اسکول کیوں کہ گورنمنٹ اسکول تھا، اس لیے کیمل کلر کا شلوار قمیص یونی فارم کے لیے مختص تھا لیکن ہم کبھی کبھی گھر کے کپڑے پہن کر بھی اسکول چلے جایا کرتے تھے۔ سادہ زمانہ تھا اس لیے گھر سے کھانا (لنچ باکس) لے

جانے کا رواج نہیں تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ اسکول گھر سے قریب تھا اور چھٹی بھی جلدی ہو جایا کرتی تھی۔ اسکول میں ہاف ٹائم (بریک) بھی ہوا کرتی تھی اور کچھ خوانچہ فروش اور ریڑھی والے اسکول کے باہر کھانے پینے کی چیزیں لیے موجود ہوتے اور ہم کچھ نہ کچھ کھا کر بھوک مٹانے کا سامان کر لیتے اور باقی چھٹی کے بعد اچھلتے کودتے گھر پہنچ کر کھا لیتے۔ اسکولوں میں نصاب بہت آسان ہوتا تھا اور میں پڑھائی میں کمزور نہیں تھا اس لیے کبھی فیل تو نہیں ہوا لیکن اب یاد نہیں کہ پانچویں جماعت میں کتنے نمبر آئے تھے۔ گھر میں مجھ سے بڑے بہن بھائی بھی اسکول جایا کرتے تھے، اس لیے میرے اسکول کا رزلٹ اور سرٹیفکیٹ وغیرہ شاید وہی سنبھال کر رکھتے تھے۔ میرے پاس صرف چوتھی جماعت کا رزلٹ کارڈ موجود تھا لیکن اب وہ بھی نہیں ہے پھر آٹھویں جماعت سے میں نے اپنا نتیجہ اور اسناد وغیرہ خود سنبھالنا شروع کر دیے تھے جو آج بھی محفوظ ہیں۔ اُس وقت اسکولوں میں قومی تہوار جوش وخروش سے منائے جاتے تھے، اس لیے کبھی کبھی ان میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ پرائمری اسکول میں ساتھ پڑھنے والے دوستوں میں سے تین دوستوں سے آج بھی دوستانہ تعلقات استوار ہیں بلکہ جتنی محبت اور خلوص بچپن کے ان دوستوں سے ہے شاید کالج اور یونی ورسٹی کے دوستوں سے بھی نہیں۔ میرا اسکول اُردو میڈیم تھا لیکن اس کی عمارت بڑی کشادہ اور ہوادار تھی۔ اسکول میں پانچ کمرے اور ایک کھیل کا چھوٹا میدان تھا جس میں بچے کھیلا کرتے تھے۔ تمام کلاسز میں لکڑی کے بینچ رکھے ہوتے تھے اور استاد کے لیے ایک کرسی۔ بلیک بورڈ لکڑی کے بنے ہوئے تھے جن پر استاد سفید چاک سے لکھا کرتے تھے۔ طالب علموں کا خط بہتر بنانے کے لیے اساتذہ ہم سے تختی بھی لکھوایا کرتے تھے جسے ہم چھٹی کے بعد بغل میں دبائے گھر لے آیا کرتے تھے۔ اسکول کا کام اکثر اسکول میں ہی کر لیا جاتا تھا لیکن جو کام گھر کے لیے دیا جاتا وہ بھی کرنا ضروری ہوتا تھا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم مکمل کیے ہوئے اگرچہ تین دہائیاں گزر چکی ہیں اور میرے وہ استاد بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے چہرے، ان کی محبت ، ان کی شفقت اور خلوص آج بھی دلوں پر نقش ہے۔

(یہ انٹرویو بھی ماہنامہ 'اطراف' کے بیورو چیف حیدر آباد پروفیسر شاداب احمد صدیقی کے توسط سے موصول ہوا)

## صدر مدرس کے تمام بچے ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سمیت

### پروفیسر ڈاکٹر رئیس صمدانی، منہاج یونیورسٹی کراچی

1۔ میرے والدین نے قیام پاکستان کے وقت متحدہ ہندوستان سے پاکستان اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ راقم نے قرآن پاک کی تعلیم گھر پر حاصل کی جب عمر اسکول جانے کی ہوئی تو آگرہ تاج اور بہار کالونی کے درمیان مسان روڈ جس کا نام آتمارام پریتم داس روڈ تھا پر قائم اسکول ''غازی محمد بن قاسم اسکول'' میں 1956ء میں پہلی جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ پانچویں پرائمری 1960ء میں پاس کی۔ یہ اسکول آج بھی قائم ہے اور سرکاری اسکول بن چکا ہے۔ اسکول کی عمارت ہندوؤں کے ایک مسان گھاٹ کی تھی۔ اسکول کے صدر مدرس جو اسکول کے مالک بھی تھے اس جگہ کو لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ابوظفر آزاد بن طاہر اس اسکول کے مالک بھی تھے۔ تعلیم کی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ اپنی اہلیہ کو جو شادی کے وقت میٹرک یا انٹر پاس تھیں، ایم بی بی ایس پڑھایا، ان کا نام عطیہ ظفر تھا، وہ ہماری خاندانی معالج بھی تھیں، اس خاندان کی رہائش اسی اسکول میں پہلی منزل پر تھی۔ ان کے خاندان کے تمام بچے ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ، ڈاکٹر ٹیپو و دیگر ان کی اولادوں میں سے ہیں۔

2۔ پہلی جماعت میں تو اردو کی پہلی کتاب، انگریزی میں اے بی سی ڈی، اسی طرح دیگر مضامین کی ابتدائی معلومات پر مبنی کتب پڑھیں۔ جیسے جیسے کلاس میں آگے بڑھتے رہے کتابوں میں بھی تبدیلی آتی گی۔

3۔ قاعدے، کتابیں یاد ہیں۔ قاعدہ کلام مجید ختم کرنے سے قبل گھر پر ہی پڑھا۔

4۔ یاد پڑتا ہے کہ ڈرانے کے ساتھ ساتھ مار بھی پڑتی تھی۔

5۔ سفید شرٹ اور خاکی پینٹ

6۔ گھر سے لنچ کیسے ملتا تھا۔ گھر سے لنچ عام طور پر ڈبل روٹی، موجودہ ڈبل روٹی نہیں بلکہ بند نما سخت ڈبل روٹی جس میں کبھی چٹنی۔ کبھی کچھ اور لگا ہوتا۔

7۔ اسکول کی جب چھٹی ہوتی یا ہاف ٹائم ہوتا تو گیٹ کے سامنے کئی ٹھیلے موجود ہوا کرتے تھے۔ ان میں چھولوں کی چاٹ، کلفی، ڈبل روٹی چھولوں کے ساتھ، پکوڑے وغیرہ

8۔ کسی کلاس میں فیل نہیں ہوئے

9۔ نمبر تو یاد نہیں، نہ ہی اس وقت کا ریکارڈ محفوظ رہ سکا بس پاس ہو گیا تھا۔

10۔ امارک شیٹ یا سرٹیفکیٹ سنبھال کر نہیں رکھا ہے

11۔ اسکول میں جو پروگرام ہوتے ان میں حصہ لیا کرتا تھا،

12۔ پرائمری کلاس یعنی پانچویں کلاس تک کے ساتھی بہت سے پڑوسی بھی تھے، لیکن جب وہ علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں شفٹ ہو گئے تو رفتہ رفتہ ان ساتھیوں سے تعلق ختم ہو گیا۔

13۔ اردو میڈیم۔

14۔ پرائیویٹ اسکول عام طور پر چھوٹی بلڈنگ میں ہوا کرتے ہیں لیکن میرا اسکول خاصی بڑی جگہ پر قائم تھا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ جگہ، ان ہندوؤں کا شمشان گھاٹ تھا جو کراچی کو چھوڑ کر بھارت چلے گئے تھے۔ کھیل کا میدان تو نہیں تھا لیکن کلاسوں کے درمیان خاصی کھلی جگہ تھی۔ اسکول میں ایک شفٹ پرائمری کی تھی دوسری شفٹ سیکنڈری کلاسیز کی اس لیے اسکول میں ہر کلاس کا علیحدہ کمرہ اور لکڑی کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔

15۔ فرنیچر پر۔

16۔ تختی لکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ تختی لکھنے سے قبل اسے چکنی مٹی سے پوتنا، سرکنڈے سے قلم بنانا اچھی طرح یاد ہے۔ اسکول کے اندر ایک حوض بنا ہوا تھا اس کی چاروں جانب کی دیواریں خاصی چوڑی تھیں، ہم اس خالی حوض پر بیٹھ جاتے اور تختی کو پوتا کرتے تھے۔ سوکھنے کے بعد اس پر لکھنے کا عمل ہوتا۔ ایک تختی اپنے گھر سے تیار کر کے اسکول لے جایا کرتے تھے۔

ماہ نامہ 'اطراف' نے مندجہ بالا سوالات کے جوابات لکھوا کر گویا ماضی کے چراغوں کو روشن کر دیا ہے۔ پرائمری تعلیم یعنی اول تا پنجم کی عمر کی باتیں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ پرائمری کے بعد سیکنڈری اسکول یا چھٹی سے میٹرک کا زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت کی بے شمار باتیں اور یاتیں ذہن میں محفوظ رہ جاتی ہیں۔ اس دور کے دوست اور ساتھی بھی آپس میں ملتے رہتے ہیں جس کے باعث اس دور کی یادیں محفوظ ہوتی ہیں۔

## سندھی میڈیم۔ انگلش میڈیم ہمارے زمانے میں نہیں تھا

### معروف کہانی کار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، شاعر، کالم نگار، مترجم، کمپیئر۔ زیب سندھی۔ حیدر آباد

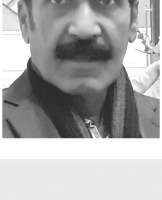

1۔ میں نے پرائمری تعلیم دینی مدرسہ پرائمری اسکول لاڑکانہ سے حاصل کی، جواب ہائی سکول ہے۔

2۔ سندھی، ریاضی، جغرافیہ (دوسرے مضامین یاد نہیں)

3۔ ہاں، کچھ کچھ یاد ہیں۔

4۔ ڈانٹتے یا مارتے کم تھے۔ پیار کرنے والے استاد بھی تھے۔

5۔ یونیفارم نہیں تھی۔

## میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

6۔گھر سے لنچ نہیں، جیب خرچ ملتا تھا۔

7۔پکوڑے، چھولے اورطرح کی چٹ پٹی چیزیں ملتی تھیں۔

8۔فیل کبھی نہیں ہوا تھا لیکن میں پڑھا کو نہیں تھا۔

9۔نمبر یاد نہیں لیکن کم ہی ہوں گے۔

10۔پانچویں کلاس کا سرٹیفکیٹ اب بھی موجود ہے۔

11۔غیر نصابی سرگرمیاں ہوتی ہی نہیں تھیں۔کبھی کبھی ایک مداری آتا تھا جس کا تماشا میں دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ (اور پھر بڑا ہو کر ٹی وی ڈرامے لکھ کر میں خود تماشا دکھانے والا بنا!)

12۔ہاں یاد ہیں لیکن رابطہ کسی سے نہیں۔

13۔سندھی میڈیم (انگلش تو پرائمری میں ہمارے زمانے میں تھا ہی نہیں۔)

14۔ایک منزلہ عمارت تھی۔کلاسوں کے بیچ میں اسمبلی کا میدان اور باغیچہ تھا۔

15۔بہت سادہ سا فرنیچر تھا۔

16۔ہاں، تختی لکھی تھی۔

(یہ انٹرویو بھی بتوسط پروفیسر شاداب احمد صدیقی بیورو چیف 'اطراف' حیدر آباد)

### پروفیسر محمد نجیب خان لودھی، پرنسپل

#### گورنمنٹ سندھ کالج آف کامرس و پوسٹ گریجویٹ سینٹر حیدر آباد

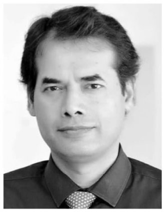

1۔گورنمنٹ کمپری ہینسیو اسکول لطیف آباد سے پانچویں جماعت 1983 میں پاس کی۔

2۔مضامین میں اردو انگریزی ریاضی اسلامیات معاشرتی علوم سائنس ڈرائنگ

3۔قاعدے کتابیں کچھ یاد ہیں۔

4۔ڈانٹ کم تھی مار زیادہ تھی جو سبق یاد نہیں کرتے وہ پٹتے تھے۔

5۔جو یاد کرتے وہ بھی پٹتے تھے۔لیکن اب یہ سوچ کرنا گواری محسوس نہیں ہوتی

5۔پہلے یونیفارم بلیو نیکر وائٹ شرٹ تھی پھر حکومت کی تبدیلی کے بعد ملیشیا کلر شلوار سوٹ پھر کیمل کلر شلوار سوٹ۔

6۔لنچ گھر آ کر کرتے تھے۔اسکول میں بریک ٹائم میں ٹھیلے والوں سے خرید کر نمکین و میٹھی اشیاء کھاتے تھے۔ٹھیلے اسکول کے اندر آتے تھے۔چھولے چاٹ شربت گولہ گنڈا چورن پاپڑ اور گڑیا کے بال وغیرہ۔

7۔الحمدللہ میں کسی بھی جماعت میں فیل نہیں ہوا۔

8۔پانچویں کلاس کا رزلٹ صرف ''پاس فیل'' اناؤنس کیا گیا سرکاری اسکول تھا بس پانچویں پاس کرا کے لائن بنا کر چھٹی کلاس میں بٹھا دیا گیا۔

9۔چوتھی کلاس تک مضمون وار نتیجہ ملتا تھا۔

10۔غیر نصابی سرگرمیوں میں ڈرائنگ اور تقریری مقابلے میں حصہ لیا۔

11۔جی ہاں بہت سارے دوست یاد ہیں۔ابھی بھی بہت سے دوست بیرون ملک رابطے میں ہیں۔

12۔ہمارا اسکول اردو میڈیم تھا۔

13۔بہت بڑی بلڈنگ تھی پلے گراونڈ بھی تھا

14۔فرنیچر پر بیٹھے

15۔تختی نہیں لکھی۔

16۔پرائمری تعلیم و کی یاد گار دور ہے۔

(یہ انٹرویو بھی بتوسط پروفیسر شاداب احمد صدیقی بیورو چیف 'اطراف' حیدر آباد)

### ریڈیو پر صداکاری بھی کی۔ٹی وی ریڈیو کے لیے پروگرام بھی لکھے

#### سینئر صحافی نمائندہ خصوصی خواتین ڈائجسٹ۔محترمہ شاہین رشید کراچی

1۔گھر میں ہی حاصل کی۔

2۔پرائمری میں تو مضامین محدود ہی ہوتے تھے پھر بھی اردو، انگلش، حساب اور سائنس تھے۔

3۔نہیں ..اس وقت کے مطابق ہی تھیں. قاعدے کتابیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

4۔میں نے پرائمری کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی تو ظاہر ہے والدین سے ڈانٹ تو پڑتی تھی مار نہیں پڑی۔

5۔فراک لائٹ گرین اور شلوار سفید۔

6۔لنچ گھر آ کر کرتی تھی۔

7۔اسکول کے باہر سے چیزیں کھانے کی اجازت نہیں تھی۔

8۔ہاہاہا. میٹرک میں ایک مضمون میں جو کہ میتھ تھا. سپلی میں پاس ہو گئی سال ضائع نہیں ہوا۔

9۔پانچویں کلاس تک گھر میں پڑھا تھا۔

10۔جی بالکل۔

11۔جی کافی . ریڈیو پر صداکاری بھی کی اور ریڈیو ٹی وی کے لئے پروگرام بھی لکھے. کھیل کود سے دلچسپی نہیں تھی کرکٹ پسندیدہ کھیل رہا مگر صرف دیکھنے کی حد تک۔

12۔پرائمری گھر میں پڑھی لہذا دوست بنے ہی نہیں۔

13۔انگریزی میڈیم ..ویسے تعلیم کا لیول سب اسکولوں کا ایک ہی تھا۔

14۔بلڈنگ کافی بڑی تھی. مگر گراونڈ نہیں تھا۔

15۔فرنیچر تھا۔

16۔جی بالکل لکھی تھی۔

(یہ انٹرویو بھی بتوسط پروفیسر شاداب احمد صدیقی بیورو چیف 'اطراف' حیدر آباد)

### تفریح سے گھر واپسی میں مکئی کے دانے یا کچے چاول لاتیں اور بھٹیارن سے بھنواتیں

#### ممتاز مصنفہ نازیہ آصف۔گجرات

**(نازیہ آصف۔بہت مشاق اور سینئر قلمکار ہیں۔ان کی پرائمری کی یادیں اس دور کی پوری سماجی تصویر سامنے لا رہی ہیں۔تفصیل سے لکھنے کا شکریہ)**

پرائمری تعلیم جیسے ایلیمنٹری تعلیم بھی کہا جاتا ہے، کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہوتا ہے۔پاکستان میں چونکہ برطانوی نظام تعلیم رائج رہا ہے تو یہاں بچے کی پانچ سال کی عمر سے پرائمری تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے جو عموماً گیارہ سال تک پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔وہ ممالک جو برطانوی کالونی کا حصہ نہیں تھے وہاں کنڈر گارٹن سسٹم بھی چلتا ہے۔پاکستان کے محکمہ تعلیم کی تیار کی گئی ایک رپورٹ (22,2021 کے اعداد وشمار) کے مطابق اندازاً دو کروڑ بچے سکول نہیں جا رہے۔جو کہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔حکومت پاکستان بچوں کو اسکول لانے کی کوشش کر رہی ہے مگر یہاں بچوں کو ہوش سنبھالتے ہی روزی روٹی کی فکر میں دھکیل دیا جاتا ہے۔دوسری

# میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس ابتدائی تعلیم میں ہی تین طبقات کی تخصیص ہو جاتی ہے۔سرکاری پرائمری تعلیم، نجی پرائمری تعلیم اور مدارس کی ابتدائی تعلیم، اور یہ تفاوت عمر بھر چلتا ہے، اور یہی فرق آگے چل کر بہت سے مسائل کو جنم دے رہا ہے۔

پاکستان میں پرائمری تعلیم میں ہی بچہ کتابوں کے بوجھ تلے دبا ہوتا ہے اس کی تربیت کیا خاک ہو گی۔اب نمبروں یا اچھے گریڈز کی دوڑ نے بچوں کو بالکل ہی مشین بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔

اپنی پرائمری تعلیم کا ذکر کروں تو کچھ قابل فخر رویے نہ تھے جن سے مجھے واسطہ پڑا۔

پچھلی صدی کی اسی کی دہائی کا ذکر ہے جب ہم پھول اور کلیاں (نوائے وقت بچوں کا ایڈیشن) پڑھتے پڑھتے گاؤں سوہاوہ وڑائچاں (ضلع منڈی بہاوالدین) کے اکلوتے پرائمری سکول میں داخل کروا دیے گئے۔ جہاں اندازا کوئی پچاس بچیاں ہوں گی۔جن میں ہم بھی نیلی قمیض اور شلوار پہنے شامل ہو گئے۔ ننھے ننھے خواب آنکھوں میں سنجوئے ایک ہی لگن تھی کہ بس بہت سارا پڑھنا ہے۔بہت سی مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود بھی ہم پنجاب یونیورسٹی پہنچ گئے۔قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ میں پہلی لڑکی تھی اپنے گاؤں کی، جس نے گریجوایشن کی تھی۔مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ ہماری پھپھیوں نے بھی اسی پرائمری سکول میں پڑھا اور پھر آجکل ہماری بھتیجیاں بھی اسی پرائمری سکول میں پڑھ رہی ہیں۔یعنی وہ سکول آج سے پچاس سال پہلے بھی محض پانچ جماعتوں پہ مشتمل تھا اور آج بھی وہی پانچ جماعتیں ہیں۔گاؤں کی آبادی کئی سو فیصد بڑھ چکی مگر اس سکول جانے والی بچیوں کی تعداد آج بھی اتنی ہی ہے۔

میں جب بھی گاؤں جاتی ہوں تو قبرستان بھی جانا ہوتا ہے اور قبرستان کا حدود اربعہ بھی اتنا ہی ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔جس سے میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "کیا دونوں کی اہمیت ایک جتنی ہی ہے (گاؤں کے قبرستان میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہوتا۔چند ہی لوگ عید یا محرم پہ جاتے ہیں اور بس۔قبریں بارشوں میں منہدم ہو جاتی ہیں اور تعداد بڑھتی نہیں۔)

لوگ اپنی بچیوں کو سکول بھیجتے ہیں مگر اس سرکاری سکول میں نہیں۔لوگ نجی تعلیمی اداروں میں بچوں کو بھیجنا پسند کرتے ہیں۔

جس کی بڑی وجہ وہاں کی استانیوں کا وہی گھسے پٹے طریقہ کار پہ عمل پیرا ہونا ہے۔جن کی قابلیت آج بھی میٹرک پی ٹی سی ہے اور آج تک اس قابلیت میں اضافہ کیا ہے نہ بچیوں کو سکول کی طرف راغب کرنے کے لیے کوئی احسن قدم اٹھایا ہے۔

اگرچہ سکول کی عمارت کوئی تیس سال پہلے نئی بنی ہے مگر میرے گاؤں کی بیٹیوں کی قسمت میں اس سے مستفید ہونا نہیں تھا۔بیس سال سے وہی دو استانیاں ہیں جو مقامی ہیں جن کے نہ صرف شیر خوار بچے بھی سکول کی بچیوں نے کھلائے ہیں بلکہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی وہی بچیاں گھر جا کر کر کے آتی رہی ہیں۔مختصر یہ کہ چالیس سال پہلے والے حالات آج بھی جوں کے توں ہیں۔اگر سکول کی عمارت کی بات کی جائے تو یہ کہوں گی"

ہم جب پانچویں کلاس میں پہنچیں تو ہمیں یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ہمیں برآمدے سے سکول کے اکلوتے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔جس پہ ہم خود کو باقی سکول سے کچھ الگ اور اعلی تصور کرنے لگیں۔

چار یا پانچ مرلے کے سکول کے سارے صحن میں اینٹوں کا فرش لگا ہوا تھا، کونے میں ایک نلکا ہوتا جسے ایک لڑکی چلاتی تو دوسری ہاتھوں کا چلو بنا کر پانی پی لیتی۔صحن کے درمیان میں دو دھریکوں کے درخت تھے، جن کی چھاؤں سارے سکول میں ہوتی تھی۔

اگر سکول میں بجلی کی بات کی جائے تو کمرہ جماعت میں بیٹھے کبھی کالے بادل جب گھر کر آتے اور اندھیرا چھا جاتا تو یہ خیال انتہائی خوش کن لگتا کہ "اگر سکول میں اس وقت ایک بلب جل جائے تو کیسا ہو۔۔۔۔۔"۔؟ کیونکہ ہمارے لیے یہ سوچنا ہی بہت حیرت انگیز اور خوش گوار تھا، بہت بڑی تفریح تھی کہ سکول میں بلب بھی جل سکتا ہے۔

تعلیم کے اس سفر میں ایک سانحہ یہ بھی ہوا کہ اس وقت کی انتہائی قابل استانی مس ارشاد صاحبہ جو ہماری کلاس ٹیچر تھیں، لقمہ اجل بن گئی تھیں۔ان کے بعد آنے والی ہماری استانی بھی بہتر تھیں مگر قدرے متکبر۔سکول میں دو استانیاں ہوتی تھیں جنھیں ہم باجی جی کہتی تھیں۔نرسری پریپ کا کوئی تصور نہ تھا۔کچی، پکی دوسری، تیسری، اس طرح چھ کلاسیں بنتی تھیں تو دونوں استانیاں تین تین جماعتوں کو پڑھاتی تھیں۔جن کا سلیبس سائنس، اردو، حساب، معاشرتی علوم اور دینیات پر مشتمل ہوتا تھا۔صبح سکول کا آغاز تلاوت قرآن پاک، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی نظم،

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

سے ہوتا اور قومی ترانے کی ادائیگی کے بعد سب کلاسز اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر پڑھائی کا آغاز کرتی تھیں۔

ہمارے پرائمری سکول کی عمارت ایک کمرے اور لکڑی کے بوسیدہ سے چھت والے ایک برآمدے پر مشتمل تھی۔جن میں ٹاٹ بچھائے جاتے تھے اور چھٹی کے وقت وہ ٹاٹ ہم خود ہی جھاڑ کر، تہہ کر کے اکلوتے کمرے کے اندر رکھ کر تالا لگا کر آتے، اگلی صبح باری باری تین لڑکیوں پہ مشتمل ایک ٹولی پہلے جھاڑو لگاتی پورے سکول میں، پھر سب اپنی اپنی کلاس کا ٹاٹ بچھاتیں۔اور ہاں یہ ٹاٹ کی عیاشی بھی سارے سکول کو میسر نہ تھی۔تیسری کلاس تک کی بچیاں گھر سے پیڑھی لے کر آتیں، چھٹی کے وقت اسی پیڑھی پہ پہلے تختی رکھی جاتی پھر اس کے اوپر ایک قرآن پاک کے غلاف نما کپڑے کا سلا ہوا بیگ رکھتیں اور اپنا ایک بازو دوہرا کر کے اس کے اوپر پیڑھی، تختی اور اس پہ رکھا یہ بیگ اٹھا کر گھر لے کر جاتیں۔

چار مضامین پڑھ چکنے کے بعد، جی بریک بھی ہوتی تھی۔جسے ہم "تفریح" کہتے تھے اور سب بچیوں کی یہ روٹین ہوتی تھی کہ وہ تفریحی وقت اپنی لکڑی کی بنی تختی اپنے ساتھ گھر لے جاتی تھیں۔جہاں وہ کھانا کھاتیں اور گزشتہ کل کی لکھی تختی دھو کر اور اوپر گاچی لگا کر واپس سکول لے آتیں۔

اسکول کی دونوں استانیوں کے گھر بھی قریب ہی تھے۔وہ بھی تفریحی وقت گھر جا کر تازہ دم ہو آتی تھیں۔ہاں ہم میں سے کئی بچیاں تفریح سے واپسی پر گھر سے مکئی یا کچے چاول لے کر آتیں اور سکول سے متصل بھٹی پہ بیٹھی بھٹیارن سے وہ اناج بھنوا لیتیں۔جب بھٹیارن مکئی کے دانے کڑاہی میں گرما گرم ریت پہ ڈالتی تو کھٹک کھٹک کرتے وہ بھدے سے دانے خوبصورت پھول بنتے جاتے۔پھر بھٹیارن اپنے ہاتھ میں پکڑے کپڑے کی مدد سے بڑے چھاننے سے وہ ریت اور مکئی کے پھول کڑاہی سے نکالتی تو ساری گرم ریت بڑی سرعت سے نیچے کڑاہی میں گرتی جاتی۔بھٹیارن کے دانے بھونتے وقت لڑکی جس کے وہ دانے بھون رہی ہوتی تھی، کی ذمہ داری تھی کہ وہ ایک دوشاخہ چھڑی سے گنے کی چھال کو بھٹی میں دھکیلتی جائے۔جس سے آگ رواں رہتی اور دانے بھن جاتے۔اور اس دوشاخے سے گنے کی چھال (یعنی گنے کے خشک پتے) کو آگے کرنا ایک ٹیکنیکل کام ہوتا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔پتوں کو لپیٹ لپاٹ کر بھٹی میں دھکیلنا اور کڑاہی کے آس پاس سے پیلے اور سرخ شعلوں کے درمیان کھٹک کھٹک پھول بننا مجھے بہت ہی بھاتا تھا۔گرما گرم سوندھی سے خوشبو میں بسے بھنے مکئی یا چاول وہ بچی نہ صرف خود چباتی بلکہ اپنی پوری کلاس جو چھ سات لڑکیوں پہ ہی مشتمل ہوتی تھی، سب کو کھلاتی۔یہی ہمارا لنچ ہوتا۔ہاں کبھی کبھار چنا چاٹ بھی بنتی تھی جو ہم پچاس پیسے یا ایک روپے کی لیتے تو پیٹ بھر جاتا تھا۔کبھی کبھار سردیوں میں قریبی باغ سے مالٹے بھی منگوائے جاتے۔جنھیں لانا عموما میری اور میری دو اور سہیلیوں کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ہمیں باغ سے پچیس روپے کے توڑا بھر مالٹے ملتے جو ٹیچرز ہمیں روپے کے دو بیچنے کا حکم دیتیں۔یوں کافی بچت ہوتی سکول کو۔۔۔۔۔۔جو جانے کہاں جاتی۔

یوں ایک وقت میں ہمارا سکول تقریبا خالی ہو جاتا تھا۔

تفریح کے بعد سکول دوبارہ لگ جاتا تو سب سے پہلے اردو کی جو کہانی ہم نے گزشتہ دن پڑھی ہوتی تھی اس کی املا لکھوائی جاتی۔املاء لکھوانے کے لیے کبھی کوئی لڑکی یا ٹیچر خود کتاب آگے رکھ لیتیں اور ہم سرکنڈے سے تراشا گیا قلم، دوات اور تختی لے کر ایک دوسرے کے پیچھے بالکل کمرہ امتحان کی طرح بیٹھ جاتیں۔خوشخطی کے لیے بہت شاباش ملتی تھی۔جب سرکنڈے کی قلم کو دوات میں ڈبو کے گاچی لگی تختی پر زرا سا دبا کر ج، ش یا ع، غ یا، ن جیسے الفاظ کا دائرہ بنایا جاتا تو اس وقت جو قلم کی آواز نکلتی، تو ہم خود کو بوعلی سینا یا ابن الہیثم کے سامنے زانو تلمذ تہہ کیے دیکھتے۔اس آواز میں بہت نفاست اور وقار ہوتا تھا۔املا مکمل ہونے کے بعد استانی سب کی تختیاں اپنی میز پر رکھوا لیتیں اور

پنسل یا سکہ (جو عموماً ٹارچ کا ناکارہ سیل توڑ کر نکالا گیا ہوتا تھا) سے سب کی املاء کی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی اور ایک غلطی پہ دو چھڑیاں پڑتی تھیں۔ کبھی کبھار یہ خدمت اسی تختی کی مدد سے بھی سر انجام دی جاتی تھی، مگر شکر ہے اللہ پاک کا کہ اردو زبان کی محبت شروع سے ہی دل میں ایسے گھر کر چکی تھی کہ کبھی املاء کی غلطی ہوئی اور نہ کبھی مار پڑی تھی۔

تفریح" کے بعد پہلا پیریڈ املاء کا ہوتا تھا۔ املاء لکھ چکنے کے بعد عموماً ایک یا دو پیریڈ اور ہوتے۔ پھر سارے سکول کی بچیوں کو تین لائنوں میں کھڑا کر لیا جاتا اور تین لڑکیوں کی ٹولی سب کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور یہ آخری آدھا پونا گھنٹہ پہاڑے (Tables) یاد کروانے میں لگایا جاتا، آگے کھڑی تین لڑکیاں با آواز بلند یوں بولتیں

دو اکم دو

دو دونی چار

پھر سکول کی ساری بچیاں یہی راگ الاپتیں۔ پھر آگے کھڑی تین بچیاں اگلی دو لائنز اونچی آواز میں بولتیں

دو تیئے چھ

دو چوکے اٹھ

سچ کہوں تو اس وقت سارے اسکول کو پہاڑے یاد کروا کروا کر ساری زندگی بلکہ آج تک نہیں بھولے۔ آج میرے بچے کیلکولیٹر استعمال کرتے ہیں جبکہ میں انھیں اتنی دیر میں زبانی ہی بتا دیتی ہوں۔

آہا کیا دن تھے! کوئی خوف نہ کوئی خطرہ۔

الحمد اللہ کہ ہماری پانچویں کلاس میں فرسٹ پوزیشن آئی۔ تو معاملہ یہ درپیش ہوا کہ اب آگے کہاں پڑھا جائے۔۔۔۔؟ جس کے لیے قریبی گاؤں چک ظاہر کے مڈل سکول کا انتخاب ہوا۔ جہاں کھیتوں کے درمیان سے کچے پکے راستے، پگڈنڈیاں جو کبھی کیچڑ، پانی تو کبھی شبنم سے لبریز ہوتیں ,ہمارے قدموں کے نشانوں کا ثبوت ٹھہرتیں۔

آٹھ دس سینیئر جونیئر لڑکیوں پہ مشتمل یہ قافلہ صبح تڑکے گھر سے پیدل نکلتا اور کپڑے کے سفید فلیٹس بچ بچا کے چلنے کے باوجود بھی روزانہ گندے ہو جاتے۔ جنھیں ہم سکول سے واپس آ کر روزانہ صاف کرتے اور ایک مائع قسم کی سفید پالش لگا کر رکھتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچی اس کیچڑ میں گر گئی تو اسے اکیلے ہی واپس گھر لوٹنا پڑتا۔

دوسرے گاؤں کے نئے سکول میں، جہاں ہر چیز منظم تھی۔ خوبصورت کلاس رومز، پیاری پیاری سی استانیاں، پھولوں سے سجی کیاریاں، عمارت کے بیچوں بیچ راہداریاں، اور سب سے بڑھ کر وہاں جب کلاس رومز میں ٹاٹ کی جگہ بینچز، پنکھے اور بلب بھی جلتے دیکھے، تو مانو ہمارے لیے وہ سکول گویا کیمبرج یا آکسفورڈ میں داخلے سے کم نہ تھا۔

جہاں داخلے کے وقت ہمارا اصلی سرٹیفکیٹ اور رزلٹ کارڈ لے لیا گیا تھا جو دوبارہ ہمیں کبھی نہیں ملا اور نیلی قمیض شلوار کی جگہ یہاں سفید شلوار قمیض ہمارے یونیفارم کی صورت میں سامنے آیا۔

مڈل سکول کی تعلیم ایک مکمل مختلف تجربہ تھا۔ مگر افسوس کہ پانچویں کلاس میں ہم صرف پانچ لڑکیاں تھیں۔ جن میں سے ایک نے چھوڑ دیا ایک اپنے ننھیال چلی گئی تو یوں ٹوٹل ہم تین کلاس فیلوز نے مڈل سکول میں داخلہ لیا جبکہ میٹرک کرنے کے لیے ہمیں تیسرے گاؤں جانا پڑا جو ایک میل کی پیدل مسافت کے بعد ایک کلومیٹر تانگے کا راستہ تھا۔ اکثر صبح سویرے تانگہ نہ ملنے کی بنا پر وہ فاصلہ بھی ہمیں پیدل ہی طے کرنا پڑتا۔ مگر لگن تھی کہ کچھ بھی ہو جائے پڑھنا ضرور ہے۔ جس میں میرے والد حافظ منظور احمد صاحب کا سب سے اہم رول تھا جو ہر موڑ میرے سر پہ سایہ بن کے رہے اللہ پاک ان کا سایہ ہم بہن بھائیوں پہ سلامت رکھے آمین

ہم تینوں کلاس فیلوز اپنے ہی گاؤں کی تھیں اس لیے وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ہماری استانیاں جنھیں ہم باجی جی کہتے تھے ماشاءاللہ بقید حیات ہیں آج بھی ملاقات ہو تو ہم انھیں باجی جی کہتی ہیں۔ پرائمری تعلیم مکمل ہوئے ایک بہت طویل عرصہ گزر چکا۔ اگر یہ سوچوں کہ زندگی میں کیا پایا تو لگتا ہے کچھ بھی نہیں کر پائی، اور اگر وہاں اس زیرو پوائنٹ سے شروع کروں تو لگتا ہے اس راہ پر آشوب کو پتوار ہم نے بھی دی ہے۔ اب تو ہر دوسری بچی یونیورسٹی پہنچ رہی ہے مگر میرے پرائمری سکول کے حالات وہی ہیں۔

## سندھی کی استانی پھل لے کر میری عیادت کے لیے آئیں

**انجم جاوید۔ شاعر۔ نثر نگار، محکمہ ڈاک سے ریٹائرڈ۔ کراچی**

میں نے ابتدائی پرائمری تعلیم پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک دو اسکولوں میں حاصل کی۔ یہ غالباً 1968 کی بات ہی ہوگی جب میرے والدین نے گھر کے قریب ہی واقع ایک سرکاری اسکول گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول چنیسر نمبر ایک واقع کالا پل ہزارہ کالونی کراچی میں داخل کیا۔ یہاں صرف چار جماعتیں تھیں۔ ایک کمرہ جہاں بینچوں پر طلبا بیٹھتے تھے یہ اسکول صبح میں طالبات جبکہ دوپہر کی شفٹ طلبا کے لیے تھی کمرے کے ساتھ ایک صحن جس میں واش روم بھی تھا بس یہ کُل کائنات تھی اس اسکول کی اور آج بھی یہیں تک محدود ہے البتہ کمروں کی ترتیب۔ مرکزی گیٹ میں، صحن میں تعمیرات کے بعد تبدیلی آئی ہے اساتذہ کی تعداد بڑھی ہے۔

یہاں ایک ہی استاد مقرر تھے جناب شمس الدین۔ وہی سب کچھ تھے۔ چھوٹا درمیانہ قد۔ چھریرا بدن۔ ہمیشہ سفید شلوار قمیص پہن کر آتے۔ شلوار لکھنوی انداز کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی۔ وہ زمانہ انتہائی مخلص اور شعبے سے جان و دل کی گہرائیوں سے منسلک رہنے والے اساتذہ کا تھا۔ شمس الدین ایسی ہی شخصیت تھے۔ بہت لگن سے توجہ سے پڑھاتے تھے۔ میں نے کلاس اوّل سے کلاس چہارم تک ہر سال پہلی پوزیشن حاصل کی۔ جب رزلٹ آؤٹ ہوتا تو پوری کلاس میں سب سے کوتاہ قامت میں ہی تھا سو مجھے استاد شمس الدین صاحب بینچ پر کھڑا کر کے اعلان کرتے میں رزلٹ کارڈ لیتا اور سب سے پہلے اپنے ابو محمد ایوب کو پھر والدہ کو بتاتا بس ادھر جلیبیاں امی منگواتیں دعا کرتیں پورے محلے میں تقسیم ہوتیں کہ میرا بچہ پاس ہو گیا ہے کچھ شرارتی لڑکے نعرے بازی بھی کرتے کہ ''ماسٹر شمس الدین۔ گھڑی میں بجے ساڑھے تین''۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ ہاف ٹائم میں ہی سائیکل سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اسکول کے ساتھ ہی عید گاہ گراؤنڈ میں۔ تو پیریڈ لگ گیا ایک ایک طالب علم پر استاد کی نظر تھی ہاتھ میں پتلی سی چھڑی لیے آئے اور پہلی اور آخری بار ان کے ہاتھوں پٹائی ہوئی۔ سائیکل کہاں گری ہم کہاں گرے۔ بات یہاں تک ہی محدود نہیں رہی انہوں نے میرے ابو کو بلا کر شکایت کر دی۔ میرے ابو کے دونوں بازو ایک ریلوے حادثے کی وجہ سے کٹ چکے تھے انہوں نے پاؤں کا استعمال کیا مجھے فٹ بال سمجھا۔ سو یہی وجہ ہے کہ میں آج تک سائیکل نہ موٹر سائیکل چلانے کی ہمت کر سکا۔ چوتھی جماعت میں اول آنے کا کارڈ میں ابو جی کو نہ دکھا سکا کیونکہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ اب سوال پیدا ہوا پانچویں جماعت میں داخلے کا۔ تو کسی نے مشورہ دیا کہ پاکستان ریلوے اسکول میں داخلہ لے لیں۔ وہاں مجھے میرے ایک عزیز لے گئے ساتھ ہی اس وقت کی ہیڈ مسٹریس محترمہ زاہدہ صاحبہ کو بتایا کہ میرے والد پاکستان ریلوے میں ملازمت کرتے تھے ان کی سروس کا سرٹیفکیٹ بھی ان کو دے دیا گیا پھر بھی باقاعدہ ٹیسٹ لیا گیا۔ مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ ہمارا ٹیسٹ ایک بہت ہی سحر انگیز۔ دل کش استانی جو بہت طریقے سلیقے سے ساڑھی پہنے ہوئے تھیں میڈم مہر النساء نے لیا۔ ٹیسٹ دے کر

میں کینٹین کی طرف گیا کہ کچھ دیر بعد میرا نام پکارا گیا۔ میڈم مہر النسا کے سامنے پیشی ہوئی انہوں نے ایک ہی سوال کیا کہ کیا یہ پرچہ تم نے لکھا ہے تمہاری تحریر ہے پھرانہوں نے اسی کاپی پر مجھ سے چند سطور لکھوائیں یہ پہلا تجربہ تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ میری رائٹنگ انہیں پسند آئی۔ یہاں مقابلہ سخت تھا بہرحال داخلہ ہوگیا۔

پانچویں جماعت اس ادارے سے حاصل کرنے کے بعد سیکنڈری تعلیم بھی پاکستان ریلوے اسکول کراچی کینٹ سے حاصل کی لیکن اب مخلوط تعلیم ختم۔ لڑکیاں صبح میں۔ ہم لڑکے دوپہر کی شفٹ میں۔ میڈم زاہدہ اور میڈم مہر النسا سے میں میٹرک تک ملتا رہا ان کی دعائیں لیتا رہا۔ یہاں میں ایک سندھی ٹیچر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پانچویں جماعت میں ایک فربہ درمیانہ قد و قامت کی استانی ہمیں سندھی پڑھاتی تھیں نام ان کا یاد نہیں۔ میں بیمار ہوگیا میری دادی، میری بیماری کی درخوست لے کر گئیں تو یہ واحد ٹیچر تھیں جو میری دادی کے ساتھ میرے گھر آئیں تیمارداری کی۔ پھل لے کر آئیں جاتے ہوئے رقم دے کر گئیں کہ اس سے دودھ پینا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جہاں بھی ہیں دونوں جہانوں کی سرفرازی دے۔ آمین۔

2۔ مضامین چوتھی جماعت تک محدود تھے۔ تختی اُردو کا قاعدہ۔ حساب وغیرہ۔ پانچویں جماعت میں، میں نے 1973 میں کلاس میں نمایاں نمبروں سے پاس کی۔

3۔ قاعدے۔ کتابیں اب یاد ہیں تو اتنی کہ کتابوں کا بوجھ نہیں ہوتا تھا صرف 4 کتابیں 4 کاپیاں اور تختی لازمی ہوتی تھی ساتھ میں تراشا ہوا سرکنڈے کا قلم ایک دوات جس میں سیاہی گھول کر ہم خود سیاہی بناتے تھے۔ کلاس میں جاتے تو ہوم ورک میں دیا گیا کام تختی پر لکھ کر لے جاتے۔ استاد دیکھتا پھر گاچی سے تختی کو دھوتے صاف کرتے باہر صحن میں دھوپ میں رکھتے خشک ہوجاتی تو استاد بلیک بورڈ پر لکھتا ہم اس وقت دیکھ کر تختی پر لکھتے۔ کپڑوں پر بھی سیاہی لگتی واپس آتے تو امی کا پہلا کام انہیں دھونا ہوتا تھا اور ہمارا کام تختی کو صاف کر کے گاچی لگا کر رکھنا اگلے دن کے لیے۔

4۔ میں نے صرف ایک بار استاد سے چھڑیوں کی مار برداشت کی جب میں سائیکل چلا رہا تھ اور کلاس سے غائب تھا بس ایک ہی بار کا یہ واقعہ۔ نہ پھر مار پڑی نہ سائیکل چلانا سیکھی۔

5۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے سفید شرٹ خاکی پتلون تھی۔

6۔ لنچ لے کر کبھی نہیں گیا تو کھانا کھا کر اسکول جاتا تھا چونکہ دوپہر کی شفٹ تھی البتہ پانچویں میں صبح کی شفٹ میں پڑھا تو اسکول نزدیک تھا گھر آکر کھالیا کرتا تھا۔

7۔ پرائمری تک اسکول کے آس پاس کہیں بھی کسی قسم کا کوئی ریڑھی استاد لگانے ہی نہیں دیتے تھے کہ یہ مضر صحت ہے۔ البتہ عید گاہ گراؤنڈ میں جو چیزیں بکتی تھیں ان میں سب سے زیادہ ایک ایسی کئی خانوں والی ریڑھی ہوتی تھی جس مصالحے دار اشیا کھٹی میٹھی چٹنی۔ میٹھا گلوکوز۔ پھر چھولے اور شکر قندی کی ریڑھیاں تھیں۔ مگر اسکول سے کافی ہٹ کر۔ پھر ایک اور ریڑھی تھی یہ سینما شو ہوا کرتا تھا پیسے دے کر ایک سوراخ سے آنکھیں لگا لیتے اندر شٹر گرتے ہر بار کوئی نیا منظر۔

8۔ کسی کلاس میں کبھی فیل نہیں ہوا۔

9۔ پانچویں جماعت میں پانچویں پوزیشن۔

10۔ پہلی سے چوتھی تک کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت زبانی نتیجہ دے کر اگلی کلاس میں پروموٹ کر دیا جاتا تھا لیکن پانچویں جماعت کا کارڈ سے میٹرک تک کارڈ۔ سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

11۔ غیر نصابی سرگرمیاں صرف پانچویں جماعت میں کرائی گئیں گراؤنڈ موجود تھا لہٰذا فٹ بال کھلایا گیا۔ رسی کھینچنے کے مقابلے میں بھیجا گیا۔ اسکاؤٹ کا ممبر بنا کر کیمپ میں گیا یہ سلسلہ اسکاؤٹ والا میٹرک تک جاری رہا۔

12۔ پرائمری کلاسوں کے کچھ طالب علم جو اس وقت بھی عمر میں مجھ سے زیادہ تھے۔ ان میں سے دو کالا پل پر رہتے ہیں برائے نام تعلق۔ ان کی طرف سے گرم جوشی کبھی نہیں رہی ان کے ساتھ پڑھائی کا تعلق صرف کلاس چہارم تک رہا پھر اسکول۔ راہیں بدل گئیں۔ ان میں سے بیشتر کی تعلیم وہاں ہی رک گئی۔

13۔ ذریعہ تعلیم اُردو میڈیم تھا۔

14۔ جہاں تعلیم کلاس چہارم تک حاصل کی اس کا حدود اربع چھوٹا تھا ساتھ ہی عید گاہ گراؤنڈ تھا یہاں ہی ہم کھیلتے تھے لیکن اساتذہ بہت کم کھیل کی طرف متوجہ کرتے ساری توجہ صرف پڑھائی تک رہتی ٹیچر بھی صرف ایک ہی تھا البتہ ریلوے اسکول کی کلاس پنجم میں بہت کھلا گراؤنڈ موجود تھا جہاں جو کھیلنا چاہے کھیل سکتا تھا۔

15۔ فرنیچر تھا لکڑی کے بینچوں پر بیٹھتے تھے۔

16۔ کلاس اوّل سے کلاس چہارم تک مسلسل تختی لکھی۔ تختی۔ تراشا ہوا سرکنڈے کا قلم۔ بلیڈ۔ کالی سیاہی۔ بوتل۔ سیاہی کی پڑیاں یہ سب ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ گاچی بھی دھوئی کئی بار اسکول ہی میں لکھا جو دھو کر گاچی لیپیٹ دی سوکھ گئی تو پھر اس پر دوبارہ سے لکھنا شروع کر دیا۔

## ایک ہم جماعت منصور نے خود ہی فیس بک پر تلاش کیا

### فہیم صدیقی۔ سینئر صحافی۔ اینکر پرسن۔ کراچی

پرائمری تعلیم کراچی سے ہی حاصل کی ناظم آباد میں چھوٹا میدان کے قریب ریل کی پٹری کے ساتھ ہی سن رائز کے نام سے اسکول تھا یہ ان اسکولوں میں سے ایک تھا جنہیں نیشنلائز کر لیا گیا تھا

1983 میں پرائمری کی تعلیم مکمل کی اور ناظم آباد میں ہی واقع گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا

مضامین صحیح تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ انگریزی نہیں پڑھائی جاتی تھی انگریزی کی کتاب پہلی بار چھٹی جماعت میں سامنے آئی

اردو اور ریاضی جسے اس دور میں حساب کی کتاب کہا جاتا تھا وہ یاد ہیں مزید کوئی کتاب یا قاعدہ یاد نہیں آرہا ہاں البتہ یہ یاد ہے کہ پہلے تختی تھی پھر سلیٹ آگئی تھی جس پر لکھنا سکھایا جاتا تھا

پرائمری تعلیم کے دوران اساتذہ سے کئی بار مار کھائی کئی بار مرغا بنے کئی بار دیوار کے ساتھ کھڑے کر دیے گئے ڈانٹ بھی پڑتی تھی کیونکہ ہم کوئی بہت لائق طالب علم تو نہیں تھے اوسط درجے کے طلبہ میں شمار ہوتا تھا اس لیے جو کلاس میں دیگر طلبہ کے ساتھ ہوتا تھا وہ عموماً ہمارے ساتھ بھی ہوتا تھا

یونیفارم کا یاد ہے کہ ابتدا میں اورنج اور وائٹ کلر کا شارٹ اور اوپر اورنج کلر کی شرٹ ہوا کرتی تھی لیکن یاد آرہا ہے کہ بعد میں وہ پینٹ شرٹ میں بدل گیا تھا

گھر سے لنچ کچھ نہیں ملتا تھا ناشتہ کر کے 8 بجے اسکول پہنچتے تھے 12 بجے چھٹی ہوجاتی تھی اور لنچ گھر آکر ہی کیا کرتے تھے

پانچویں کلاس میں نمبر کتنے آئے تھے یہ تو صحیح یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ گورنمنٹ کراچی بوائز

سیکنڈری اسکول ناظم آباد نمبر 5 میں داخلہ آسانی سے ہوگیا تھا جہاں داخلے کیلئے لمبی قطاریں لگا کرتی تھیں

کچھ عرصے پہلے تک تو پرانے کاغذات میں پرائمری کا کوئی ڈاکومنٹ نظر آیا تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ وہ مارکس شیٹ تھی یا کوئی سرٹیفکیٹ

پرائمری تک غیر نصابی سرگرمیوں میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا ہم تماش بین قسم کے طالبعلم تھا البتہ سیکنڈری میں آنے کے بعد اسکاوٹنگ سے لے کر بیت بازی ،تقریری مقابلے اور ٹیبلوز وغیرہ میں حصہ لیا

پرائمری کلاس کا ایک ہم جماعت یاد ہے منصور نام کا کبھی کبھی بات بھی ہو جاتی ہے اس نے خود ہی ہمیں فیس بک پر تلاش کیا تھا وجہ صرف پرائمری اسکول کا ہم جماعت ہونا نہیں تھا بلکہ وہ والدہ کی دوست کا بیٹا بھی تھا

اسکول ہمارا اردو میڈیم تھا

اسکول کی بلڈنگ بہت چھوٹی سی تھی جس میں پلے گراونڈ کوئی نہیں تھا البتہ درمیان میں ایک بڑا سا دالان نما کمرہ تھا جس میں اسمبلی ہوا کرتی تھی

اسکول میں ابتدا میں ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے لیکن بعد میں فرنیچر آ گیا تھا

(یہ انٹرویو بھی بتوسط پروفیسر شاداب احمد صدیقی بیورو چیف 'اطراف' حیدر آباد)

# چاک سلیٹ آئی ۔تختیاں غائب ہوگئیں

**احمد جاوید ۔سینئر صحافی ۔دانشور جامعہ نگر نئی دہلی بھارت**

1-میری پرائمری تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری اردو مکتب میں ہوئی ۔یہ 1970 کی دہائی کے نصف اول کا زمانہ تھا۔ بہار کی حکومت نے 1960 کی دہائی میں ریاست کی اردولسانی آبادیوں میں اردو میڈیم پرائمری کھولے تھے جو گورنمنٹ پرائمری اردو مکتب کہلاتے ہیں۔ یہ اسکول ان ہی میں سے ایک تھا۔اس وقت ہمارے یہاں پرائمری کی چار جماعتیں ہوتی تھیں اور اساتذہ دو تھے ماسٹر عبدالمجید اور محترمہ زبیدہ خاتون۔عربی، فارسی اور دینیات پڑھانے کے لیے میرے والدین نے ایک اور معلم (حافظ محمد سلطان) کی خدمات حاصل کی تھیں۔

2-اسکول میں تیسری جماعت تک اردو زبان ،حساب اور اخلاق ومعاشرت کی تعلیم داخل نصاب تھی۔ مسلم بچوں کو ہمارے یہ اساتذہ قرآن بھی پڑھاتے تھے جو ان کی ذمے داری میں شامل نہیں تھا۔چوتھی جماعت میں ہندی اور انگریزی زبانیں بھی داخل نصاب تھیں۔

3-نصاب کی سرکاری کتابیں تو شمع اردو، ہمارا سماج، علم الحساب، انگلش پرائمر اور منوہر پوتھی وغیرہ تھیں لیکن اردو زبان وادب کی تعلیم کے لیے عموماً عملی طور پر انجمن حمایت اسلام لاہور کی روایتی درسی کتب" اردو کا قاعدہ"،"اردو کی پہلی کتاب"، دوسری کتاب، تیسری کتاب اور"اردو کی چوتھی کتاب" پڑھائی جاتی تھی اور ہمارے اساتذہ نے بھی یہی کیا۔کہیں کہیں مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو کی دوسری تیسری، چوتھی اور پانچویں کتاب بھی پڑھاتے ہیں۔

4-ہمارے اساتذہ چھڑی تو ضرور رکھتے تھے لیکن اس کا استعمال کبھی کبھار صرف بہت زیادہ شریر اور اسکول سے بھاگنے والے بچوں پر کرتے تھے۔

5-یونیفارم متعین نہیں تھی۔

6-لنچ کے وقفہ میں بچے اپنے گھروں کو جا کر کھانا کھاتے تھے۔

7-گاؤں کی دکانوں میں صرف بسکٹ اور ٹافیاں ملتی تھیں۔آئیس کریم اور مٹھائیاں فروخت کرنے والے اپنے خوانچے کے ساتھ دوپہر کو پھیری لگاتے تھے۔حلوئی خواتین مڑمڑے، چھولے اور لائی وغیرہ لے کر آتی تھیں۔

8-میں کسی جماعت میں فیل نہیں ہوا اور چونکہ عمر کی حد مقرر نہیں تھی، اس لیے صرف 8 سال کی عمر میں چار جماعتیں پڑھ کر مڈل اسکول پہنچ گیا جہاں ہمارے دورے ہم سبق کم از کم دو سال بڑے تھے اور بعض تو چار پانچ سال بڑے بھی تھے۔

9-یہ تو یاد نہیں کہ نمبر کتنا تھا، ہاں یہ یاد ہے کہ پرائمری اسکول کی چوتھی جماعت کے امتحان میں پورے اسکول میں اول آیا تھا جبکہ 5ویں میں کلاس اور مدرسے میں بھی سیکنڈ ٹاپر تھا۔ مجھ سے زیادہ مارکس ہمارے ایک ہم سبق ساتھی محمد حسنین نے حاصل کیا ہے۔

10-پرائمری کی مارکس شیٹ سنبھال کر نہیں رکھی۔سرٹیفکیٹ مڈل اسکول میں جمع کرنا پڑتا تھا۔8ویں جماعت کی سند اور مارکس شیٹ سنبھال رکھی ہے۔یاد آتا ہے کہ اس کے 8 مضامین کے 11 پرچوں میں 712 نمبر ملے تھے۔

11-کھیل کود کے مقابلے، بیت بازی اور ڈبیٹ میں حصہ لیتا تھا۔کبڈی اور فٹ بال میرے پسندیدہ کھیل تھے۔

12-پرائمری درجات کے ساتھی خوب یاد ہیں۔اکثر سے رابطے بھی ہیں۔ہم سب کے سب ایک چھوٹے سے گاؤں کے باشندے تھے۔خاص خاص موقع سے ملاقات بھی ہوتی رہتی ہے۔

13-ہمارا پرائمری اسکول اردو میڈیم اسکول تھا۔

14-اسکول کی عمارت دو کمرے ایک برآمدے پر مشتمل تھی۔کھیل کا میدان بھی تھا۔

15-بیٹھنے کے لیے ٹاٹ اور دریاں ہوا کرتی تھیں۔کتاب رکھنے کے لیے سامنے ڈیسک ہوتے تھے۔

16-لکھنے کی مشق کے لیے ابتدا کے ایک دوسال تختیاں ہوا کرتی تھیں لیکن ان ہی دنوں چاک سلیٹ متعارف کرائی گئی اور پھر اسکول سے تختیاں بالکل غائب ہوگئیں۔ ❁

## آئندہ ماہ

## میں نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟

انتہائی دلچسپ معلوماتی سلسلہ

درج ذیل کرم فرماؤں کے مضامین تیار ہیں مگر جگہ کی تنگی کے باعث یہ نومبر میں شامل اشاعت ہوں گے۔

❁ڈاکٹر انور شاہین۔ کراچی۔ ❁نذیر خالد۔ بحریہ ٹاؤن لاہور۔ ❁جبار مرزا۔ اسلام آباد۔
❁صدام ساگر۔ گوجرانوالہ۔ ❁شاعر ایڈووکیٹ شہزاد نیاز کراچی۔ ❁پروفیسر ڈاکٹر عظمیٰ فرمان۔ کراچی یونیورسٹی۔ ❁احمد حاطب صدیقی۔ اسلام آباد۔ ❁رانا محمد شاہد۔ بورے والا۔
❁ڈاکٹر رضوانہ انصاری۔ حیدر آباد۔ ❁حفیظ اللہ خان۔ قندھاری بازار چمن بلوچستان۔
❁ڈاکٹر انعام الحق جاوید۔ ممتاز شاعر۔ میڈیا ڈائریکٹر محتسب اعلیٰ اسلام آباد۔
❁اشفاق بدایونی۔ جدہ سعودی عرب۔ ❁دانش مہدی۔ صنعت کار (حیدر آباد)۔
❁سحر محمود۔ ملتان۔ ❁پروفیسر نزہت پروین۔ بحریہ ٹاؤن کراچی۔ ❁طارق محمود۔ ساہیوال۔
❁سید ارتقا احمد زیدی۔ مصنف۔ سابق جوائنٹ سیکرٹری حکومت پاکستان اسلام آباد۔
❁سیم انجم۔ مصنفہ۔ ناول نگار کراچی۔ ❁سعدیہ سیما۔ مصنفہ "امی" کراچی۔

پاکستان کی سینئر ترین صحافی۔دانشور۔جناب حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی گفتگو پاکستان اور بیرون پاکستان کی سنجیدہ حلقوں میں زیر بحث ہے۔ڈاکٹر سید جعفر احمد پاکستان کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس حوالے سے ان کے سوالات سے تاریخ کی بہت سے گوشے بے نقاب ہو رہے ہیں۔پاکستان کی مختلف نسلوں کے سامنے پھیلی دُھند چھٹ رہی ہے۔پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

# ’پنجاب پنچ‘ کے 36 شُمارے نکلے۔بھٹو نے 1972 جنوری میں اسے بند کیا

## پاکستان کے سینئر ترین صحافی۔شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سرکردہ رہنما حسین نقی سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی خصوصی گفتگو

قسط نمبر 4

ہم نے ہفت روزہ ’پنجاب پنچ‘ کے لیے ڈیکلیریشن کی درخواست دے دی۔اس دوران مسرور حسن خان جو حیدرآباد کے کمشنر رہ چکے تھے وہ ویسٹ پاکستان کے ہوم سیکریٹری ہو کر لاہور آگئے۔اس وقت جنرل عتیق الرحمن صاحب گورنر تھے جن کا تعلق الہ آباد سے تھا۔اُس دن وہ ایک پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ہوم سیکریٹری وہاں موجود تھے۔مسرور حسن خان کو یہ پتہ تھا کہ بھٹو سے تو میرے ذاتی مراسم بھی تھے، الیکشن ہو چکے تھے اور بھٹو اب مقتدر ہونے والے تھے۔ میں نے ان سے گورنر ہاؤس ہی میں کہا کہ دو مہینے سے ڈیکلیریشن کے کاغذ پر دستخط نہیں ہوئے ۔وہ جواباً بولے آج ہی آ کر لے جاؤ۔اب بہرحال انہوں نے دستخط کر دیے تھے اور ڈیکلیریشن ڈپٹی کمشنر نے جاری کر دیا۔مسرور حسن خان صاحب بہت مہذب آدمی تھے، میرے والد کی وفات کی خبر سن کر تعزیت بھی کرنے آئے تھے۔بہرحال ’پنجاب پنچ‘ نکلنا شروع ہو گیا۔

**’پنجاب پنچ‘۔فوجی زیادہ خریدتے اور پڑھتے تھے**

سوال: کیا آپ کو یاد ہے کہ ’پنجاب پنچ‘ کس تاریخ کو نکلا تھا؟

جواب: یہ ۱۹۷۱ء میں نکلا تھا۔لیکن اس کے کُل چھتیس شمارے ہی نکلے اور وہ چار مرتبہ بند ہوا، وہ انگریزی کا ویکلی اخبار تھا۔

سوال: بھٹو نے ۱۹۷۲ء کی جنوری یا فروری میں اسے بند کیا اس کا مطلب ہے کہ ۱۹۷۱ء کے وسط میں نکلا ہو گا۔

جواب: اس وقت پنجاب کے گورنر اور ڈپٹی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ملک غلام مصطفی کھر تھے۔انہوں نے مارشل لاء آرڈر کے تحت اس پر پابندی لگائی۔اس کی فروخت بہت ہوتی تھی ۔فوجی بہت زیادہ خریدتے تھے کیونکہ اس میں سویلین مارشل لاء پر بہت تنقید ہوتی تھی ۔ زِم کا کالم لازمی آتا تھا۔مسعود اللہ خان اپنے کالم 'Porcupine' کے نام سے لکھتا تھا۔

سوال: مظفر قادر کون تھے؟

جواب: یہ صفدر میر صاحب کے شاگرد تھے اور ایک سابق ڈپٹی کمشنر تھے۔جب ان کو بہت سے افسروں کے ساتھ بھٹو صاحب نے ملازمت سے نکال دیا تو ان کے ایک دوست نے ’پیکال پرنٹرز‘ کے نام کا پریس ان کو دے دیا تھا ۔بعد میں مظفر قادر نے ڈیکلریشن اپنے نام پر کروالیا تھا۔ان کے والد سی اے قادر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلاسفی پڑھاتے تھے جبکہ صفدر میر صاحب انگریزی، اور وہ میر صاحب کے colleague تھے۔سی اے قادر صاحب بعد میں یونیورسٹی میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ بھی رہے۔ مجھے صفدر میر صاحب، مظفر قادر کے پاس لے گئے کہ یہ تمہارا پرنٹر ہوگا۔تو جب ہم نے بحیثیت پبلشر ’پنجاب پنچ‘ کا ڈیکلریشن بھرا تو مظفر قادر نے پرنٹر کا ڈیکلیریشن فوراً بھر دیا۔اس کا پہلا شمارہ ایک دو روز میں ہی بِک گیا۔مظفر صاحب نے کہا کہ میں پرنٹنگ کروں گا اور اس کی ایڈورٹائزمنٹ سے ہی پیسے لے لیا کروں گا یعنی پرنٹنگ کی اجرت اشتہارات سے وصول کریں گے۔ابھی پانچ ہی شمارے نکلے تھے کہ سرکار نے وارننگ دے دی کہ اس کو کوئی اشتہار نہیں ملے گا۔تب انہوں نے پرنٹنگ کے پیسے بھی لینا شروع کیے۔ہمیں اب ان کے پیسوں کا بھی انتظام کرنا پڑتا

تھا۔ 'پنجاب پنچ' میں کئی لوگوں کے پیسے لگے تھے۔ سب سے پہلا انویسٹمنٹ خدیجہ گوہر کا ہی تھا۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے واقعے کی وجہ سے نیوز پرنٹ ایک دم مہنگا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سجاد جس کی نیوز پرنٹ ایجنسی تھی انہوں نے بھی کافی مدد کی اور کہا کہ جتنے پیسے ہیں لے آؤ ورنہ بعد میں نیوز پرنٹ ملنا مشکل ہوگا۔ بہرحال نیوز پرنٹ کا بھی بندوبست ہو گیا۔ ہمارا اخبار اب خوب بکنا شروع ہوا۔ کہتے ہیں کہ واہ کینٹ میں دس روپے تک کی بھی اس کی کاپی بکی۔ پہلے کوئی بھی بڑا ایجنٹ لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک اخبار فروش جس کو ٹی بی بھی تھی اس کو میں نے ایجنٹ بنایا۔ اُس کے بعد سارے بڑے ایجنٹ کہتے تھے کہ ایجنسی ہمیں دے دو۔ بھارتی صحافی کلدیپ نیر، احمد بشیر کے ساتھ میرے گھر آیا تو کہنے لگا کہ اسلام آباد میں اس نے اخباروں کا گٹھا دیکھا ہے۔ تو پوچھا کہ یہ کون سا پرچہ ہے جو اتنا بکتا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ ہم دوست مل کر نکالتے ہیں اور میں اس کا پبلشر اور ایڈیٹر ہوں۔ پھر میں نے اسے ایک اخبار دیا وہ

**بھٹو کی جرنیلوں سے بات چیت کی ریکارڈنگ مجیب الرحمٰن کے پاس موجود تھی**

پڑھ کر کہنے لگا کہ یہ تو بہت شرارتی پرچہ ہے۔ وہ کہنے لگا کہ ویکلی اخبار تو پاکستان میں اتنے زیادہ نہیں بکتے۔ حالانکہ مختلف ادوار میں بڑے اچھے پرچے نکلے۔ 'آؤٹ لُک' بھی بکتا تھا اور اس کی سبسکرپشن بھی بہت تھی۔ مظہر علی خان صاحب اور آئی اے رحمٰن صاحب لکھنے کے پیسے بھی دیتے تھے۔ 'ڈان' زیادہ پیسے دیتا تھا۔ 'ڈیلی نیوز' کا ایڈیٹر واجد شمس الحسن تھا۔ یونیورسٹی میں ہم ساتھ ہی پڑھتے تھے، وہ انٹرنیشنل افیئرز پڑھتا تھا اور میں پولیٹیکل سائنس۔ ہماری بڑی اچھی دوستی تھی۔ وہ مجھ سے 'ڈیلی نیوز' کے لیے لکھواتا تھا بلکہ میں نے مظہر علی خان صاحب سے کہا بھی کہ وہ ڈھائی سو روپے دیتا ہے اور آپ پچیس روپے دیتے ہیں پھر بھی میں آپ کے یہاں لکھتا رہوں گا۔ پھر انہوں نے پچیس سے پچاس کر دیے۔ امین مغل صاحب بہت خوش ہوئے کہنے لگے صرف تمہارے نہیں بلکہ ہم سب کے پیسے بھی بڑھ گئے ہیں۔ مظہر علی خان صاحب نے 'ویو پوائنٹ' لاہور میں اپنی کچھ پراپرٹی بیچ کر نکالا۔ جب وہ پیسے ختم ہوئے تو بیگم طاہرہ مظہر کہنے لگیں میں اپنی کوئی زمین نہیں دوں گی، مجھے پتا ہے یہ پیسے ڈوبنے ہی ہیں۔

عاصمہ جہانگیر نے 'ویو پوائنٹ' آ کر آئی اے رحمٰن صاحب سے کہا کہ یہ اخبار صرف دو ہزار کے قریب چھپتا ہے اور اتنا بکتا بھی نہیں، آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ ہیومن رائٹس کمیشن سے بھی یہی دو کالم لکھ سکتے ہیں، آپ چلیں۔ کچھ عرصہ پہلے مبشر صاحب نے ہمیں کوئی ریفرنس بنانے کو دیا ہوا تھا تو رحمٰن صاحب بولے یہ سب چھوڑو اور 'ویو پوائنٹ' آ جاؤ۔ پھر میں بھی وہاں چلا گیا۔ رحمٰن صاحب نے جب 'ویو پوائنٹ' چھوڑ ا اور ایچ آر سی پی چلے گئے اس دوران میں نے جنگ گروپ کے لاہور سے شروع ہونے والے انگریزی روزنامہ 'دی نیوز' کو بحیثیت ایڈیٹر جوائن کر لیا۔

سوال: اچھا یہ ذرا آگے کی بات ہوگئی۔ 'پنجاب پنچ' کا کیا ہوا؟

جواب: بھٹو صاحب نے اپنے سویلین مارشل لاء کے دور میں اسے بند کروا دیا۔ اس عتاب اور ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ میں جب اُس وقت 'دی سَن' میں کام کر رہا تھا، شمیم احمد کا ایک دن فون آیا کہ نقی تم نے ڈھاکہ جانا ہے کیونکہ تم، مجیب اور بھٹو دونوں کو جانتے ہو۔ میں واقعی جانتا بھی تھا۔ شیخ مجیب ہم

PUNJAB PUNCH
E US ARMS
Lenin on ... land

سے دس برس پہلے کے پرانے اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ پھر وہ مادرِ ملت کے الیکشن میں یہاں کمپین کرنے آئے۔ اُس وقت میں نے نئی نئی رپورٹنگ شروع کی تھی۔ میری ان سے بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ یہاں سہروردی صاحب کی بیٹی (بیگم اختر سلیمان) کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ سلیمان صاحب میرے والد کے دوست کے بیٹے تھے۔ میرا ان کے گھر آنا جانا تھا غالباً ان کا الہٰ آباد سے تعلق تھا۔ اُس وقت وہ ایکسائز کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کوئی نوکری کرنی ہو تو مجھے بتانا۔ میں ان سے ویسے ملنے چلا جاتا تھا۔

شمیم احمد صاحب نے میری ڈھاکہ کے لیے فلائٹ کروادی۔ ہم 'سَن' کے لیے وہاں مجیب۔ بھٹو مذاکرات کور کرنے گئے۔ پتہ چلا کہ بھٹو، شیخ مجیب کے گھر ملنے پہنچ گئے ہیں۔ ہم بھی وہاں پہنچے۔ وہاں پہنچتے ہی شیخ مجیب نے ہمیں پہچان لیا۔ انہوں نے کہا اسے چائے پلاؤ، ویسے یہ میرے خلاف بھی لکھتا ہے۔ میں نے بھٹو صاحب کی موجودگی میں کہا کہ میں تو دونوں کے بارے میں لکھتا ہوں اور اس لیے لکھتا ہوں کہ پاکستان میں جمہوریت آنی چاہیے۔ وہاں بھٹو صاحب نے پریس کانفرنس میں کہا کہ میں نے چھ پوائنٹس میں سے پانچ پوائنٹس مان لیے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مجیب کو lynch کر دیں کیونکہ ابھی تو اقتدار میں بھی نہیں آئے اور ایک پوائنٹ سے دستبردار ہوگئے۔ پھر کہنے لگے ساڑھے پانچ پوائنٹس مانتا ہوں۔ میں نے کہا مگر پونے چھ بھی مان لیں گے تو کہنے لگے، ہاں پونے چھ بھی مانتا ہوں۔ میں نے کہا مگر پورے چھ پوائنٹس نہیں مانیں گے۔ وہاں ڈھاکہ میں معراج محمد خان بہت انقلابی تقریریں کر رہے تھے۔ وہ اور طارق عزیز بھٹو صاحب کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ یہ سب پی سی (ڈھاکہ) میں ٹھہرے ہوئے تھے میں بھٹو صاحب کے پاس گیا اور کہا کہ آپ لوگ جرنیلوں سے جو کچھ بھی بات کر رہے ہیں مجیب کے پاس ان سب کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ آپ فوج سے ان کو (عوامی لیگ، شیخ مجیب کو) نہ ڈرائیں، آپ کوئی مصالحت کی بات کریں لوگ بہت provoked ہیں۔ بات آگے نہ بڑھی اور بھٹو۔ مجیب مذاکرات ناکام ہوگئے۔

بعد میں بھی جب بھٹو ویسٹ پاکستان واپس آئے، میں ان کو کہتا تھا کہ آپ سے بہتر یہ کوئی نہیں جانتا کہ اب پاکستان نہیں بچے گا، تو وہ کہتے تھے کہ تم مجھے قیوم خان کی طرح treat کر رہے ہو۔ میں نے کہا کہ نہیں میں تو اس کو رپورٹ کرنے کی بھی نہیں جاتا اور آپ تو اتنے پڑھے لکھے انسان ہیں، تاریخ اور جغرافیہ سے واقف ہیں۔ پھر جو آپ کر رہے ہیں یہ کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟ میں نے مزید کہا کہ اول تو یہ ویسٹ پاکستان نہیں رہا کیونکہ یحییٰ خان کے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت سارے صوبے بحال ہو گئے تھے۔

اس دوران میں چار بار ان سے فلیٹیز ہوٹل میں ملا اور میں نے

بھٹو صاحب سے کہا کہ آپ کی اکثریت پنجاب میں ہے اور کچھ حد تک سندھ میں ہے، مگر بلوچستان اور سرحد میں نہیں ہے، تو آپ خود کو پورے ونگ کا نمائندہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر ویسٹ پاکستان ختم نہ ہوتا اور اس وقت آپ الیکٹ ہوتے تو پھر مانا جا سکتا تھا مگر آپ صوبوں کی اکثریت کی نمائندگی نہیں کرتے۔ تو آپ اب یہ بات نہ کریں، آپ کا حق نہیں کہ آپ مجیب سے مرکزی حکومت میں شیئر مانگیں۔

سوال: یہ ابھی آپ پی سی کی بات کر رہے تھے تو فلیٹیز کا ذکر کیوں آیا؟

جواب: بھٹو اس زمانے میں زیادہ وقت لاہور ہی میں رہتے تھے اور وہاں وہ فلیٹیز ہوٹل کے دو مخصوص کمروں میں ہی ٹھہرتے تھے۔ وہاں میں نے سب ہی لوگوں کو دیکھا۔ انٹیلی جنس کے بڑے ایکسپرٹ رضوی یہاں آتے تھے۔ رانا واسع بھی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے سرکاری لوگ یہاں آتے تھے جن کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ اس وقت فوج کا پبلک ریلیشنز افسر ایک میجر تھا۔ وہ بھی وزٹ کرنے روز آتا تھا۔ تو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ سے رابطے میں تھے۔

الیکشن سے پہلے کمپین کے دوران شیخ مجیب لاہور آئے تھے اور گول باغ لاہور میں تقریر بھی کی تھی۔ اس دوران مولانا بھاشانی بھی لاہور آئے اور انہوں نے بھی تقریر کی۔ میں نے بھٹو صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ بھاشانی صاحب کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان میں بھی الیکشن لڑیں۔ وہاں بہت سارے بہار سے آنے والے افراد پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔

سوال: مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہونے کے بعد وہاں کے عوامی لیگ کے بیشتر اراکین قومی و صوبائی اسمبلی نے جان بچا کر ہندوستان میں پناہ لے لی تھی۔ وہاں مغربی بنگال میں بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت بنالی گئی تھی۔ ادھر مشرقی پاکستان میں ان اراکین اسمبلی کی نشستوں پر ضمنی انتخاب کا اعلان ہوا تھا لیکن میری اپنی تحقیق کے مطابق عملاً بائی الیکشن نہیں ہوئے۔ سارے فیصلے بریگیڈیئروں اور سینئر افسروں کے دفتروں میں ہوئے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ سب شکست خوردہ جماعتوں کے نمائندوں کو بلا کر کسی ایک کے حق میں باقیوں کو بٹھوا دیا جاتا مثلاً جماعت اسلامی، پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (PDP)، اور پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو بلا کر کسی ایک کے حق میں باقیوں کو بٹھوا دیا جاتا، اور یوں کسی ایک کے بلا مقابلہ منتخب ہو جانے کا اعلان کر دیا جاتا۔ میں نے بیٹھ کر پورا حساب لگایا جب میں انگلینڈ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میں نے 'ٹائمز' اور 'گارڈین' کے سارے پرچے اور 'ڈان' اور 'پاکستان ٹائمز' بھی پڑھے۔ ان سب میں یہی لکھا ہوتا تھا کہ مثال کے طور پر بریگیڈیئر فلاں کے دفتر میں کھلنا کے فلاں حلقے میں ضمنی انتخابات کے امیدواروں کا اجلاس ہوا اور چار نمائندے بیٹھ گئے پانچواں، کہیں نورالامین کی جماعت کا تو کہیں جماعت اسلامی کا ہوتا تھا، وہ بلا مقابلہ جیت گیا۔ میں نے کہیں quote بھی کیا کہ پیپلز پارٹی کے رہنما عبدالحفیظ پیرزادہ نے ایک موقع پر بیان دیا کہ مغربی پاکستان میں جس تناسب سے ہمیں سیٹیں ملی ہیں، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے مقابلے میں، اسی تناسب سے ہمیں مشرقی پاکستان میں دی جائیں۔ یہ پیپلز پارٹی کا مطالبہ تھا۔

جواب: آپ نے بالکل ٹھیک سنا لیکن اسی بندر بانٹ کو بائی الیکشن یعنی ضمنی انتخاب کہا گیا تھا۔ اس سے پہلے جب عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان بات چیت چل رہی تھی، ایک موقع پر جبکہ بھٹو، پیرزادہ صاحب اور ڈاکٹر مبشر وغیرہ دوبارہ بات چیت کے لیے ڈھاکہ گئے ہوئے تھے، ایک دن بھٹو صاحب سے میری بحث ہو رہی تھی اور میں ان سے کہہ رہا تھا کہ عوامی لیگ کی فتح کو قبول کریں۔ اس وقت مبشر صاحب کسی جرنیل کے ساتھ ہیلی کاپٹر پر جا رہے تھے۔ وہ بھٹو کو بتانے آئے تھے کہ میں پتا نہیں کہاں جا رہا ہوں۔ اُس وقت میں نے بھٹو سے کہا کہ ان جرنیلوں سے آپ کا کوئی کام نہیں بنے گا، ہاں

**سہروردی کے ساتھ ہم نے کراچی کے سینما میں ایک فلم دیکھی**

یہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان ٹوٹ جائے، لیکن یہ نہیں ہوگا کہ آپ اقتدار شیخ مجیب کی عوامی لیگ کو نہ دیں، اور پاکستان باقی بھی رہے۔ لیکن اب بھٹو اور فوجی جرنیلوں کا گٹھ جوڑ واضح ہو چکا تھا۔

سوال: ۱۹۷۱ء میں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں آپ ان سے یہ بحث کر رہے تھے کہ وہ فوج کے ساتھ نہ چلیں۔

جواب: انہوں نے وہاں پریس کانفرنس بھی کی تھی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں۔

سوال: تو بھٹو صاحب کا کیا کہنا ہوتا تھا؟

جواب: ان کا کہنا یہ ہوتا تھا کہ آئین کا ڈھانچہ پہلے اُن سے طے کر لیا جائے۔ وہ کہتے تھے کہ بیوروکریسی اور فوج ان کے ساتھ تھی، جس سے شیخ مجیب کو ڈراتے تھے۔ تو میں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کو اکثریت ملی ہے۔ یہ الیکشن کے بعد کی بات ہے جب مجیب الرحمن کی لاہور میں تقریر بھی ہو چکی تھی۔ وہاں سے میری اور بھٹو کی ناراضگی ہوئی۔

الیکشن سے پہلے بھٹو صاحب نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ورکرز کو ٹکٹ دیں گے، مگر انہوں نے دونوں مرتبہ فیوڈلز کو ٹکٹ دیے۔ پہلے الیکشن میں بھی جو فیوڈل اُن کے ساتھ پارٹی میں آ گیا ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے اس کو ٹکٹ نہ دیا ہو۔ صادق حسین قریشی، مصطفیٰ کھر، غلام مصطفیٰ جتوئی ایک پوری فہرست ہے جنہیں ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ٹکٹ دیے گئے۔ ۱۹۷۷ء میں تو اور بھی زیادہ ٹکٹ ان کو دیے۔ صادق قریشی نے بھٹو کے لاہور کے جلسے میں نہ صرف پانی بھروا دیا تھا بلکہ اس میں سانپ بھی چھوڑ دیے تھے۔ میں نے کہا اُس صادق قریشی کو بھی آپ نے ٹکٹ دے دیا۔ میں ان کو کہتا تھا آپ نے اپنی کلاس کے تحفظ کے لیے یہ سب کیا۔ میں بڑے یقین سے کہتا ہوں کہ پاکستان توڑا ہی اس لیے گیا کہ شیخ مجیب کی وہ بات پوری نہ ہو سکے کہ وہ اقتدار میں آ کر فیوڈلزم ختم کریں گے۔ میری پاکستان بننے کے متعلق بھی رائے بدل گئی ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان بننے کے بعد مشرقی پاکستان میں ایک بھی سینٹرل ادارہ نہیں بنایا گیا۔ جبکہ پاکستان کی قرارداد بھی مشرقی پاکستان والوں نے پیش کی تھی۔ مغربی حصے کے بہت سے لوگوں نے بالکل آخر میں مسلم لیگ جوائن کی تھی۔ یونینسٹ پارٹی کے لوگ فیروز خان نون، قزلباش وغیرہ نے اس وقت مسلم لیگ کو جوائن کیا جب پاکستان کا قیام بالکل سامنے نظر آ رہا تھا۔

مشرقی پاکستان میں کیپٹل بنا نہ نیول ہیڈ کوارٹر، نہ ایئر فورس کا ہیڈ کوارٹر، نہ ہی پارلیمنٹ کی بلڈنگ، سب کچھ مغربی حصے میں بنا۔ ہاں، قائداعظم نے کم از کم ایک اخبار تو ضرور بند کروایا۔ عبدالسلام خورشید صاحب کہتے تھے کہ یہ جو تم نے لکھا ہے تو ایک بات ضرور کنفرم ہے کہ انہوں نے کوئی اخبار بند کیا جو کراچی سے نکلتا تھا۔

سوال: غیور الاسلام صاحب نے ایک موقع پر مجھے بتایا تھا کہ ۱۹۴۸ء میں ان کا پرچہ جو معیشت کے موضوع پر نکلتا تھا، وہ بند کیا گیا۔

جواب: جی جی، ابھی قائداعظم زندہ تھے۔ پھر انہوں نے ڈھاکہ جا کر تقریر کی اور کہا کہ صرف اردو قومی زبان ہوگی۔ بنگالی اردو سیکھیں، حالانکہ انہوں نے خود نہیں سیکھی تھی۔ جس سے بنگالی ناراض ہو گئے۔ ایک سرکاری عمارت جو ۱۹۷۰ء میں تیار ہوئی تھی جس میں ۱۹۷۱ء یا ۱۹۷۲ء میں قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہونا تھا اسے بھٹو نے ملتوی کرا دیا۔ وہاں اب بنگلہ دیش کی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بنگالیوں کو کچھ دینا ہی نہیں چاہتے تھے۔ امریکہ، برطانیہ کا اصل مقصد اگر سوویت یونین کو توڑنا تھا تو اس کے لیے تو مشرقی پاکستان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

سوال: آپ نے ذکر کیا تھا کہ سہروردی صاحب سے بھی آپ کی ملاقاتیں تھیں۔ یہ کب کی بات ہے؟ اُن سے کیا گفتگو آپ لوگوں کی ہوتی رہی؟

جواب: ان سے طالبعلم، سیاست کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ کراچی کے کیپٹل سینما میں ہم نے ان کے ساتھ 'پک وِک پیپرز' فلم دیکھی۔ وہاں ریستوران میں انہوں نے کافی بھی پلائی۔ وہ قومی اور بین الاقوامی پولیٹکس پر بات کرتے تھے۔ وہ سیکولر آدمی تھے۔ ان سے اختلاف بھی ہو گیا کہ جب

نہر سوئز پر حملہ ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ مسلم ممالک صفر جمع صفر برابر صفر ہیں۔ یہاں طلبہ نے جلوس بھی نکالا اور سوئز ڈے منایا گیا جس پر لاٹھی چارج ہوا۔ جلوس کے شرکاء نے وزیر اعظم کے خلاف بھی نعرے لگائے۔ کہا کہ حکومت کچھ نہیں کر رہی۔ نہ صرف لیفٹ کے لوگ بلکہ عوام بھی ان کے بہت خلاف ہو گئے تھے۔

## کوٹ لکھپت اور جہلم کا زمانہ اسیری

سوال: مشرقی پاکستان کے سانحے پر آپ نے فرسٹ ہینڈ انفارمیشن دی اور یہ بھی بتایا کہ بھٹو صاحب سے اختلاف کہاں سے ہوا اور اس کا جواب بھی مل گیا کہ کیوں انہوں نے 'پنجاب پنچ' پر ہاتھ ڈالا۔

جواب: اس وقت وہ سول چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے، مصطفیٰ کھر صاحب ڈپٹی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے پنجاب کے زون اے کے، ان کے آرڈر سے ہی 'پنجاب پنچ' بند ہوا۔ ہمارے دوست خالد حسن کو بھٹو صاحب نے پریس سیکریٹری بنایا تھا اور بعد میں ہٹا دیا۔ کہا کہ میری جگہ پر تم ہی بیانات دینے لگے ہو۔ اس وقت میں تو جیل چلا گیا تھا۔ خالد حسن نے میاں نظام دین کو جو 'پاکستان ٹائمز' میں ریفرنس سیکشن کے انچارج تھے، 'پنجاب پنچ' پر پابندی لگانے کی تجویز پر اپنے کمنٹ والے پیپر کی فوٹو کاپی دی۔ خالد نے ایک ایڈوائس لکھی تھی کہ یہ ایک مزاحیہ قسم کا پرچہ ہے اور اسے نوجوان بہت پسند کرتے ہیں تو اس کو بند کرنے کی ضرورت نہیں۔

سوال: خالد حسن اس وقت بھی بھٹو کے پریس سیکریٹری تھے؟

جواب: ہاں۔ صرف اسی وقت بھٹو نے ایک پریس کونسل بنائی تھی جس میں 'پاکستان ٹائمز' کے ایڈیٹر خواجہ صاحب بھی تھے، پیر علی محمد راشدی وغیرہ تھے۔ خالد حسن نے تو اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی۔ میں پرچہ بند ہونے سے پہلے اپنا موقف پیش کرنے گیا کہ مجھ پر اور 'پنجاب پنچ' پر غلط الزامات لگائے گئے تھے۔

پیر علی محمد راشدی کے بارے میں 'سندھ آبزرور' کے ایڈیٹر شرما کی کتاب میں دلچسپ تبصرہ شامل ہے۔ ہمارے ایک دوست جو کراچی میں کسٹم کے اپریزنگ ڈیپارٹمنٹ کے انچارج تھے، جو کہ خاص طور سے کتابوں کو چیک کرتے تھے، انہوں نے مجھے کہا کہ اس کتاب پر تم رائے لکھ دو کہ کیا اس کو بند ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس کے بند ہونے کی ذمہ داری مجھ پر آتی ہے کیونکہ میں نے جو رائے لکھی اس بنیاد پر انہوں نے اس کو بند کروا دیا۔ اس کتاب میں لکھا تھا کہ پیر محمد علی راشدی بہت سازشی انسان ہیں اور سندھ میں ان کی سازشوں کا بہت ذکر ہوتا تھا۔

بہر حال پیر صاحب اس کونسل کی میٹنگ میں موجود تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ پیر صاحب ۱۹۴۷ سے پہلے سے شروع کریں یا بعد سے۔ تو وہ کہنے لگے میں نے تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ جو کچھ بھی میں نے اسٹوری میں لکھا ہے وہ درست ہے۔ آپ پہلے اس کو کنفرم کروائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ آپ نے ہمیں کال کر لیا ہے۔ مگر ہمیں پتا ہے کہ مصطفیٰ کھر نے گورنر ہاؤس میں ناپسندیدہ حرکتیں کی تھیں۔

> **ایک طرف مشرقی پاکستان کا سوگ دوسری طرف شراب و شباب کی رات**

اس کے علاوہ بھی کئی اسٹوریز تھیں۔ 'لاڑکانہ بائی نائٹ' اسٹوری بھی 'پنجاب پنچ' میں چھپی جس کے بارے میں مجھے مقبول شریف نے بھی بتایا تھا جو اس وقت 'پاکستان ٹائمز' میں تھے۔ یہ وہ اسٹوری ہے جس میں بھٹو صاحب ایک طرف تو مشرقی پاکستان کا سوگ منا رہے تھے تو دوسری طرف شراب و شباب کی نائٹ منا رہے تھے۔ وہاں ڈیفنس سروسز کی بیگمات بھی تھیں اور ڈانس وغیرہ بھی ہوا۔ زِم نے اس کی ہیڈ لائن لگائی تھی۔ اُس سے اچھی ہیڈ لائن کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔ جب بھٹو اقتدار میں تھے اور

سویلین مارشل لاء تھا تبھی 'پنجاب پنچ' بند ہوا، مجموعی طور پر یہ کئی بار بند ہوا۔ کچھ کاپیاں ججوں کو پیش کیں اور کچھ میرے گھر سے لے گئے۔ یہ سب کچھ ان میں چھپا ہوا تھا مگر میرے گھر سے سب کاپیاں لے گئے۔ جس پر میں نے کہا تم لوگ تو علامہ اقبال کی سینسرڈ شاعری لے گئے ہو، قرآن کی آیات لے گئے ہو، سبھی کچھ تو لے گئے ہو۔

سوال: یعنی پھر 'پنجاب پنچ'، 'اردو ڈائجسٹ' اور 'زندگی' بند ہو گئے؟

جواب: ہاں اور اس کے بعد ہمیں گرفتار کر کے سول لائن اسٹیشن لے گئے۔ میں ابھی تک مجیب الرحمن شامی کو چھیڑتا ہوں۔ یہ جب آیا تو آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ میں نے اسے شرم دلائی اور پانی وغیرہ پلایا۔ اور کہا یہ دیکھو مظفر قادر جو ڈپٹی کمشنر رہا ہے، یہ بھی آ گیا ہے خود سر، اور برملا کہتا ہے کہ نقی صاحب میں پانچ پیگ لگا کر آیا ہوں۔ میں نے کہا آپ پہلے ایک ڈپٹی کمشنر تھے، اب اخبار کے پرنٹر ہو، اب اسٹیٹس بدل گیا ہے۔

مظفر قادر ہمارے ساتھ اس وقت سول لائن تھانے کی حوالات میں تھے تو چیف سیکریٹری افضل آغا تھے۔ صبح کا ناشتہ ان کے گھر سے آتا تھا۔ باقاعدہ بٹلر سرو کرتا تھا۔ کیونکہ ایک ڈپٹی کمشنر بھی ہمارے ساتھ حوالات میں تھے۔ بہر حال وہاں کافی سہولتیں دی گئی تھیں۔ اس وقت کوٹ لکھپت کی جیل ٹوٹی ہوئی تھی جہاں وہ جانگلی بھی قید تھے جنہیں مظفر قادر نے بطور ڈپٹی کمشنر ساہیوال ایف۔ سی۔ آر 14 کے تحت سزائیں دی تھیں۔ میں نے کہا کہ کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ہمیں بی کلاس الاٹ ہوا تھا۔ ایک میں ہم تھے، ایک میں یہ شامی وغیرہ تھے۔ میں نے مظفر قادر سے کہا کہ ایسا کرو ان سب لوگوں کی درخواستیں لکھ دو کیونکہ سزا ہوم سیکریٹری معاف کرتا ہے اور وہ آپ کا دوست بھی ہے، ان کو کہنا کہ ایک دو درخواست گزاروں کو چھوڑ دو۔ ایک دو چھوٹ بھی گئے۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ جس نے ہمیں سزا دی ہے وہی درخواست بھی لکھ رہا ہے۔ ایک قیدی اعظم پہلوان بھی قتل کے الزام میں جیل میں تھے۔ گنگا ہائی جیکنگ والے کشمیری جب لائے گئے اور لاہور ایئرپورٹ پر وہ جہاز سے باہر آئے تو بھٹو صاحب نے لاہور میں ان کا جلوس نکلوایا ہیروز کے طور پر۔ اس جلوس میں پیپلز پارٹی کے لیڈرز بھی شامل تھے۔ بھٹو صاحب نے بعد میں ان کشمیریوں کو انڈین ایجنٹ قرار دے دیا اور لاہور قلعے کے عقوبت خانے میں ان کی کھال ادھیڑ دی گئی تھی۔ یہ کشمیری مقبول بٹ، ہاشم اور اشرف تھے۔ اشرف کو کم مار پڑی وہ آزاد کشمیر کی جمعیت کا رکن تھا۔ بہر حال یہ ہائی جیکنگ میں شامل تھے۔ جب بطور انڈین ایجنٹ ان کو سزا ہوئی اور یہ قلعے سے جیل منتقل ہوئے، اس صبح اعظم پہلوان کو مجیب

الرحمن شامی نے کہا کہ ملک دشمن آرہے ہیں ان کی ذرا خاطر کرنی ہے۔ اعظم پہلوان باہر ٹہل رہے تھے۔ میں بھی وہاں ٹہلتا تھا تو میں نے اعظم سے کہا کہ آپ ڈیوڑھی کی طرف کیوں جارہے ہیں؟ وہ کہنے لگے کچھ 'مہمان' آرہے ہیں ان کی 'مہمان نوازی' کرنے جارہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کون؟ تو کہنے لگے وہ جو ملک کے غدار ہیں، ہندوستانی ایجنٹ اور گنگا ہائی جیک کرنے والے۔ میں نے کہا کہ آپ کو پتہ ہے ان کا تو بھٹو صاحب نے بطور ہیروز جلوس نکلوایا تھا۔ کہنے لگے آپ کے دوست ہی نے مجھے آرڈر کیا ہے۔ میں پھر اعظم پہلوان کو وہاں سے لے آیا۔ میں نے شامی سے کہا کہ ہم سب پر جو وارنٹ لگا ہے اور تم پر بھی، وہی ان کشمیریوں پر لگا ہے۔ 124.A تو نہ ہم نہ یہ غدار ہیں۔ اب بھٹو کی یہ سیاسی ضرورت ہوگئی ہے کہ ان پر پاکستان دشمنی کا الزام لگائے۔ 'اردو ڈائجسٹ' اور 'زندگی' سے وابستہ تینوں، الطاف حسن قریشی، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور مجیب الرحمن شامی میں سب سے سمجھدار اعجاز حسن قریشی تھے۔ انہوں نے مجیب شامی کو سمجھایا۔

جو سیاسی قیدی ہوتے ہیں ان کے لیے کچھ جیلوں میں تو جگہ ہے مگر جب زیادہ لوگ آجائیں تو یہ جو پھانسی کی کوٹھریاں ہیں (پھانسی کے قیدیوں کو سنگل کوٹھڑی دی جاتی ہے کہ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچائیں) تو ہم سب لوگ ان میں رہے ہیں اور اس کا فائدہ اٹھایا ہے کہ وہاں ایک سنگل کمرہ ہوتا ہے، میز، پلنگ اور کرسی ہوتی ہے۔ لیکن کوٹ لکھپت لاہور کی جیل میں بی کلاس والوں کے لیے کچھ کمرے بنائے گئے تھے اور میاں محمود علی قصوری کے لیے ایک میں سیٹ بھی لگائی گئی تھی۔ اب ہمارے ساتھ والے کمرے میں کشمیری قیدی رکھے گئے۔

سوال: ان لوگوں کے ساتھ آپ کتنے دن جیل میں رہے؟

جواب: ان کے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک میرا جہلم ٹرانسفر نہ ہوگیا۔ ان لوگوں کا غالباً ساہیوال ٹرانسفر ہوا مگر مجھے اکیلے جہلم بھیج دیا گیا۔ لاہور میں تقریباً ایک دو ماہ تک رہنے کے بعد میں وہاں بھیجا گیا تھا۔ مجھے ڈپٹی چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے آرڈر سے ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ سمری ملٹری کورٹ ایک سال سے زیادہ سزا نہیں دے سکتا۔ سزا سنانے کے بعد پہلے کوٹ لکھپت جیل بھیجا گیا پھر جہلم تبادلہ ہوا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ اپنے شہر میں رہ رہے ہیں اور ان کو تمام سہولتیں میسر ہیں۔

جہلم میں دریا کے کنارے جنگ عظیم کے دور کی پرانی بیرکس تھیں۔ ایک بیرک میں اے اور بی کلاس کے قیدیوں کو رکھا گیا۔ چھبیس فٹ اونچی اس کی چھت تھی۔ وہاں ایک خاکسار قتل کے الزام میں آگئے تھے جو درزی تھے۔ میں نے کہا آپ تو کبھی چھوٹ نہیں سکتے کیونکہ آپ کو تو سوٹ سینا بھی آتا ہے۔ سارا سرکاری عملہ ان سے سوٹ سلواتا تھا۔ وہ صبح اٹھ کر چپ راست کرتے تھے۔ خاکساروں کا لیفٹ رائٹ کرنا چپ راست کہلاتا ہے۔ ان کو چرس مفت ملتی تھی کہ وہ سپرنٹنڈنٹ کے کپڑے سلائی کر دیتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ مشقتی کے طور پر رہتے تھے۔ اس بیرک میں میرا ناشتہ، کھانا وہی پکاتے تھے۔ ایک دو پَروں والا قدیم پنکھا تھا جو چلتا رہتا تھا۔ کمرہ اتنا گرم نہیں تھا کیونکہ چھت بہت اونچی تھی۔ وہاں بالکل سامنے ڈسپنسری تھی جہاں روزانہ سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر آتے تھے۔ اس جیل میں بہت سے بچے بھی تھے۔ کئی قتل کے جرم میں آئے تھے، میں ان کو پڑھا دیتا تھا کہ کم از کم میٹرک تو کرلیں۔ اس وقت جہلم میں بہت گرمی تھی اور یہ بچے پڑھنے کے بعد اپنی بیرکوں میں جاتے تھے۔ جیلیں پاکستان کی بھری ہوتی ہیں اور ایک پنکھا کم پڑ جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس میں دو تین لڑکوں کو بہت تیز بخار ہوگیا۔ ایک لڑکے کا بخار کم ہی نہیں ہو رہا تھا، اس کو ایک سو چار بخار تھا، برف وہاں مل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب آتے تھے تو جن کو زیادہ بخار ہوتا تھا ان کو انجکشن لگاتے تھے۔ ہمیں تو نہیں پتا تھا مگر کمپاؤنڈر اور ان لڑکوں کو یہ پتا تھا کہ وہ ہم سے پہلے کے وہاں تھے۔ چار بج رہے تھے اُس کمپاؤنڈر نے کہا میرا تو اب بند کرنے کا ٹائم

> **بھٹو شملہ جا رہے تھے تو کچھ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا**

ہو رہا ہے۔ میں نے کہا اس بچے کو ایک سو چار بخار ہو رہا ہے، اس کو انجکشن لگا کر جاؤ۔ وہ کہنے لگا میں نے تو ڈسپنسری بند کر دی ہے، اب میں نہیں لگاؤں گا۔ میں نے کہا وہ لڑکا مر جائے گا۔ وہ کہنے لگا کہ مرجائے۔ میں نے لڑکوں سے کہا اس کے بازو پکڑو اور اپنی پشاوری چپل نکالی۔ وہ تب بھی نہیں سن رہا تھا تو میں نے چپل اس کے منہ پر رسید کی، پہلے ایک پھر دوسری۔ پھر اس نے انجکشن لگایا۔ بچے یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اس وقت گرداور (جیل کی سب بیرکوں کا انچارج) وغیرہ آئے اور کہنے لگے شاہ صاحب آپ کی تو شکایت لگ جائے گی۔ وہاں سب مجھے شاہ صاحب کہتے تھے کہ جہلم میں سید کی بہت عزت تھی۔ ایک قیدی جس کو بیس سال کی سزا تھی وہ روز زبردستی میرے پیر دباتا تھا۔ صبح میری شکایت ہوگئی۔ رانجھا صاحب جو بہت شریف آدمی تھے، وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مجھ سے کوئی ملنے آئے تو چائے پلاتے تھے اور کبھی مجھے یونہی سیاسی تاریخ پر گپ شپ کے لیے بلوا لیتے تھے۔ وہاں میرے علاوہ کوئی سیاسی قیدی نہیں تھا۔ صبح گرداور آگیا کہ آپ کی طلبی ہوگئی ہے۔ باہر وہی کمپاؤنڈر کھڑا تھا، میں اندر چلا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ کہنے لگے آپ چائے پئیں گے؟ میں نے کہا نہیں، آپ نے میری طلبی کیوں کی ہے، وہ بتائیں۔ انہوں نے اس کمپاؤنڈر کو اندر بلایا اور اس کی شکایت سنائی۔ میں نے ان سے کہا کہ ہاں، میں نے اس کو دو جوتیاں لگائی ہیں اور جیل کے اصولوں کے حساب سے جو سزا میری بنتی ہے وہ مجھے دیں مگر مجھے ہوم سیکریٹری کو خط لکھنا ہے جو میرا حق ہے اور بطور سپرنٹنڈنٹ آپ یہ بھجوائیں گے، تو مجھے ایک سادہ کاغذ دے دیں۔ میں اس میں لکھوں گا یہ ایک بچہ کو جو ایک سو چار بخار میں مبتلا تھا، اس کمپاؤنڈر نے جیل میں موجود ہوتے ہوئے انجکشن نہ لگایا۔ مجھے جیل کے قوانین کے لحاظ سے جو سزا ملتی ہے بھگتنے کے لیے تیار ہوں مگر اس کو اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ وہ فوراً کہنے لگا کہ نہیں ایسا مت کریں۔ پھر سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ دیکھو میں نے کہا تھا کہ شاہ صاحب نے جو کیا ہے اس سے انکار ہرگز نہیں کریں گے۔ بہرحال یوں معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

سوال: تو آپ نے اپنی سزا پوری کاٹ لی تھی؟

جواب: نہیں۔ بھٹو صاحب جب جنگی قیدیوں کے لیے شملہ جانا چاہتے تھے تو اپوزیشن لیڈروں نے کہا کہ ان میں سے کوئی اگر جائے گا تو اس شرط پر جائے گا کہ سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ مجھے پھر شام ہی کو آرڈر مل گیا رہائی کا، اور خبروں میں بھی آگیا۔ گرداوروں نے آکر مبارک باد دی کہ آپ لوگ تو سب چھوٹ گئے ہیں۔ اگلے دن جہلم کے وکلاء وغیرہ ہمیں لینے آگئے۔ جہلم میں ایک دن ہمارے وکیل ڈاکٹر رانجھا مجھ سے ملنے آگئے۔ ڈاکٹر رانجھا لندن سے قانون میں پی ایچ ڈی کرکے نئے نئے آئے تھے۔ انہوں نے کہا میں کیس لڑوں گا۔ وکیلوں کے پیشکار ہم سے پوچھتے تھے کہ وہ ہر روز عدالت پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو کیا فیس دیتے ہیں، تو ہم نے کہا کوئی فیس نہیں، البتہ ان کی اخباروں وغیرہ میں روز پبلسٹی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رانجھا کی ڈاکٹریٹ کمپنی لاء کی تھی۔ اس وقت لاہور کی عدالتوں میں کمپنی لاء کے کیس بہت کم تھے، اس لیے وہ دیگر کیسز کرتے تھے جن میں حبسِ بے جا کے کیس زیادہ تھے اور وہ مفت کیس لڑتے اور جیتتے تھے۔ جہلم میں جب وہ عدالت کے بار روم میں گئے تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بڑا وکیل کوئی بڑی عمر کا ہوگا، یہ تو کم عمر نوجوان تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کا پہلا کیس ہمارا تھا جو مفت تھا، بلکہ بار روم کی چائے کا بل بھی وہی دیتے تھے۔

سوال: اب آپ رہا ہوگئے تو آپ نے 'پنجاب پنچ' پھر نکالا؟

جواب: ہاں، میں نے دوبارہ نکالا۔ پھر بند ہوگیا۔ اس کے دو چار پرچے نکلتے تھے تو سرکار اس پر پابندی لگا دیتی تھی، وہ بند ہوجاتا تھا۔ ہم پہلے ہائی کورٹ میں اپیل کرتے تھے تو اکثر یہ ہوا کہ اپیل خارج ہوجاتی تھی۔

سوال: اچھا تو یہ 'پنجاب پنچ' کا سلسلہ پھر کب تک چلا؟

جواب: کم از کم ڈیڑھ دو سال چلا۔ (جاری ہے)

”اطراف“ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہے کہ ”ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم“ کا انتہائی مقبول سلسلہ شروع کرنے کی توفیق دی۔ ملک بھر سے بیٹے بیٹیاں۔ اپنے عظیم والد کو یاد کر رہے ہیں۔ کچھ خوش نصیب ہیں کہ ان کے والد کا سایہ میسر ہے۔ کچھ ان کے نقش قدم پر چلنے کا عزم کر رہے ہیں۔ جگہ کی تنگی کے باعث اس بار دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کا اظہار محبت نذر قارئین ہے۔ نومبر میں ہمارے اوراق ہیں ڈاکٹر رضوانہ انصاری (حیدر آباد) پروفیسر سیما ناز صدیقی (کراچی) سحر محمود (ملتان) فرخ شہزاد (کوئٹہ) جنید فریدی (کراچی) نسیم انجم (کراچی) حاجی فقیر محمد سومرو (کراچی) تحریم اصغر (بہاولپور) کے عقیدت پارے پیش کیے جائیں گے۔ یہ سلسلہ صدقہ جاریہ ہے۔ مزید بیٹوں بیٹیوں کو بھی دعوت عام ہے۔ اپنے احباب سے بھی کہیے کہ وہ بھی عظیم والد کے بارے میں اپنی یادیں ”اطراف“ کے اوراق کے لیے عنایت کریں۔

# والد صاحب نے کہا میری بیٹی کو شوق ہے وہ پڑھے گی۔ نازیہ آصف، گجرات

شکر ہے اللہ پاک کا کہ میرے والد صاحب کے روپ ایک گھنا برگد میرے سر پہ سایہ فگن ہے اور اللہ کرے یہ سایہ تاحیات مجھ پہ چھایا رہے۔ آمین!۔

میرا تعلق اس گاؤں سے ہے جہاں نصف صدی گزر چکنے کے بعد، آج بھی محض پانچ جماعتوں والا یعنی پرائمری سکول ہے۔ جس میں طالبات کی تعداد انتہائی کم ہے۔

مجھے یاد ہے، یہ اسّی کی دہائی تھی۔ جب میں آنکھ کھولتی ہوں تو میرے سامنے اخبارات و میگزین ہوتے ہیں۔ جن سے میں کھیلتی ہوں، پڑھنا سیکھنے کے لیے میں 'نوائے وقت' کے بدھ کے روز شائع ہونے والے بچوں کے میگزین" پھول اور کلیاں" سے اُردو پڑھنا سیکھتی ہوں۔ پہلے میرے والد صاحب مجھے کہانیاں سناتے تھے، مگر پھر لالٹین کی روشنی میں مجھے خود کہانیاں پڑھنا سکھایا گیا۔

پرائمری سکول میں داخلہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ٹیچرز اپنے رجسٹروں پہ اخبارات کے کور چڑھاتی تھیں۔ اور گاؤں بھر میں سے یہ اعزاز صرف ہمارے گھر کے پاس تھا کہ اخبار صرف ہمارے گھر سے ملتا تھا، کسی اور کے گھر اخبار نہیں ہوتا تھا۔ یہ میرے والد صاحب کا ذوق مطالعہ تھا، جس پہ مجھے آج بھی فخر ہے۔

ننھیال ددھیال میں پہلی بچی تھی۔ بہت لاڈلی بھی تھی۔ میری نانی جان ہمارے ہاں بدھ کو آتیں تو جمعرات کو یہ کہہ کر مجھے ساتھ لے جاتیں کہ "خیر ہے کل جمعہ کی چھٹی ہے"۔

مگر جب میں جمعہ کی شام تک گھر واپس نہیں پہنچتی تو ہفتہ سویرے سات بجے میرے والد صاحب پچاس کلومیٹر کا سفر طے کر کے مجھے لینے ننھیال پہنچ جاتے اور ایک منٹ کی تاخیر کیے بغیر مجھے ساتھ لے کر گھر آتے، خود تیار کرواتے اور میرے منہ بسورنے پر خود سکول چھوڑنے جاتے اور میری استانی جی سے باقاعدہ کہہ کر آتے "کہ بچی کو پچاس کلومیٹر کا سفر طے کر کے ابھی لے کر آیا ہوں اس لیے تاخیر ہوگئی۔

اب سوچتی ہوں" احساس ذمہ داری سکھانے کا یہ کتنا بہترین انداز تھا کہ آدھا دن تو ضائع ہوگیا مگر باقی آدھا دن تو ضائع نہ کیا جائے۔ اور ایسا کئی بار ہوا۔

مڈل سکول جانے کے لیے کھیتوں کے درمیان سے گزر کر پیدل جانا ہوتا تھا۔ ہوم اکنامکس کے پریکٹیکلز ہوتے تو میرے برتن اٹھا کر میرے ساتھ پیدل چل کر مجھے سکول پہنچاتے۔ میری کئی کلاس فیلوز اس بات پہ ہنستی تھیں۔

میں نے کلاس نہم میں جب داخلہ لیا تو تب ہم ایک کلومیٹر پیدل چلتے پھر تانگہ ملتا اور ایک کلومیٹر تانگے پہ سفر کر کے سکول پہنچتے تھے۔ مگر والد صاحب کی اسی تربیت کا اثر تھا کہ دسویں کلاس میں میری حاضری سو فیصد ہونے پہ مجھے انعام بھی ملا۔

تو آس پاس سے آوازیں اٹھیں کہ" پڑھنا بس کرو"۔ مگر یہ آوازیں دب گئیں، کیونکہ میرے والد صاحب نے کہا نہیں میری بیٹی کو شوق ہے وہ پڑھے گی۔

لیکن شومئ قسمت! کہ جب کالج داخلے کے لیے پہنچی تو ضلعے کے دو واحد کالجز میں داخلوں کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

اب رونے دھونے سے کیا ہو سکتا تھا۔ طے پایا کہ پرائیویٹ امتحان دے لو۔

یہ کہنے میں آسان مگر کرنے میں بہت مشکل تھا۔ کہ مضامین کون سے رکھے جائیں کوئی رہنمائی کرنے والا ہی موجود نہیں۔

کتاب خریدنے کے لیے پینتالیس کلومیٹر دور منڈی بہاؤالدین جانا پڑتا۔ جہاں سے میرے والد صاحب ایک دن ایک کتاب لاتے۔ میں کچھ دن پڑھتی پھر کہیں سے پتہ چلتا آپ یہ پرائیویٹلی نہیں پڑھ سکتے۔ تو اگلے دن دوسری کتاب لینے پھر چلے جاتے۔ اسی طرح میں نے اکنامکس، جغرافیہ، فزیکل ایجوکیشن، نفسیات کی کتابیں منگوائیں۔ کئی دن پڑھیں بلکہ نفسیات تو پورا سال پڑھی داخلہ بھیجتے وقت پتہ چلا کہ اپ اسے بھی گھر بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے۔ مگر اس سارے سلسلے میں آفرین ہے میرے والد صاحب پہ کہ انھوں نے میرے بار بار کتابیں منگوانے پہ کبھی غصے یا کسی معذوری و مجبوری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک سال گزر گیا تو پھر کہنے لگے" اب داخلہ لے لو۔" مگر اب میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرا ایک سال ضائع ہو جائے گا میں اگلے سال تھرڈ ائیر میں داخل ہوں گی۔

میری اس بات پہ گویا پورے گاؤں کا مشترکہ نقصان نکل آیا تھا۔ جس کو دیکھو وہی منع کر رہا۔ سب باتیں بنا رہے، مگر ایک بار پھر میرے والد صاحب میرے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو گئے۔ سب سے کہہ دیا "میری بیٹی کو پڑھنے کا شوق ہے تو وہ پڑھے گی اور کوئی کچھ نہیں بولے گا"۔ اور یوں میرا تھرڈ ائیر میں اپنے گاؤں سے پینتالیس کلومیٹر دور شہر گجرات کے فوارہ چوک کالج میں داخلہ ہو گیا۔

مجھے ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم پر

بھی خوب توجہ دی۔
یہ تو تھیں ان کی میری تعلیم خاص طور پہ ایک بیٹی کی تعلیم کے لیے کی گئ کاوشیں، ان کا ایک روپ ایک بہترین فوجی سگنل بٹالین کے انجینئر کا بھی تھا۔ انھوں نے 1971 کے سانحے میں ہلی کے مقام پر میجر اکرم نشان حیدر کی قیادت میں جنگ لڑی اور ستارہ جرات وصول کیا، مگر شومئ قسمت کہ قیدو بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ مگر ایک لحاظ سے یہ قید ان کے لیے خوشی کا پروانہ ثابت ہوئ کہ انھوں نے اس دوران قرآن پاک حفظ کرلیا۔ جس پہ اب بھی وہ رشک کرتے ہیں۔
میرے والد صاحب میرا قابل فخر اثاثہ ہیں۔ اللہ پاک ان کا سایہ

# مدینے میں گھر کی آرزو کی۔ اب والدمحترم جنت البقیع میں پیوند خاک ہیں۔ شاہ ولی اللہ جنید۔ کراچی

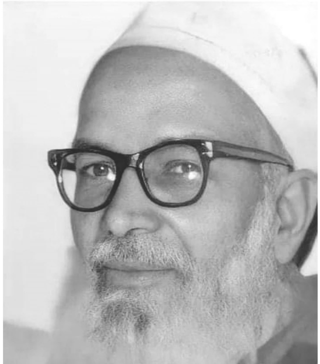

والدمحترم حضرت سید شاہ محمد خلیل اللہ جنیدی کو ہم سے بچھڑے 15 برس بیت گئے۔ ایک صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا باپ میرا سارا مال خرچ کر دیتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد کو بلایا۔ جب والد کو معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی ہے تو انہیں بہت رنج ہوا۔ راستے میں چلتے ہوئے انہوں نے دل میں کچھ اشعار کہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے مجھے وہ اشعار سنایئے جو آپ نے راستے میں کہے ہیں۔ وہ مخلص صحابی تھے، سمجھ گئے کہ وہ اشعار جو ابھی تک میرے کانوں نے بھی نہیں سنے، وہ بھی اللہ تعالی نے سن لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر بھی کردی ہے۔ انہوں نے وہ اشعار سنانے شروع کیے۔ خلاصہ کچھ یوں ہے: "میں نے تجھے بچپن میں غذا دی اور تمہاری ہر ذمہ داری اٹھائی، تمہارا سب کچھ میری کمائی سے تھا۔ جب کسی رات تم بیمار ہوجاتے تو میں بیداری میں رات گزار دیتا۔ میرا دل تمہاری ہلاکت سے ڈرتا رہا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ جب تو اس عمر کو پہنچ گیا تو پھر تم نے میرا بدلہ سخت روئی اور سخت گوئی سے دیا۔ جیسا کہ تم مجھ پر احسان و انعام کررہے ہو۔ کم از کم اتنا ہی حق مجھے دے دیتے جتنا ایک شریف پڑوسی دیتا ہے۔ کم از کم مجھے پڑوسی کا حق ہی دیا ہوتا.........." جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اشعار سنے تو بیٹے سے فرمایا کہ "تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کا ہے الغرض باپ اور ماں کے رشتہ کو تمام انسانی رشتوں میں مقدس اور اعلی تصور کیا جاتا ہے۔ والد ایک ایسا درخت ہے جو آگ اور دھوپ کو خود برداشت کرتا ہے لیکن اپنی اولاد کو سخت ترین گرمیوں میں بھی ٹھنڈک اور راحت فراہم کرتا ہے۔ میرے والد محترم سید شاہ محمد خلیل اللہ جنیدی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کو آخری سانس تک تربیت اور محبت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ ان کی زندگی میں ہم بہن بھائی معاشرے کے رسم رواج کے بندھن سے آزاد تھے وہ خود بھوکا رہ کر اپنی اولاد کا پیٹ پالنے میں دن رات منہمک رہے پیشہ کے اعتبار سے ایک معلم تھے لہذا متعلم کی مدد و معاونت و رہنمائی کو وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ ایک ایسی روحانی شخصیت تھے جو جدید ترین دنیا کی بود و باش رکھنے کے باوجود اپنے بزرگوں اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کو فوقیت دیتے تھے ان کا شروع سے معمول تھا کہ وہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے اور آدھی رات کو اٹھا کرتے تھے۔ 1988 میں اخباری دنیا سے وابستہ ہوا تو اکثر رات گئے تک گھر واپس آنا ہوتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتا تو سب سے پہلے میری نظر ابا پر پڑتی تھی کیونکہ انکا کمرہ پہلے پڑتا تھا۔ وہ کمرے میں ذکر واذکار میں مشغول ہوتے تھے لہذا میں سیدھا امی صاحبہ کے کمرے کی طرف جاتا تھا وہ اگر جاگ رہی ہوتی تھیں تو ان کے پاس جا کر بیٹھتا تھا اور ان سے دن بھر کی روداد سنا کرتا تھا یا پھر اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ ابا مرحوم جب اپنی عبادت و ریاضت سے فارغ ہوجاتے تو مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلایا کرتے تھے اور ہمارے درمیان نماز فجر تک دینی و دنیاوی موضوعات خصوصا اسلامی تاریخ، تصوف اور روحانیت کے حوالے سے گفتگو ہوتی تھی۔ نماز فجر کا وقت ہوجاتا تو نماز کی ادائیگی کے بعد میں اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا جاتا تھا۔ ابا تصوف کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ تصوف صفائے قلب ہے یہ اپنی انا کا کھوج لگانے کا ایک علم ہے اور من کی دنیا میں ڈوب کر سراغ زندگی پا جانے کا نام ہے اور تقویٰ کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ کانٹوں بھری دنیا میں دامن بچا کر گذر جانے کا نام تقوی ہے۔ والد صاحب چونکہ انگریزی اور اردو کے استاد تھے اور اردو شاعری سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ مرزا غالب، میر تقی میر، خواجہ میر درد اور شاہ نیاز بریلوی و دیگر شعراء کے صوفیانہ کلام بہت شوق سے سنتے اور سناتے تھے۔ ان شعرا کی شاعری میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس پر گفتگو کیا کرتے تھے اسی طرح نماز عصر سے لیکر مغرب تک ہمارے گھر پہ محفل جمتی تھی لوگ دور دراز سے شرکت کے لئے آتے تھے اس محفل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں درس و تدریس ذکر واذکار کا بیان ہوتا تھا جس علمی و ادبی شخصیات اور ان کے کئی شاگرد جن میں خواجہ رضی حیدر، پروفیسر ظہیر صدیقی پروفیسر انعام باری مرحوم کبھی کبھار باسط عظیم بھائی بھی آجاتے تھے دوران محفل اگر کسی نے میرے متعلق پوچھ لیا کہ شاہ ولی اللہ نظر نہیں آرہے تو ان کا جواب ہوتا کہ ولی میاں کسی شاعر کا خیال ہیں وہ ہوا کے جھونکے کی طرح گھر میں داخل ہوتے ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں، ارے بھائی وہ ولی ہیں اور ہم ان کے باپ ہیں ان کی شفقت بھری یہ باتیں اور ایک نظر مجھے یک دم تروتازہ کردیتی تھیں۔ میری زندگی کو ان کا وجود حوصلہ دیتا تھا، ان کی شخصیت ایک مقدس محافظ کی تھی جو ساری زندگی اپنی اولاد کی نگہبانی کرتا ہے انھوں نے اپنی ساری زندگی ہماری راحت رسانی کے لئے صرف کی وہ اپنی حق وحلال کی قلیل آمدنی سے دنیا کی وہ تمام نعمتیں ہمیں لاکر دینے کی کوشش کرتے تھے، جس کے لیے انھوں نے اپنی خواہشات کو بھی دبا دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے بہترین مستقبل کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔۔ ایک روز میں آفس سے رات گئے گھر پہنچا تو والد صاحب حسب معمول ذکر واذکار میں مشغول تھے اس سے فراغت کے بعد مجھے آواز دیکر اپنے پاس بلایا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے دوران انھوں نے مدینے میں گھر بنانے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ کی زیارت کی اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا ان کی اس خواہش کے جواب میں میرا والد صاحب قبلہ سے کہنا تھا کہ آپ بھی کتنی مشکل بات کررہے ہیں وہاں رہنا آسان نہیں ہے وہاں بہت مہنگے گھر ہوتے ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ناظم آباد کو چھوڑ کر بڑی مشکلوں سے تو نارتھ کراچی میں ہمارے سر چھپانے کے لئے آپ نے گھر بنایا تھا۔ ایک تن تنہا سب کی کفالت کا بوجھ کاندھوں پہ اٹھایا ہوا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے امی صاحبہ مرحومہ کس طرح گھر کو چلاتی تھیں وہ تنگ دستی کی وجہ سے تمام گھر کے افراد ملکر دیواروں پر پلاسٹر اور رنگ و روغن کیا کرتے تھے۔ وہ تو اللہ نے کرم کیا جو بھائی صاحب برسر روزگار ہوگئے اور ہمارے گھر کے حالات میں آہستہ بہتری آنا شروع ہوئی۔ میری اس بات پر ان کا کہنا تھا کہ بیٹا اپنے رب سے ہمیشہ اچھا گمان

رکھا کرو، پروردگار نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے وہ مزید بھی ہماری ضرورتوں کو پورا کرے گا اور یقینا ہماری سنے گا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک قبولیت کی گھڑی تھی اس گفتگو کے ایک ماہ بعد ستمبر 2006 میں والد گرامی عمرہ و اعتکاف کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب روانہ ہو گئے اور ایک ہفتے بعد 21 رمضان المبارک 2006 کو مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین جنت البقیع میں پیوند خاک اور دائمی وصال سے سرفراز ہوئے۔ بیشک اللہ تعالی کے بارے میں حسن ظن رکھنے والا کبھی مایوس نہیں ہوتا جب بندہ اللہ کو دل کے یقین کیساتھ پکارتا ہے تو اسکا رب اسکی پکار کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا کہ یہ اس ذات باری تعالی کی شان کے بر عکس ہے۔ والدین کا رشتہ ایک ایسا ہے جو ان کے چلے جانے سے ٹوٹ نہیں پاتا وہ اس دنیائے فانی سے جانے کے بعد بھی ہم سے وابستہ ہیں۔ ابا کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے رب العالمین سے بس دعا گو ہوں کہ وہ میرے والد محترم سید شاہ محمد خلیل اللہ جنیدی کی بے حساب مغفرت اور انہیں سرکار دوعالم ﷺ کی شفاعت کاملہ و اعلی وارفع مقام عطاء کرے آمین۔

## میرے والد کی ذاتی لائبریری میں 15 ہزار کتابیں۔ محقق استفادے کے لیے دور دراز سے آتے ہیں۔ عرفان عباسی

والد اللہ تعالی کی طرف سے اولاد کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ لفظ 'والد' کہنے کو تو چار حروف کا مرکب ہے لیکن اولاد کے لیے اپنے اندر ولایت، ایثار و وفا، الفت و شفقت، لطف و کرم، دانائی اور دستگیری سموئے ہوئے ہے۔ اگر اس کی عظمت و رفعت کا پاس کرتے ہوئے اولاد اس کی اطاعت، فرمانبرداری، خدمت اور تعظیم بجالائے جو اُس کی رضا و خوش نودی کا باعث ہو تو یہ اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوش نودی کے حصول کا باعث ہوگا۔

میرے والد محترم جناب محمد عثمان عباسی میرے استاد بھی ہیں اور میرے رہبر بھی ہیں، ساھتی پرگنہ ضلع نوشہرو فیروز تعلقہ کنڈیارو کے گاؤں چنیہانی میں 3 فروری 1960 میں جنم لیا وہ ایک ہاری کے بیٹے ہیں لیکن بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے، کھیتی باڑی کام بھی کرتے تھے اور اپنی پڑھائی کو بھی جاری رکھتے آئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں چنیہانی میں اور مڈل گاؤں سید و باغ میں اور میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول کنڈیارو میں، بی اے غلام ربانی آگرو کالج کنڈیارو میں، ایم اے اسلامک کلچر شاہ عبد الطیف یونیورسٹی خیرپور سے حاصل کی۔ اس کے بعد پرائمری اسکول میں استاد کی حیثیت سے 38 سال خدمات سر انجام دے کر 1 فروری 2020 میں ریٹائر ہوئے۔ اس کے ساتھ اپنے پڑھنے اور لکھنے میں مصروف رہے۔ لکھنے کی شروعات روزانہ ہلال پاکستان اخبار اور 'گل فل' رسالے سے کی، سندھی ادبی سنگت کنڈیارو کے 1993، 1994، اور 1996 میں سیکریٹری اور 1994 میں ضلع نوشہرو فیروز کے رابطہ سیکریٹری رہے۔ پڑھنے، پڑھانے، لکھنے اور سماجی کاموں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ اپنی جان اور گھر پر پیسہ لگانے کے بجائے اپنی تنخواہ سے کتابیں خرید کر کر کے اپنے ہی نام سے عثمانیہ لائبریری چنیہانی کنڈیارو قائم کی جس میں اس وقت پندرہ ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں، اور کچھ قلمی نسخے بھی ہیں۔ اور کئی محقق اپنی تحقیق کے حوالے سے پاکستان چھوٹے بڑے شہروں سے گاؤں سے چل کر آتے ہیں اور ان سے نہ کوئی فیس لی جاتی ہے بلکہ کھانے کے ٹائم پر کھانا اور چائے بھی مہیا کی جاتی ہے، انہوں نے صرف کتابیں جمع نہیں کی ہیں بلکہ ساتھ انہوں نے اپنی تحقیق کے مطابق کچھ کتابیں لکھیں اور مرتب کی اور تراجم بھی کی جن کے تعداد اس وقت 50 ہے اور الحمدللہ آگے کام جاری ہے۔ جن میں سے کچھ کتابوں کے یہ نام ہیں۔

(1) سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم (2) عالمی معلومات (3) دنیا ایک آئینہ (4) قرآنی دعائیں (5) کامل نماز (6) دلچسپ کہانیاں (7) دنیا کی ایک سو عظیم شخصیات (8) درسی خط (9) عرفان انگلش گرامر (10) ڈکشنری انگلش ٹو انگلش اینڈ سندھی (11) تقریروں سے تقدیر بنائیں (12) صدام میدان جنگ میں (13) گلستان: ترجمہ (14) بوستان: ترجمہ (15) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اچھے آدمی (16) عجیب دنیا عجیب خلقت (17) منتخب احادیث (18) تحریک ریشمی رومال اور سندھ (19) ابوالکلام آزاد کا خفیہ فائل (20) سندھی اردو لغت (21) سندھ بابت جنرل نالج سوال جواب میں (22) تاریخ اسلام سوال جواب میں (23) شاندار تحفہ فرض نماز کے بعد دعا (24) سیرت النبی سوال جواب میں (25) حضرت مولانا محمد حسین شاہ سجاولی شخصیت۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کو سندھ کے کئی اداروں سے ایوارڈ بھی ملے ہیں اور ایک بہترین استاد ہونے کے ناتے بھی ایوارڈ ملے ہیں۔

اس وقت ان کی 64 سال عمر ہے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ وہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پڑھنے لکھنے کے ساتھ شوق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ والد محترم کی عمر دراز فرمائے اور ہمارے اوپر ان کا سایہ تادیر قائم رکھے آمین۔

## عام سے دکھنے والے ابو اولاد ہی نہیں ایک بڑے حلقے کا فخر تھے۔ حکیم عمار وحید ابن حکیم عبد الوحید سلمان

"میں بہت عرصہ استادِ کامل کی تلاش میں رہا، بہت سے اساتذہ کے حلقہ درس میں بیٹھا، ابا جان کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ اندازہ ہونا شروع ہوا کہ میری طبیعت، مزاج، صلاحیتوں کے حساب سے میرے لئے "بہترین استاد تو میرے والد ہی تھے۔"

جب ذرا نئی نئی جوانی چڑھی تب ایک روز ابو کو گاڑی پر چوبرجی والے مطب پر لے جاتے ہوئے ابو نے میری کسی الٹی سیدھی بات کے جواب میں استاد کی تلاش کے بارے میں درج بالا فقرہ کہا اور خاموش ہو گئے۔

ملے جلے جذبات سے انکی یہ بات میں نے سنی اور دل میں سوچا کہ دادا ابو (حکیم محمد عبداللہ جہانیاں والے) پردادا ابو (مولانا حکیم محمد سلیمان رح روڑی سرسہ والے) تو بہت خاص لوگ تھے۔ زندہ ہوتے تو میں دادا ابو جیسی من موہنی شخصیت کو ضرور اپنا استاد بنا لیتا۔ اور ابو کی بات کو کچھ سمجھتے اور کچھ نا سمجھتے ہوئے میں خاموش ہو گیا۔

ایک سوال جو مجھے اکثر الجھا دیتا کہ دادا ابو، پردادا ابو تو (انشاء

اللہ) چنیدہ افراد میں سے تھے۔ ابو بھی خاص آدمی تھے یا عام۔؟ سوچتا کہ شاید عام ہوں، لیکن عامیانہ تو ہرگز نہیں ہیں۔ کبھی دل کہتا کہ ہیں تو بہت خاص۔ پھر کبھی کبھی بالکل عام سے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔؟

شائد ہر وہ نعمت جو آپ کو میسر ہو تو عام ہی لگتی ہے، اور چھن جانے کے بعد اس کے خصائص کا اندازہ ہوتا ہے۔

یا شائد جب دیکھنے و محسوس کرنے والی آنکھ عام سے بھی گئی گزری ہو تو وہ خاص افراد کی پہچان کیسے کر سکتی ہے۔؟

ہو سکتا ہے کہ خاص اور عام ہونے کا میرا تصور اور معیار ہی درست نہ ہو۔

کبھی خیال آتا ہے کہ ابو کے خاص لگنے کی تو بہت سی وجوہ تھیں لیکن ایک وجہ انکا صاحب علم و حکمت ہونا بھی تھی۔ معلوم نہیں کیوں میں صاحب علم افراد سے بہت جلد مرعوب ہو جاتا ہوں۔ شائد اپنی کم علمی کی وجہ سے۔ مگر ابو جب کسی صاحب علم سے گفتگو کر رہے ہوتے تو حیرانی ہوتی کہ میرے "عام" سے ابو یہ بات کیسے جانتے ہیں۔؟ اچھا! ابو کو اس علم کا بھی پتہ ہے۔ یہ انہوں نے کب پڑھا ہوگا؟ کہاں سے سیکھا ہوگا؟

ایک دفعہ بڑے ماموں ڈاکٹر باقر خان خاکوانی جو اوپن یونیورسٹی میں اصول فقہ کے پروفیسر رہے ہیں۔ ان کی فون پر کسی سے بات ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو انہوں نے کسی عربی کتاب کا حوالہ دیا۔ ابو نے آہستگی سے اس کی تصحیح کی کہ یہ بات فلاں نہیں فلاں کتاب میں درج ہے۔ انہوں نے بھی فوراً تصدیق کی اور تصحیح کر لی۔ میں بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ ابو کا حافظہ تو معروف ہے لیکن آپ تو پنجاب یونیورسٹی میں فارمیسی کے طالب علم رہے تھے۔ اس کے بعد ایم اے اسلامیات کیا۔ تب بھی اتنا تو نہیں پڑھا ہوگا کہ ان عربی کتب کے حوالے چالیس سال بعد بھی یاد ہیں۔

اسی طرح ہمیں بہت سے اشعار کا ایک مصرع یاد نا آ رہا ہوتا تو ابو بتا دیتے۔ جس لفظ کا تلفظ معلوم نا ہوتا تو ابو سے پوچھ لیتے۔ جس تاریخی واقعے یا شخصیت سے نیا تعارف ہوتا ابو سے اس کا پس منظر اور مزید تفصیلات سن لیتے۔

ایک دفعہ اردو بازار میں ایک انگریزی کے پروفیسر صاحب نے کسی بات پر ابو سے کہا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کی انگریزی بھی اردو کی طرح نستعلیق ہوگی۔

ابو کبھی اپنے ایسے دوستوں کا تذکرہ کرتے جو کسی نا کسی شعبہ زندگی میں نامور ہوتے تو میں سوچتا کہ وہ معاشی اور معاشرتی طور پر بہت آگے نکل گئے ابو نے کیوں نا وہ فیلڈ اختیار کی۔؟ ایک بار رک نہ سکا اور پوچھ ہی بیٹھا۔ ابو نے سیدھا سا سپاٹ سا جواب دیا کہ "بیٹا! میری زندگی کا مقصد پیسہ یا شہرت حاصل کرنا کبھی رہا ہی نہیں"۔ میں نے پوچھا کہ "پھر کیا مقصد رہا؟" تو جواباً شعر سنا دیا کہ

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

میں کچھ نہ سمجھ پایا۔ مگر کتابی سا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔

پھر جب میری عمر بیس سال سے کچھ زیادہ ہوئی تو مجھے لگنے لگا کہ ابو خاص کی نسبت عام زیادہ ہیں۔

انکے عام لگنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ انکی زندگی بظاہر ایک عام مسلمان والی زندگی تھی۔ جو حقوق اللہ و حقوق العباد پورے کرنے میں گذر گئی۔

حقوق اللہ کے معاملے میں مجھے لگتا کہ انکے درس قران بس لوگ خیر و برکت کے لیے سن لیتے ہیں۔ لیکن میں سوچتا کہ اب یہ طریقہ تدریس زیادہ موثر نہیں۔ ایک آدھ دفعہ ابو سے تذکرہ بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ "بیٹے! تمہیں جس طریقے سے تبلیغ دین مناسب لگے تم اس طرح سے شروع کر دو۔ مثال بننا نقاد بننے سے زیادہ مشکل ہے"۔ سو میں چپکا ہو رہا۔

ان کے وصال کے بعد ان کے ایک ہاسٹل کے کمرے کے ساتھی و ملکی سطح پر مشہور صحافی نے کسی دوست کو کہا "میں تو سلیمانی صاحب کو صرف بڑا حکیم سمجھتا تھا۔ کچھ اہل نظر نے بتایا تو معلوم ہوا یہ تو مقام تسلیم پر فائز صوفی تھے لیکن اس کو چھپائے رہے۔"

ابو کے دور جوانی کے دوست اور میاں طفیل محمد مرحوم کے بیٹے میاں احسن فاروق انکی وفات کے چند روز بعد آئے تو آبدیدہ ہو کر ایسا تبصرہ کیا کہ ابو سن لیتے تو خوب ہنستے۔

کہنے لگے کہ "الحمدللہ! ہم نے بھی جوانی سمیت ساری زندگی شرافت میں بسر کی۔ لیکن حکیم صاحب تو جینوئن شریف آدمی تھے۔"

اب یہ جینوئن شریف آدمی کیا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

مجھے شعر یاد آ رہا تھا کہ

نفس کو آنچ پر اور وہ بھی عمر بھر رکھنا
بڑا محال ہے ہستی کو معتبر رکھنا

جب زندگی کا مقصد نوجوانی سے ہی واضح ہو جائے تو یہ محال کام بھی محال نہیں رہتا۔

فحش گوئی، پھکڑ پن، ابتذال، جھوٹ، غیبت، بہتان اور زبان کے تمام عیوب سے عمر بھر خود کو بچا کر رکھنا۔ کہنے یا لکھنے میں تو سہل ہے۔ عمل میں اتنا سہل ہوتا تو صرف دو چیزوں کی ضمانت پر جنت کی بشارت نہ ہوتی۔

ان کی حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی چونکہ ریا کاری نہیں تھی تو کبھی لگتا کہ ابو سمیت ہم سب حقوق العباد میں بھی عمومی سے لوگ ہیں۔

لوگوں سے مل لیا۔ کچھ گپ شپ کر لی۔ کچھ کھا پی لیا۔ بس۔ لیکن کچھ باتیں عام سے ہٹ کر لگتیں کہ ابو لوگوں کی مالی معاونت نہایت خاموشی سے کرتے ہیں، قرض کی وصولی میں نہایت نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ حکیم ہونے کے ناطے بہت لوگوں کے راز چھپائے رکھتے ہیں۔ اپنا دل حسد اور کینہ سے صاف رکھتے ہیں۔ لیکن میں سوچتا کہ اس میں بھی اتنا خاص کیا ہے؟

یہاں تک کہ ایک روز انصاری صحابی حضرت سعد بن مالک والا واقعہ نظر سے گزرا۔ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تین روز لگاتار جنتی کہا تو حضرت عبداللہ بن عمر نے ان کے خاص الخاص اعمال دیکھنے کے لئے جن کی وجہ سے بشارت ملی، 3 روز ان کے گھر میں قیام کیا۔ اور جب کچھ خاص نا پایا تو اپنا مدعا بیان کیا حضرت سعد بن مالک نے فرمایا

"میں کسی مسلمان سے کینہ نہیں رکھتا اور کسی مسلمان سے حسد نہیں کرتا"۔ اس کے بعد ابو کے خاص ہونے کی کچھ وجوہ سمجھ آنے لگیں۔

میں بس یہ باتیں سننے تک محدود رہ گیا۔ ابو نے ان کو عمل سے ثابت کیا اور اللہ کی نظروں میں خاص ہو گئے۔

ایسے ہی معاش کے معاملے میں کبھی لگتا کہ ابو بس عام سے کاروباری ہیں۔ جب ابو کی کاروباری جدوجہد کی کہانی سنی تو معلوم ہوا کہ ابو تو انٹرپرونیور ہیں۔ پھر یہ سوال ذہن میں آتا کہ انہوں نے اتنا زیادہ پیسہ کیوں نہیں کمایا۔؟ آپ اس شعبے میں تب آئے تھے جب چند ہی پبلشر تھے۔ بڑے بڑے لکھاریوں سے دوستی تھی۔ ان کی کتب خود دوسرے اشاعتی اداروں کو دلوائیں۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اشفاق احمد مرحوم اور انور مسعود کی کتب خود کیوں شائع نہیں کیں؟ تو کہا "بیٹا سب وقت کاروبار کے نام کر دیتا تو دین کے لئے وقت کہاں سے نکالتا، میں نے اللہ سے رزق کفاف مانگا ہے کہ کسی ضرورت کے لئے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ دینے والا ہاتھ عطا کرے۔ باقی رہیں خواہشات تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتیں۔

ہاں! اس شعبہ میں میں نے عزت و نیک نامی خوب کمائی ہیں۔"

جب ابو کے چلے جانے کے بعد زندگی کا رخ بدلا تو جذبات اور احساسات بھی بدلنے لگے۔ پھر بہت سے خاص لوگوں (دینی اور معاشی معاملات میں) کی طرف سے ابو کے معاملات اور کردار کی شفافیت کے بارے میں گواہیاں آنے لگیں تو احساس زیاں بڑھنے لگا۔ اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے احساس زیاں ہے کہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

معاملات ہوں کہ عبادات، معاش ہو یا تعلیم و تعلم، مقصد زندگی کی پہچان ہو یا کوئی بھی معاملہ، گاڑی میں کہی ابو کی بات یاد آتی ہے اور دل کی کسک اس احساس زیاں کو چبھتی ہوئی ٹیسوں میں بدل دیتی ہے- 6 سال ہونے کو آئے ہر ماہ کوئی نا کوئی ایسا مریض آ جاتا ہے جو لمبے عرصے کے بعد آیا ہوتا ہے اور آ کر وہ ان کے اخلاص اور اخلاق کی گواہی دے کر بچشم نم دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔

حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد بندہ مومن کی تقریباً سبھی صفات

جب قرآن واحادیث میں نظر سے گذرتی ہیں تو ان کا حامل بندہ تلاش کرنے کے لئے نظر دوڑاؤں تو پہلی نظر والد مرحوم پر ہی پڑتی ہے۔ گزشتہ دنوں تربیت اولاد کے موضوع پر سلمان آصف صدیقی کے لیکچرز دیکھے تو معلوم ہوا کہ ابو نے ان اصطلاحات کا نام لئے بغیر ہماری تربیت اسی نہج پر کی تھی جو قریباً آئیڈیل سمجھی جاتی ہے۔

فجر کی نماز شائد سب کو ہی مشکل محسوس ہوتی ہو، ابو مجھے نماز کے لئے اٹھاتے ساتھ ساتھ کان کے قریب لاحول ولاقوہ کا ورد بھی شروع کر دیتے۔ شروع میں تو چند ثانیے الجھن ہوتی مگر پھر شیطان اپنی نحوست کو اٹھا کر بھاگ جاتا اور آنکھ کھل جاتی۔ کبھی میں گاڑی تیز چلاتا تو بجائے اس کے کہ ڈانٹ ڈپٹ کریں۔ سفر کی دعا باآواز بلند شروع کر دیتے۔ انکا مزدور یا نچلے طبقے سے احترام سے بات کرنا بلکہ بعض اوقات ضرورت سے زیادہ احترام مجھے کچھ عجیب لگتا تھا۔

ایک دفعہ کسی پمپ پر پٹرول ڈالنے والے سے گپ شپ کے دوران میرے چہرے پر ناگواری کے اثرات بڑھے تو ابو نے بھی نوٹ کر لیے۔ اسی لمحے پمپ والا بھاگا بھاگا کمرے سے گاڑی صاف کرنے والا کپڑا لے آیا اور ابو کو کہا انکل جی! یہ آپ کے لئے تحفہ۔

اب کے ابو نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ سکھا گئے۔

زندگی کے جس پہلو کو سوچتا جاؤں اس میں ابو کی کہی ہوئی کوئی بات یا عمل یا شعر یا ضرب المثل۔ کچھ نا کچھ مل ہی جاتا ہے۔ دادا جان کے ایک دیہاتی دوست صوفی سردار محمد کا

ایک شعر کئی دفعہ ابا جان سے سنا

زندگی اپنے ہی پاؤں پہ چلا کرتی ہے
پائے اغیار پہ جاتا ہے جنازہ اے دوست

جب ناصر باغ لاہور سے ابو کا جنازہ اٹھایا تو ابو کی آواز میں یہی شعر کانوں میں گونجنے لگا۔

پتہ نہیں آپ نے زندگی میں کتنوں کے نکاح اور جنازے پڑھائے تھے۔ جب ابو کا جنازہ ہو رہا تھا تو جنازے کی دعاؤں کے الفاظ اور لوگوں کے لئے تو پروفیسر مزمل احسن شیخ صاحب کے مونہہ سے ادا ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ ابو ہی آگے کھڑے اپنا جنازہ پڑھا رہے ہیں۔

ان کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک تو ندا فاضلی کے الفاظ میں یونہی لگتا تھا کہ

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے، وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں، تم مجھ میں زندہ ہو۔

پھر 3،4 سال کے بعد زندگی نے ابو کے بغیر آگے بڑھنا شروع کیا۔

ابو سے محبت تو ظاہر ہے کہ انکی اولاد ہونے کے ناطے سے تھی اور ہے۔ البتہ مریدانہ عقیدت ان کے اللہ کے پاس جانے کے بعد شروع ہوئی۔

اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ابا جان مرحوم کی وفات کے بعد بہت سی باتیں جو اس سے قبل ذہن میں آ کر بھی سمجھ نہیں آتی تھیں وہ اب سمجھ آنے لگی ہیں۔ اور وہ باتیں جو کبھی کتابی لگتی تھیں اب وہ شدت سے محسوس ہونے لگی ہیں۔

اب ہر گزرتے سال کے ساتھ ابو خاص سے خاص الخاص لگنے لگے ہیں۔

ایک طرف مجھے اپنی نوجوانی میں عام سے دکھنے والے ابو۔ جو اپنی اولاد ہی نہیں اپنے احباب، رشتہ دار اور دوستوں سب کا فخر تھے۔ سب ان کے اعلی اخلاق و کردار کی گواہی دینے والے ہیں۔ سب ہی اچھی الفاظ میں ان کی شخصیت کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے لیے دعائیہ کلمات کہتے ہیں۔ (اگر خود نمائی نا محسوس ہوتی تو ان خوابوں کا تذکرہ بھی کرتا جو چند اللہ والوں نے قبل اور بعد از وصال ابو کے مقام و مرتبہ سے متعلق دیکھے تھے۔)۔

اور ایک طرف میں۔ کہ جس کی ایک خواہش۔ جو ہنوز تشنہ ہے۔ کہ کاش!!۔ میں اپنے دادا پردادا جیسا نا سہی۔ اپنے والد جیسا ہی بن سکوں۔ کہ جانے کہ بعد کسی کو یاد آؤں تو دعائے مغفرت کا مستحق تو ٹھہروں۔

میری شخصیت اور نامہ اعمال میں بھی کچھ تو ایسا ہو کہ اپنی آنے والی نسل کے لئے عام سا بننے کی بجائے کچھ خاص بن سکوں۔ اور دعا کیجیے کہ اللہ کے نزدیک تو خاص ہی ٹھہروں۔

# اپنے والد کی زبان پر کبھی شکایت نہیں دیکھی۔ مجھے بن مانگے ہر چیز مل جاتی تھی۔

سیدہ عطیہ حسن عابدی۔ کراچی

محترم قارئین جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ گزشتہ دو ماہ سے ماہنامہ اطراف نے ہر باپ کو عظیم اور قابلِ تعظیم گردانتے ہوئے خراج عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے تو بہت ہمت کر کے قلم کو تھام کر اس عظیم ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے جا رہی ہوں جو اب اس دنیا میں میرے ساتھ ظاہری طور پر موجود نہیں مگر ہر مشکل میں آج بھی انکا ساتھ انکی عطا کردہ برکت محسوس ہوتی ہے۔ باپ ایک ایسی عظیم طاقت کا نام ہے کہ جسکے ہوتے انسان کو کوئی خوف نہیں ہوتا۔ اولاد کے قدم لڑکھڑانے سے پہلے وہ اسے تھام لیتا ہے۔ باپ وہ رحمت ہے جس کے پاس خلوص اور محبت کے خزانے کبھی کم نہیں ہوتے۔ جسکی دولت اولاد ہوتی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے وہ اپنی زات کے آرام و چین کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ عظیم باپ اولاد کے سر پر وہ سائبان ہے جو تیز دھوپ میں بھی ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے۔ جو اپنی جرات ہمت اور حوصلے سے وقت کی تندو تیز ہواؤں کا رخ موڑ دیتا ہے۔ میرا عظیم باپ وہ ہستی تھے جن کے ہوتے کبھی آنکھ میں آنسو نہیں آیا۔ کوئی رنج والم پاس نہیں رہا۔ اپنے ابو جان کو یاد کروں تو لاکھوں میٹھی اور خوبصورت یادوں کی سوغات اپنے ساتھ موجود پاتی ہوں۔ انکے ہوتے زندگی کے شب و روز کسی حسین خواب کی مانند لگتے ہیں جہاں ہر آرزو بن کہے پوری ہوتی تھی اور ہر چیز بن مانگے مل جاتی تھی۔ انکی ہر بات میں ایک حکمتِ ہوتی تھی۔ انکا ہر فیصلہ بہترین ہوتا تھا۔ انکا شفقت بھرا دوستانہ رویہ بغیر رعب ڈالے ایک دبدبہ، بے لوث ہو کر لوگوں کے کام آنا، انسانیت کا عظیم پیکر کبھی کوئی امتیازی سلوک نہ کرنا۔ بیٹوں کے بعد لڑکی پیدا ہونے پر مٹھائی بٹوانا اسے عطیہ خداوندی قرار دینا اور اتنا لاڈ پیار دینا کہ آج بھی زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے انکی زندگی راستہ دکھاتی ہے خدا کی رضا میں راضی رہنے کا۔ میں نے والد صاحب کی زباں پر کبھی شکوا شکایت نہیں دیکھی۔ کبھی کسی بھی قسم کے حالات میں ماتھے پر بل نہیں دیکھے۔ انھیں ہمیشہ بلند عزم و حوصلے کا پیکر پایا۔ آج بھی یاد ہے جب بہن ٹائفائیڈ کے سبب امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی تو اسے سب سے زیادہ انعام سے نوازا کہ پاس تو سب بچے ہوئے ہیں لیکن ہمت ہے تو کوئی بچہ فیل ہو کر دکھائے۔ ناکامی کے بعد جو مضبوطی آتی ہے اسکا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔ انھوں نے ہمیشہ خود پر فخر کرنا اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا سکھایا۔

میں بہت خوش نصیب رہی کہ مجھے خدا نے واقعی ایک عظیم باپ عظیم نعمت سے نوازا میرے والد باوقار و بے مثال باپ تھے۔ میرے ابو جان صاحب عقل و شعور، رحمدل 'شفیق' ہمدرد بے لوث 'خودار اور ایک نڈر انسان تھے۔ مجھے انسے پیار تھا' ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ خدا انکی کامل مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ خدا مجھے انکے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

"عمر کا سورج' باقاعدگی سے طلوع ہو رہا ہے۔ اب اس ملک کی داستان آغاز ہو رہی ہے جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہماری سینئر صحافی اب سات سال کی عمر میں لندن پہنچ گئی ہیں۔ 1950 میں لندن دنیا کا سب سے اہم شہر تھا۔ امریکہ نے ابھی دنیا پر غلبہ نہیں پایا تھا۔ ملک کی سب سے سینئر صحافی خاتون۔ افسانہ نگار۔ ناول نویس۔ 'تین عورتیں تین کہانیاں' کی شہرت یافتہ سعیدہ افضل نے ہماری درخواست بلکہ اصرار پر اپنی یادیں قلمبند کرنا شروع کی ہیں۔ ان کی یہ آپ بیتی پاکستان اور بیرون پاکستان بڑی دلچسپی سے پڑھی جا رہی ہے۔ کمال یہ ہے کہ پاکستان کے ابتدائی سالوں کی معاشرت بہت باریکیوں کے ساتھ سامنے آرہی ہے۔ مہاجرین کی آمد۔ انصار کی مہمان نوازی۔ تہذیبیں آپس میں مل رہی ہیں۔ نیا سماج نمو پا رہا ہے۔ اس خودنوشت سے یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور محققین استفادہ کر رہے ہیں۔"

# لندن کے مضافاتی علاقے میں میرا بچپن

قسط نمبر 13

تحریر: سعیدہ افضل

یہ 1950 ۔ غالباً جون کا اواخر یا جولائی کا شروع تھا۔ جب ہم لندن کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ میں اپنے والد کے ساتھ والی ونڈو سیٹ پر بیٹھی تھی۔ دوسری جانب عزیزہ بیٹھی تھی۔

میری دونوں چھوٹی بہنیں، فہمیدہ اور شہناز جس کو پیار سے میری ماں شنو بلاتی تھی، امی کے ساتھ تھیں تب شنو چار ماہ کی اماں کی گود میں تھی۔ دورانِ سفر کھڑکی سے دیکھنا مجھ کو اچھا لگتا تھا۔

سفر ریل کا ہوتا کہ ہوائی جہاز کا، ہمیشہ اصرار کر کے میں کھڑکی کی طرف ہی بیٹھتی تا کہ باہر کا نظارہ کر سکوں، سفر کا لطف ہی نظاروں کی دید میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب جہاز روئی جیسے سفید بادلوں اور نیلے بے کنار سمندر کے اوپر پرواز کر رہا ہو اور جب وہ نیچی پرواز میں ہوتا دھرتی پر مکانات گڑیا گڈوں کے گھروں جیسے دکھتے۔ تب سڑکیں اور راستے پنسل سے کھینچی گئی لکیروں کی مانند نظر آتیں۔ اور چلتی ہوئی گاڑیاں بچوں کے کھلونے معلوم ہوتی تھیں۔ تبھی جہاز کے نیچے کی دنیا 'ونڈر لینڈ' بن جاتی۔ کسی ہری بھری طشتری میں سجا ہوا کوئی حسین خواب۔

میں بھی تو بچی تھی بمشکل سات سال عمر ہو گی۔ میں 'ونڈو' والی سیٹ پر قبضہ کر لیتی اور کھڑکی کے شیشے سے چپکی کائنات کی وسعتوں میں کھو جاتی۔ جہاز کی پرواز سے تھوڑی دیر بعد ایئر ہوسٹس ٹرے ہماری پاس لائی جس میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں چوکور خوبصورت برتنوں میں رکھی ہوئی تھیں، میری نظر ایک ڈش پر پڑ گئی، مجھے لگا اس میں سیخ کباب ہیں میں کونے والی نشست پر تھی، بابا نے میری طرف دیکھا۔ میں جس ڈش کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اس میں سے چند میری پلیٹ پر رکھ دیے۔ مجھے تو کباب پسند تھے لیکن یہ سیخ کباب نہیں تھے یہ پھیکے مگر خاص مہک والے بہت مزیدار تھے۔

میں نے وہ کھا لیے، کچھ اور بھی لو۔ بابا نے سینڈوچ اور کیک پیس سامنے کر دیے۔ یہ ہمارے سیخ کبابوں کے جیسے مرچوں والے نہیں ہیں۔ ان کو کیسے بناتے ہیں؟

آنتوں میں قیمہ بھر کر بناتے ہیں۔ میری نیت کچھ اور لینے کی تھی مگر جب بابا نے اس ریسپی ، کے بنانے کی ترکیب بتائی تو مجھے

> **اتنا وسیع گھر کسی خوشحال آدمی کا ہی ہوسکتا ہے**

جھرجھری آ گئی۔

اور لے لو۔ انہوں نے ڈش آگے کر دی۔

نہیں بس بابا۔ اور نہیں چاہیے۔ ٹمیٹو جوس لے دیں۔ اچھا یہ سینڈوچ لے لو۔ یا روسٹ پیس، کیک تو پسند ہے۔

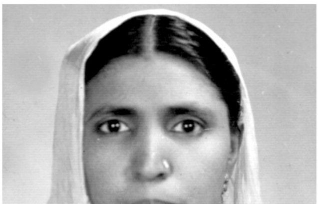

میری والدہ بشیر بیگم (1950)

میرے والد محمد افضل خان

اور کچھ نہیں بابا۔ تب انہوں نے مجھے اورنج جوس لے دیا۔ بسکٹ ہی میں نے کھائے دوسری کسی چیز کو من نہیں کیا۔ کیونکہ آنتوں میں قیمہ بھرنے کا سن کر میری بھوک ہی مرگئی تھی۔ جانے کتنا طویل سفر تھا مگر آخر سفر تمام ہوا۔

یہ شام سے کچھ بعد کا وقت تھا۔ جب ہم لندن کے قریبی ایئرپورٹ سے باہر آئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ کراچی کے موسم کے مقابلے میں یہاں تو دسمبر جیسی سردی تھی حالانکہ میں نے لینن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے جہاز

**جتنی مالیت کے سکے ڈالتے**
**اسی حساب سے گیس مہیا ہو جاتی**

میں پاپا نے مجھ کو اونی سوئٹر پہنا دیا تھا۔

مجھے زیادہ سردی لگنے لگی تو امی کی طرف جانا چاہا جو ہمارے پیچھے کھڑے تھیں۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر شخص وہاں آ گیا۔ اس نے گرمجوشی کے ساتھ بابا سے ہاتھ ملایا اور پنجابی میں میرے والد سے باتیں کرنے لگا۔ بابا نے کہا انکل سے ملو۔ انکل نے مہربان مسکراہٹ کے ساتھ ہم بچوں کا استقبال کیا۔

ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے محسوس کر لیا کہ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ چلو بیٹی۔ جلدی سے وہ دیکھو گاڑی سامنے ہی ہے۔ وہ کالے رنگ کی بڑی اور کشادہ گاڑی لائے تھے۔ تھوڑی سی دوری پر پارکنگ تھی، مگر یہ چند قدم چلتے ہوئے بھی میری ٹانگیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ گاڑی کے اندر بیٹھتے ہی مجھے چین آ گیا۔ تبھی بابا بھی امی اور میری تینوں بہنوں کے ساتھ گاڑی تک پہنچ گئے۔ اماں نے حسب معمول برقع اوڑھا ہوا تھا۔ انکل پابند صوم وصلوٰۃ آدمی تھے انہوں نے امی کو ''السلام علیکم'' بھابھی کہا۔

ہمارے سوٹ کیس وغیرہ ڈگی میں رکھے جاچکے تو انکل نے

**عقبی باغ میں خودرو پھل پودے۔**
**مگر پھلدار درخت زیادہ**

ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بابا ان کے برابر بیٹھے تھے اور دونوں دوست آپس میں، دوران سفر باتیں کرتے جا رہے تھے، پیچھے کی نشست پر امی خاموش بیٹھی تھیں، شنو ان کی گود میں تھی ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ امی کی گود میں سر رکھ دوں، معلوم نہیں گاڑی نے کتنا سفر طے کیا، انکل کا گھر لندن شہر سے قریب کہیں مضافاتی علاقے میں تھا۔ اس جگہ کا نام میں نے ''مے دی این'' (یا پھر میڈین ہل) سنا تھا۔

بہر حال کچھ مسافت طے کر کے جب ہم انکل کے گھر کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تھے تب پوری رات زمین پر اتر چکی تھی

رات کے کیا بج رہے تھے نہیں معلوم، لیکن اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ کوئی بارونق روشنیوں بھرا بڑا شہر نہیں تھا۔

انکل کا نام اب بھی مجھے یاد نہیں آ رہا ہے فرضی جام انکل رفیع لکھ دیتی ہوں۔ البتہ ان کی بیٹی کا نام رافعہ مجھے اچھی طرح یاد رہ گیا ہے۔

انکل رفیع کی بیگم بھی میری امی کی طرح بالکل دیسی قسم کی خاتون تھیں عرصہ سے برطانیہ میں مقیم رہنے کی وجہ سے سادی انگریزی بول سکتی تھیں۔ امی سے اور گھر میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ

ہمارے میزبان کی بیٹی میری سہیلی رفیعہ۔ بہنیں عزیزہ۔ فہمیدہ اور اسلم (طفیل کا بھائی)۔ (1950)

پنجابی میں بات کرتی تھیں، اس لیے ان کے بچے اپنی مادری زبان بول اور سمجھ سکتے تھے۔

ہماری پہنچنے کے دس منٹ بعد آنٹی اور ان کی بیٹی کھانا لے کر گئیں جیسے کہ وہ ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔ امی سے پنجابی میں کچھ دیر بات کی خیر خیریت پوچھی۔ اور کہا آپ کھانا کھایئے اور آرام کیجئے سفر سے تھک گئے ہوں گے آپ لوگ۔ میں صبح ملنے آؤں گی۔

میں نے کھانا نہیں کھایا۔ سفر کی تھکن سے بخار ہو گیا تھا، کمرے میں پلنگ بچھے ہوئے تھے جن پر سفید چادریں تھیں اور لحاف رکھے ہوئے تھے، تکیے بھی نرم اور آرام دہ تھے، کمرے میں ہیٹر چل رہا تھا۔ بابا کے دوست شیخ طفیل کا چھوٹا بھائی اسلم کراچی سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا۔ امی نے اسے کھانا دیا۔ پھر وہ اس گھر کے گیسٹ روم میں سونے کے لیے چلا گیا۔ یہ گیسٹ روم چھوٹا سا تھا۔

امی نے مجھے کہا واش روم سے ہو لو۔ اور سفر والا لباس بھی بدل لو۔ انہوں نے سفری بیگ سے ایک جوڑا نکال کر دیا۔ مگر لباس تبدیل کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ بغیر کپڑے بدلے ہی بستر میں گھس گئی اور نرم نرم لحاف کی گرمی پاتے ہی سو گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو دن کچھ روشن سا تھا، بخار بھی اتر گیا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر لباس تبدیل کیا میری ماں چھوٹی بہنوں کو تیار کر رہی تھیں، انہوں نے سوٹ کیس سے مزید کچھ گرم کپڑے نکال لیے تھے، یہاں جون جولائی میں بھی کافی ٹھنڈ تھی، شنو (شہناز) تو وہ ہر وقت ایک چھوٹے سے کمبل میں لپیٹے رہتی تھیں۔ میری تیسرے نمبر والی بہن فہمیدہ تقریباً تین برس کی ہوگی وہ ہر دم اماں کے گھٹنوں سے لگی رہتی تھی۔

میری سگی دوسرے نمبر والی بہن عزیزہ تھی جو مجھ سے دو یا ڈھائی

سال چھوٹی تھی وہ اماں کے پاس نہیں ٹکتی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ رہتی، سوتی بھی میرے پاس تھی۔

ہم نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے ہی تھے کہ خاتون خانہ نے ناشتہ اور چائے کی ٹرے بھجوادی، ان کا کچن قریب ہی تھا سو رافعیہ یا اس کا بھائی اکثر ناشتہ اور کھانا ٹرالی میں رکھ کر لے آتے تھے۔

ناشتے کے بعد میری طبیعت سنبھل گئی۔ اب باہر کی دنیا دیکھنے کو دل مچلنے لگا ہمارے میزبان انکل رفیع کی طرف سے جو رہائش ہمیں ملی تھی وہ ایک مکمل گیسٹ ہاؤس تھا۔ دو بیڈ روم بمعہ ایک گیسٹ روم۔ اور اس میں ایک چھوٹا سا ٹی وی لاؤنج بھی تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس ان کی رہائش گاہ کا ہی ایک حصہ تھا۔ انکل کے گھر اور ہماری اس رہائش کے بیچ ایک کشادہ راہداری تھی جو پوری عمارت کو جوڑتی تھی، اس راہداری میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں وہ اوپر کی منزل کو جاتی تھیں' جہاں دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ جن میں انکل کے پاکستانی مسلم کرایہ دار رہتے تھے، راہداری کے سامنے کوئی گیٹ یا دروازہ نہیں لگا ہوا تھا یہ اوپن تھا، اور یہ کرایہ داروں کے بھی باہر آنے جانے کا رستہ تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے اندر جانے کا دروازہ اسی راہداری میں کھلتا تھا جبکہ انکل کے گھر کے کچن کا عقبی دروازہ بھی اس راہداری میں ہی کھلتا تھا۔

میں جب پہلی بار کمرے سے باہر نکلی مجھے سامنے کی دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا سیڑھی کے سامنے سے گزرتی میں اس کے اندر چلی گئی۔ یہ ان کا کچن تھا، جہاں آنٹی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ اور سنک میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہاں نوکر نہیں ہوتے تھے، تمام کام مسز رفیع کو خود ہی کرنے پڑتے تھے۔

انکل رفیع کا گھر کافی بڑا تھا، ان کے گھر کے تمام افراد کا اپنا علیحدہ بیڈ روم تھا۔ ان کے چار بچے تھے گویا پانچ بیڈ روم پھر ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لاؤنج، کچن کے ساتھ پینٹری کہ یہ ایک بڑا فارم ہاؤس تھا جس کے دونوں اطراف پھول دار پودے سبز باڑیں۔ اور عقبی جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ یہ سب رقبہ تقریباً چار بیگھوں سے بھی زیادہ کا ہوگا۔

آپ سوچیے 1950 میں لندن کی مضافات میں فارم ہاؤس اور تعمیرات کیسی ہوتی ہوں گی، یقیناً اتنا وسیع گھر کسی خوشحال آدمی کا ہی ہوسکتا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان دنوں وہاں آتش دانوں میں لکڑیوں کی موٹے موٹے چوکور ٹکڑے گھر کو گرم رکھنے کو، جلائے جاتے تھے۔ لیکن انکل رفیع کے گھر کے ہیٹر، گیس سے جلتے تھے۔ اور جو گیسٹ ہاؤس رہائش کے لیے انہوں نے ہم کو دیا تھا اس میں بھی ساتھ ایک میٹر لگا ہوا تھا۔ اس میٹر سے متصل ایک بکس تھا جو لاکڈ تھا۔ اس بکس میں سوراخ کے اندر سکے ڈالتے تھے۔ تبھی گیس آنے لگتی اور ہیٹر چلنے لگتا۔ جتنی مالیت کے سکے ڈالے جاتے اسی حساب سے گیس مہیا ہوتی تھی گیس کم ہوجاتی پھر سکے ڈال دیتے تھے۔

میرے والد نے ایک خوبصورت سے گول ڈبے میں بہت سے سکے شلنگ اور پینیز بھری رکھے تھے۔ وہ میٹر دیکھ کر ضرورت کے مطابق یہ سکے بکس میں ڈالتے تھے اور ہیٹر مسلسل جلتا رہتا تھا۔

بڑے اور پُر رونق شہروں سے کچھ دوری پر ہمیشہ فارم ہاؤس کی

**ہر پھول کی پتی کی ڈیزائننگ دوسری پتیوں سے بالکل الگ**

اپنی افادیت اور خوبصورتی ہوتی ہے یہ جگہیں قدرتی حسن سے مالا مال ہوتی ہیں اور نیچر سے قریب زندگی ہمیشہ زیادہ پُر سکون ہوتی ہے۔

یہاں بھی سڑک پر ٹریفک کا ہام گام نہیں تھا اور نہ انسانوں کا رش تھا۔ دیکھنے کو ویران اور سنسان علاقہ تھا ہر طرف خاموشی، شاید

والد محمد افضل خان بغداد ہوٹل میں

اتنی خاموشی میں رہنا اکثر لوگ پسند نہ کرتے ہوں، مجھے تو یہاں چاروں طرف پھول، ہری بھری گھاس کے قطعات اور رہائش گاہ کے عقبی باغ کی وجہ سے یہ جگہ بہت عمدہ لگتی تھی۔ پہلی بار انکل رفیع کی بیٹی رافعیہ اس باغ میں لے گئی تھی۔ یہ لڑکی مجھ سے تین سال بڑی تھی اور میرے ساتھ پنجابی میں بات کرتی تھی۔

عقبی باغ بہت خوبصورت تھا یہ تقریباً ڈیڑھ بیگھوں پر محیط ہوگا۔

**ایک شخص صبح سویرے دودھ بھری کانچ کی بوتلیں گیٹ پر رکھ کر چلا جاتا**

اس میں کچھ خودرو پھول پودے تھے ہی لیکن پھل دار درخت زیادہ تھے۔ اخروٹ، ناشپاتی، سیب، کالے شہتوت کے درخت اور نہ جانے کتنی قسم کی بیریز تھیں۔ رافعیہ کا قد مجھ سے بڑا تھا وہ شاخوں کو پکڑ لیتی اور نیچے کو جھکاتی تو میں اچک اچک کر ناشپاتیاں توڑ لیتی تھی یہ بارش کے پانی سے نہائی ہوئی مگر اس قدر ٹھنڈی ہوتیں کہ ان میں دانت کھبونے سے ایسا لگتا کہ ان کے اندر برف جمی ہوئی ہے دانت بھی برف جیسے ہوجاتے تھے۔

کالے توت کے درخت کے ساتھ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ میں سیڑھی پر چڑھ کر آسانی سے یہ کالے شہتوت توڑ لیتی تھی۔ یہ کھٹے میٹھے قرمزی رنگ کے رس سے بھرے ہوتے بہت مزیدار لگتے۔

جس موسم میں ہم وہاں تھے تب اخروٹ کے درختوں پر ابھی کچا پھل لگا ہوا تھا اور پھل کے اوپر سخت ہرے رنگ کے چھلکے کا خول چڑھا ہوتا تھا۔ اس پھل کو جب میں دانتوں سے توڑتی تو اندر سے کچا دودھ کی طرح سفید اخروٹ نکلتا، یہ بھی ذائقے میں مزیدار اور نرم ہوتا۔ مگر خول سے علیحدہ کرتے ہوئے انگلیاں دانت ہونٹ سبھی دنداسے کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔

انکل کے گھر کی عقبی جانب والی کھڑکیاں اس باغ میں کھلتی تھیں لیکن یہاں کے لوگ بچوں کو پھل توڑ کر کھانے سے منع نہیں کرتے تھے۔ چھوٹے بچے تو ادھر آتے بھی نہیں تھے اور قد چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہ درختوں سے پھل نہیں توڑ سکتے تھے البتہ میں کبھی رافعیہ کے ساتھ اور کبھی عزیزہ کے ساتھ اس طرف جاتی تھی۔

رافعیہ کی دوستی اپنے کرایہ دار کی لڑکی سے زیادہ تھی۔ یہ دونوں ہم عمر تھیں اور پہلے سے ان کی دوستی تھی۔ دونوں کو ایک مشترکہ کھیل پسند تھا۔ وہ چار گیندوں کو بالترتیب ہوا میں اچھالتیں اور پھر باری باری اس طرح سے ان گیندوں کو کیچ کر کے دوبارہ ہوا میں اچھالتی رہتی کہ ایک گیند بھی زمین پر نہیں گرتی تھی۔

رافعیہ اس کھیل میں ماہر تھی مگر مجھے یہ کرتب نہیں آتا تھا۔ میں صرف ان کو دیکھتی تھی۔ تب میں خود کو ان کے بیچ فالتو سمجھتی اور بور ہوجاتی۔ میں نے اپنی دلچسپیاں ان سے الگ کرلیں۔ میری دلچسپی اب باغوں اور پھولوں میں تھی۔ ایک ایک پھول اس کی بناوٹ اور رنگ کو دیکھتی اور پتیوں کو پکڑ کر ان کے اندر کی رگیں گنتی۔ ہر پھول کی پتی کا ڈیزائن دوسرے پھولوں کی پتیوں سے الگ ہوتا ور ہر ایک پتی میں ایک طرح کی رگوں کی طرح ڈیزائن ہوتا۔ جانے ایسے مشغلوں میں کیا تلاش کرتی تھی۔ ہر اک شاخ کو پکڑ کر دیکھتی جیسے کہ میں باٹنی کے مضمون میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ شاید کہ یہ قدرتی شوق ہوتے ہیں کہ ایسے مشغلے بچپن میں بھی لطف دیتے ہیں اور اس وقت کی یادیں امر ہوجاتی

ہیں۔

عزیزہ بے چاری کی تو اپنی کوئی زندگی ہی نہیں تھی وہ بس میرے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی تھی۔ میرے ساتھ کی خاطر۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں۔ ان دنوں اسکولوں میں چھٹیاں تھیں، کیونکہ سبھی بچے سامنے والے گراؤنڈ میں ریت کے ڈھیر پر کھیلتے یا اپنی چھوٹی چھوٹی سائیکلیں چلاتے۔ یہ بچے فارم ہاؤس کے اندر ہی کھیلتے تھے۔ یہاں کھیلنے کو کافی کھلی جگہ موجود تھی اس لیے باہر جانے کی انہیں ضرورت نہیں تھی۔

فارم ہاؤس کے اطراف چاردیواری تھی اور جہاں دیوار یا فینس نہ تھی وہاں جھاڑیوں کی باڑ لگی ہوتی تھی۔ ریت کا ڈھیر بھی بچوں کے کھیلنے کے لیے ڈالا گیا تھا۔ یہ ہماری عارضی قیام گاہ یعنی گیسٹ ہاؤس کے پاس ہی پڑا تھا۔ جس پر چھوٹی چھوٹی کدالیں اور ننھی منی بالٹیاں۔ اسی طرح کے کھلونے پڑے رہتے تھے۔ کھیلنے سے جب بچوں کا دل بھر جاتا تو وہ یہ کھلونے ریت پر ہی چھوڑ کر چلے جاتے اپنی سائیکلیں بھی یہیں پڑی رہنے دیتے۔

میں ریت پر نہیں کھیلتی تھی۔ اردگرد کا مشاہدہ کرنے میں لگی رہتی۔ مثلاً صبح سویرے روزانہ۔ مقررہ وقت پر گاڑی آتی جس میں سے ایک شخص دودھ کی بوتلیں لے کر اترتا۔ یہ کانچ کی بوتلیں دودھ سے بھری ہوتیں ان کو وہ مین گیٹ پر رکھ کر چلا جاتا۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کی بیل بجتی۔ آنٹی فوراً کچن والے دروازے سے جو راہداری میں کھلتا تھا نکلتیں۔ میں ان کے قدموں کی آہٹ سن لیتی وہ گیٹ پر چلی جاتیں، ایک شخص گاڑی سے مختلف سبزیوں کے ڈبے اور باسکٹیں اتار کر پھاٹک پر رکھ دیتا۔ مسز رفیع۔ اپنی پسند سے سبزیاں لیتیں۔ وہ وہاں بیٹھ جاتیں اور چن چن کر سبزیوں کو اپنی باسکٹ میں ڈالتی جاتیں۔ میں بھی ان کے پیچھے جا کھڑی ہوتی۔

یہ سبزیاں سائز میں چھوٹی ہوتیں ٹماٹر بھی چھوٹے چھوٹے اور چمکدار۔ ایک دم سرخ جن کے اوپری سرے کے اوپر ہرے رنگ کی تلی سی نوکیلی پتیوں کا تاج سجا ہوتا۔ جو اس بات کی گواہی دیتا کہ ٹماٹر ابھی توڑے گئے ہیں۔ اور بالکل تازہ ہیں۔ ان کا سرخ سرخ رس بہت ذائقے دار ہوتا تھا۔

میں تو آنٹی کی ''ہیلپ'' کے بہانے وہاں کھڑی رہتی تھی مگر حیران ہوتی کہ سبزیاں سائز میں اتنی چھوٹی کیوں ہیں۔ گوبھی، شلجم، مولیاں، گاجریں جیسے گڑیوں کے کھیت سے توڑ کر لائی گئی ہوں جبکہ ہماری طرف تو یہ سبزیاں بڑی ہوتی تھیں البتہ شملہ مرچ جسامت میں بڑی ہوتی ایک مرچ کے چار ٹکڑے کر کے آنٹی آلو گوشت کے سالن کے اوپر دم میں ڈالتی تھیں۔

سوچتی ہوں چونکہ یہ مضافاتی علاقہ تھا ممکن ہے وہاں کھیت نزدیک ہوں۔ اور تب وہاں کے کسان بغیر مصنوعی کھاد کے، سبزیاں اگاتے ہوں جن کو آج آرگینک سبزیاں کہا جاتا ہے۔ میں ان کی مدد کو آنٹی کی چھوٹی باسکٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آتی (

آنٹی گوشت میں ہلکا شوربا رکھتیں اور سبزی ضرور ڈالتیں۔ خالص دیسی طریقے سے دیسی کھانے ہی پکاتی تھیں ان کے گھر کا رہن سہن بھی خالصتاً مشرقی تھا۔ وہ اکثر گوشت۔ گوبھی، یا گوشت میں شلجم، کبھی آلو ڈالتیں۔ کھانے پنجابی طرز کے ہوتے۔

قیمہ آلو۔ قیمہ مٹر۔ ساگ پالک۔ اور یخنی والا سفید پلاؤ۔ میٹھے میں سویاں۔ زردہ۔ کھیر لیکن بریانی، قورمہ، تنجن، نہاری وغیرہ بنانے سے شغف نہیں تھا۔ شاید محنت سے بننے والے کھانے پکانے سے

## آنٹی۔ مجھے کام بتایئے۔ کیا برتن دھودوں

گریز کرتی تھیں بچاری آنٹی کو گھر کے سبھی کام خود کرنے پڑتے تھے۔

میں کبھی کبھی راہداری سے ان کے کچن میں چلی جاتی وہ کام میں مصروف ہوتیں۔

''آنٹی مجھے کام بتایئے۔ کیا میں برتن دھودوں۔ مجھے برتن دھونے آتے ہیں۔''

''اچھا دھودو'' انہوں نے مجھے وہی برتن الگ کر کے دھونے کو دیے صبح جن برتنوں میں ہمارا ناشتہ بھجوایا تھا۔ اس کے بعد میرا یہ معمول ہوگیا۔ جو برتن ہمیں وہ کھانے اور ناشتے میں بھیجتیں۔ میں ان کو کمرے سے کچن میں لے جا کر سنک میں رکھ دیتی۔ نل میں گرم پانی آتا رہتا اور میں وہ سارے برتن دھو کر رکھ آتی جو ہم نے استعمال کیے ہوتے۔ امی شہناز کی وجہ سے کم ہی کچن میں جاتیں۔ وہ آتیں بھی تو آنٹی ان کو کام نہ کرنے دیتیں۔

ان دنوں میرے والد لندن شہر میں کسی اچھی رہائش کی تلاش

## ایک پودے نے پہلے مجھے پھر میری بہن کو کاٹ لیا

میں تھے تبھی ہم لوگوں کو ڈیڑھ ماہ انکل رفیع کے گھر قیام کرنا پڑا تھا۔ یہاں اور تو کوئی مشغلہ نہ تھا ہم کو ابھی اسکول میں داخلہ بھی نہیں ملا تھا۔ لے دے کر ایک عقبی باغ ہی تھا جہاں میں قدرتی پودوں کے مطالعے میں وقت پاس کرتی رہتی تھی۔ مجھے یہ سیرگاہ اس لیے پسند تھی کہ کرایہ داروں کے چھوٹے بچے سامنے فارم ہاؤس کے اندر گراؤنڈ میں کھیلتے تھے اور وہ عقبی باغ میں نہیں آتے تھے۔ ادھر کا میں ہی رُخ کرتی اور عزیزہ بے چاری میرے ساتھ ساتھ چلتی رہتی۔ وہ کہاں جاتی۔ اور کس سے کھیلتی۔ وہ تو اتنی کم سخن تھی کہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ بچے انگلش بولتے یا پنجابی۔ کسی بچے سے اس کی دوستی نہ ہوسکی۔

ایک دن باغ کے آخری کونے میں اگے ہوئے ایک خودرو پودے کو میں نے چھوا تو میری انگلی میں کرنٹ سا لگا جیسے پودے نے مجھے ڈنک مار دیا ہو۔ تبھی مجھے کانٹے کے چبھنے جیسی تکلیف محسوس ہوئی۔ میں نے تکلیف دبانے کو جلدی سے انگلی مٹھی میں دبالی۔ کوئی بھڑ یا شہد کی مکھی بھی وہاں نہیں تھی۔ بہرحال سارا وقت یہی تجسس ستاتا رہا کہ یہ کیا تھا۔ اور کیوں ہوا۔ پودے تو ڈنک نہیں مارتے۔

اگلے دن عزیزہ کے ساتھ دوبارہ اس پودے کے پاس پہنچی۔ اب کے اس پر تجربہ کیا۔

عزیزہ سے کہا۔'' اس پودے کو ہاتھ لگاؤ۔'' اس بے خبر نے پودے کے پتوں کو پکڑ لیا فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور رونے لگی۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں اپنی بہن کو تکلیف تو نہ دینا چاہتی تھی بس تجسس کو مٹا رہی تھی کہ کیا واقعی پودے میں کرنٹ ہے یا کل مجھے کسی بھڑ یا شہد کی مکھی نے ڈنک مارا تھا۔

اب وہ روئے جاتی تھی اور میں اس کو چپ کرانے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ مگر چپ ہی نہ ہوئی ناشپاتی بھی توڑ کر دی۔ اس نے پرے پھینک دی۔ تبھی امی کے پاس لے جانا پڑا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ اس کو اتنی تکلیف نہیں ہو رہی جس قدر کہ واویلا کر کے مظلوم بن رہی ہے۔ اس نے امی کو روتے ہوئے بتایا۔

''اماں اس نے باغ میں مجھے پودے سے کٹوایا ہے۔''

''پودے سے کٹوایا ہے؟'' وہ حیران ہوگئیں کہ پودے بھی کاٹتے ہیں؟

''ہاں اماں یہ سچ کہہ رہی ہے کل جب میں نے اس پودے کو ہاتھ لگایا تھا مجھے بھی کرنٹ لگا تھا۔'' میں تو سچ بات بتانا چاہ رہی تھی مگر اماں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ بولیں۔'' جب تم کو کل سے پتہ تھا کہ پودے سے کرنٹ لگتا ہے تو پھر کیوں تم اس کو پودے کے پاس لے کر گئیں، جان بوجھ کر۔''

''ہاں امی اسی نے مجھے کہا کہ پودے کو ہاتھ لگاؤ۔'' اب تو میری بہن کی مظلومیت ثابت ہو چکی تھی۔

''سعیدہ۔ تم اس کو کہاں کہاں لے کر جاتی ہو یہ چھوٹی بہن ہے تمہاری اور تم اس کو زہریلے پودوں سے کٹواتی ہو۔''

اماں نے ہمارے باغ میں جانے پر پابندی لگادی۔ کہنے لگیں۔ ''اب تم صرف سامنے ہی کھیلنے جاسکتی ہو۔ تاکہ میں تم کو کھڑکی سے دیکھتی رہوں۔''

سامنے کیا تھا۔ خالی گراؤنڈ۔ یا پھر کھیلنے کو ریت کی ڈھیری پڑی ہوئی تھی۔ جو امی کے بیڈروم سے نظر آتی تھی۔ اس ریت پر بس چھوٹے بچے ہی کھیلتے تھے۔ میں ریت پر کیا کھیلوں گی یہاں میرے لیے تو ریسرچ کا کوئی سامان نہیں ہے۔

سامنے'' مین گیٹ'' تھا۔ اگر کھلا ہوتا تو سنسان سڑک نظر آتی یا سڑک پار فٹ پاتھ اور وہاں ایک دو بڑے بڑے گودام جیسے ہال جن میں جانے کیا رکھا جاتا تھا اکثر تو وہ بند ہی رہتے تھے، نہ بندہ نہ بندے کی ذات اور نہ کوئی چہل پہل۔ یا اللہ اس عزیزہ کی بچی نے مجھے کہاں پھنسا دیا تھا۔ (جاری ہے)

## پیرالٰہی بخش۔قائداعظم کے رفیق کار

> پی آئی بی کالونی کا نام تو آپ سب نے سنا ہوگا۔اس کے بانی تھے پیر الٰہی بخش۔وہ سندھ کے وزیراعلیٰ بھی رہے۔سندھ میں آباد۔انصارو مہاجر پیر الٰہی بخش کو ان کی مہاجرین کے لیے آبادکاری کی منصوبہ بندی اور سندھ میں آباد سب قبیلوں برادریوں کے لیے تعلیم کی اشاعت کے لیے خدمات کے حوالے سے یاد رکھتے ہیں۔ماہنامہ 'اطراف' پیر الٰہی بخش کی خدمات پر کئی مضامین پہلے بھی شائع کرچکا ہے۔اب اکتوبر میں ان کی برسی کے موقع پر ہم خصوصی گوشہ شائع کررہے ہیں۔علی اصغر صاحب نے اپنی زندگی پیر الٰہی بخش کی خدمات کے اعتراف کے لیے وقف کررکھی ہے۔ان کے تعاون سے ہی یہ تحریریں نذر قارئین ہیں۔محمد اسماعیل ذبیح تحریک پاکستان کے بے لوث عظیم کارکن تھے۔ان کا خراج عقیدت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

# پیرالٰہی بخش۔مہاجروں کی آبادکاری میں پیش پیش

**تحریر: علی اصغر**

پیرالٰہی بخش تحریک پاکستان کے مجاہد، قائداعظمؒ کے رفیق کار اور سابق وزیراعلیٰ سندھ جن کی برسی ہر سال 8 اکتوبر کر منائی جاتی ہے۔ برسی کے دن نا صرف کراچی بلکہ اندرون سندھ ان کی تعلیمی اور آباد

**1948 - پیرالٰہی بخش ہاؤسنگ سوسائٹی رجسٹرڈ کروائی**

کاری کے مطابق خدمات پر انہیں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

قائداعظمؒ نے جب گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور حلف برداری کی تقریب ہوئی تو تلاوت قرآن پاک کی سعادت پیر الٰہی بخش کو حاصل ہوئی۔ وہ نا صرف بابائے تعلیم تھے بلکہ 1947 میں مہاجروں کی آبادکاری کے سلسلے میں ہراول دستے میں شامل تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں پیر الٰہی بخش ہاؤسنگ سوسائٹی 1948 میں رجسٹرڈ کروائی۔ دہلی کالونی پیر آباد اور بعض دیگر آبادیاں ان کی مرہون منت ہیں۔

انہوں نے درجنوں کالجوں، بے شمار اسکولز، سندھ یونیورسٹی، کراچی

**پیر صاحب کے گھر کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے**

یونیورسٹی اور دیگر تعلیمی اداروں کا سنگ بنیاد رکھا۔ جب پیپلز پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس میں شامل ہوگئے اور اس کے بعد سابق سینئر صوبائی وزیر تعلیم پیر مظہر الحق کو ذوالفقار علی بھٹو کے پاس لے گئے اور ان سے کہا کہ اس نوجوان میں سیاست کی صلاحیت موجود ہے،

اسے عوام کی خدمت کے لئے اپنی پارٹی میں شامل کرلیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دست شفقت رکھا اور انہیں خوش آمدید کہا۔

پیر الٰہی بخش کی وصیت تھی میرے انتقال کے بعد میری تدفین پیر الٰہی بخش کالونی میں جامع مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ کی جائے۔ ان کا مزار اسی مسجد کے صدر دروازے کے ساتھ ہے۔ پیر صاحب جب تک زندہ رہے ان کے گھر کے دروازے کبھی بند نہ ہوئے۔ ہمیشہ بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے۔ اکثر خود بھی بچوں کو پڑھاتے تھے۔ بے شمار بچے ان کے خرچ پر تعلیم حاصل

پیر مظہر الحق کے صاحبزادے ایم پی اے بیرسٹر پیر مجیب الحق

کرتے تھے۔ انہیں تعلیم سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ کاشانہ پیر کو اعزاز حاصل ہے کہ وہاں شیخ مجیب الرحمن، مولانا بھاشانی، بھارت کے سابق صدر ذاکر حسین سمیت بے شمار تاریخ ساز شخصیات تشریف لا چکی ہیں۔ پیر صاحب ایک درویش صفت انسان تھے۔ وزیر اعلیٰ ہونے کے باوجود بغیر پروٹوکول کے پیدل لوگوں کے حال واحوال معلوم کرنے نکل جاتے۔ آج جب ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے ان جیسے قائدین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں میڈیا کے ذریعے پیر صاحب جیسی شخصیات کے کارناموں کو نوجوان نسل تک

**کاشانہ پیر میں شیخ مجیب الرحمٰن۔ مولانا بھاشانی۔ بھارت کے سابق صدر ذاکر حسین سمیت متعدد تاریخی شخصیات تشریف لائیں**

پہنچانا چاہیے۔ پیر الٰہی بخش کے فرزند پیر عبدالرشید میں بھی اپنے والد کا عوامی خدمت کا جذبہ موجود ہے جو ہمیشہ پیر الٰہی بخش کے احباب کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ وہی سادگی خدمت کا وہی جذبہ پیر عبدالرشید میں موجود ہے۔ آج بھی صوبائی اسمبلی سندھ میں خانوادہ پیر الٰہی بخش کا ہونہار بیرسٹر پیر مجیب الحق خدمت سے سرشار ارکان اسمبلی کے دل گرماتا ہے۔

آیئے۔ پیر الٰہی بخش کی برسی پر ان کے نقش قدم پر چلنے کی دُعا کریں۔ ان کے خاندان کی کامیابیوں کے لیے دُعا کریں۔

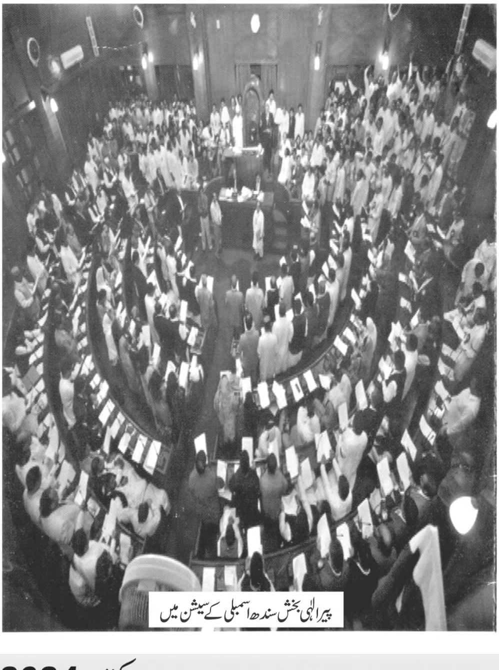

پیر الٰہی بخش سندھ اسمبلی کے سیشن میں

پیر الٰہی بخش ٹاور، سکھر

پیر الٰہی بخش لا کالج، دادو

# سندھ۔ عظیم صوبہ۔ بہاریوں کی آباد کاری کے لیے بہار کالونی

محمد اسماعیل ذبیح، تحریک پاکستان کے رہنما۔ ممبر آل انڈیا مسلم لیگ

جب میں تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لینے اور بھارتی حکومت کی طرف سے بار بار قید و بند کی سزائیں بھگتنے کے بعد بھارت سے نکال دیا گیا تو نومبر 1947 میں مستقل رہائش کے لیے کراچی آ گیا۔ کیونکہ سندھ ہی وہ صوبہ تھا جس کی اسمبلی میں قیام پاکستان کے لیے برصغیر میں پہلی بار تجویز پاس ہوئی تھی۔ اور یہی وہ صوبہ تھا جس نے جب صوبہ بہار میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تو پاکستان بننے سے پہلے ہی بہاریوں کی آباد کاری کے لیے کراچی میں بہار کالونی بنائی۔

جب میں نومبر 1947 میں کراچی آیا تو سندھی عوام نے انصار مکہ کی طرح مہاجروں کی آباد کاری کے لیے سندھ کے شہروں، ان کی عمارتوں اور زمینوں کو مہاجروں کے لیے کھول دیا۔

1947 کے بعد کئی سال تک جس عظیم محب وطن پاکستانی نے مہاجروں کی آباد کاری کے لیے تاریخ ساز کارنامے انجام

> **میں نومبر 1947 میں کراچی آیا تو سندھ کے شہری انصار مدینہ کی روایات پر عمل کر رہے تھے**

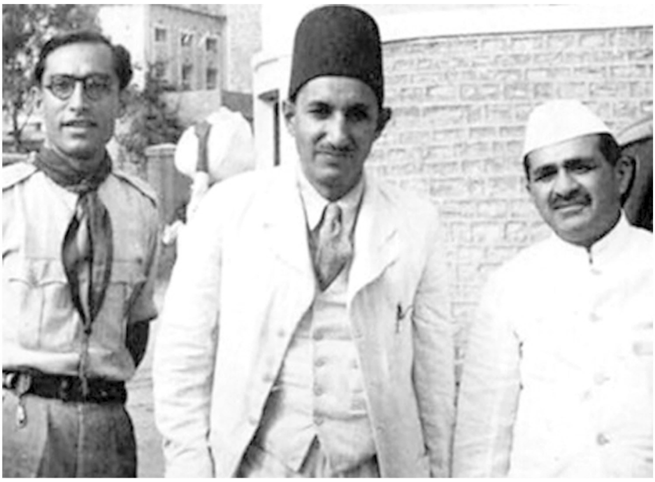

دیے ان میں اولیت کا شرف عالی قدر پیر الٰہی بخش مرحوم کو حاصل تھا جو سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ اس وقت سندھ میں کئی اور عظیم شخصیات تحریک پاکستان میں نمایاں تھیں۔ ان میں ایوب کھوڑو، میر غلام علی تالپور اور میران محمد شاہ شامل تھے اور سندھ کے ہر شہر اور قصبے میں مہاجروں کی اس تمام آباد کاری کے سرخیل اور رہنما پیر الٰہی بخش وزیر اعلیٰ سندھ تھے جو نہ صرف ایک پُرجوش علیگ تھے بلکہ تحریک پاکستان کے نہایت دلیر رہنما بھی تھے۔

یہ پیر الٰہی بخش مرحوم ہی تھے۔ جنہوں نے مہاجروں کی مستقل آباد کاری کے لیے ایک شاندار اقدام کیا اور چند پُرجوش کارکنوں کی ایک کمیٹی بنا کر جس کا میں بھی ایک رکن تھا ایک وسیع رقبے میں ہزاروں کوارٹروں پر مشتمل پیر الٰہی بخش کالونی کی بنیاد رکھ دی جس میں دو سال کے عرصے میں ان ہزاروں مہاجروں کو آباد کر دیا جو بھارت کے ہر گوشے سے پریشان حالت میں پاکستان میں آباد ہونے کے لیے آئے تھے۔

یہ پیر الٰہی بخش کالونی اب کراچی میں ایک پُر بہار چھوٹا سا شہر ہے جس میں معاشرے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی آبادی ہے اور

جہاں عظیم مورخ اور مفسر قرآن سید سلیمان ندوی صاحب نے بھی قیام فرمایا اور اگر چہ جنرل ایوب صاحب کے دَور میں ان کے وزیر جنرل اعظم خان نے بھی ایک بڑی بستی مہاجروں کی آبادکاری کے لیے کراچی میں قائم کی تھی لیکن پاکستان میں مہاجروں کی آباد کاری کے بابائے اعظم ہونے کا جو اعزاز مرحوم پیر الٰہی بخش کو حاصل ہے وہ تاریخ میں ثبت ہو چکا ہے۔

**پیر الٰہی بخش کی مہاجرین کی آبادکاری کے لیے مجوزہ کمیٹی کا رُکن میں بھی تھا**

میں نے کئی سال تک پیر الٰہی بخش مرحوم کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں نے سندھ میں جن دو اشخاص کو عظیم تر پایا ان میں شیخ عبدالمجید سندھی اور پیر الٰہی بخش بے مثال تھے۔

پاکستان پوسٹل سروسز کارپوریشن بے حد قابل مبارکباد ہے جس نے مشاہیر پاکستان کے سلسلے میں ان دو عظیم ہستیوں کے لیے یادگاری ٹکٹ جاری کیے۔

مجھے یقین کامل ہے کہ پیر الٰہی بخش مرحوم کا خانوادہ اس عظیم مشن کو جاری رکھے گا۔ جس کی شمع پیر صاحب مرحوم نے روشن کی ہے اور جس کا نام خدمت قومی اتحاد اور تعمیر و ترقی ہے۔

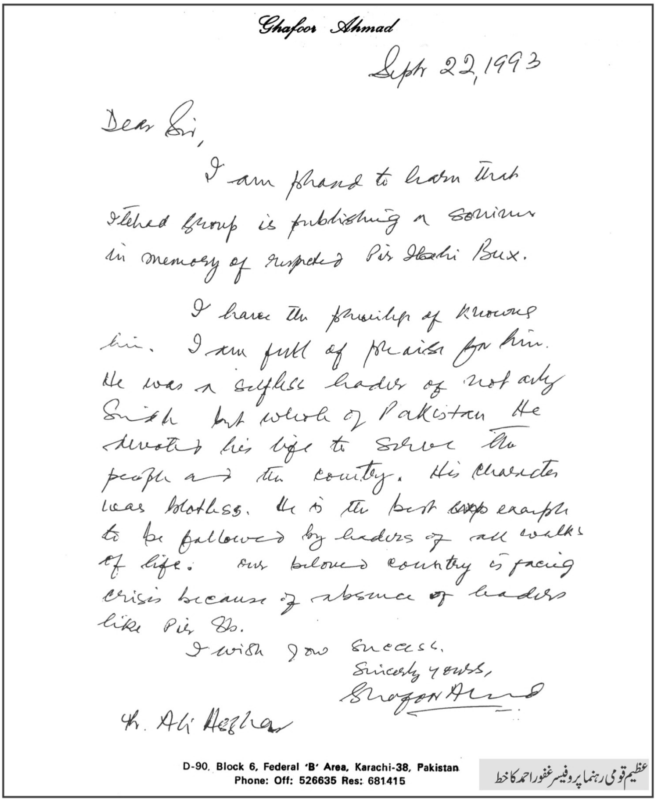

Ghafoor Ahmad

Sept 22, 1993

Dear Sir,

I am pleased to learn that Ittehad Group is publishing a souvenir in memory of respected Pir Ilahi Bux.

I have the privilege of knowing him. I am full of praise for him. He was a selfless leader of not only Sindh but whole of Pakistan. He devoted his life to serve the people and the country. His character was spotless. He is the best example to be followed by leaders of all walks of life. Our beloved country is facing crisis because of absence of leaders like Pir Sb.

I wish you success.

Sincerely yours,

Ghafoor Ahmad

Mr. Ali Asghar

D-90, Block 6, Federal 'B' Area, Karachi-38, Pakistan
Phone: Off: 526635 Res: 681415

عظیم قومی رہنما پروفیسر غفور احمد کا خط

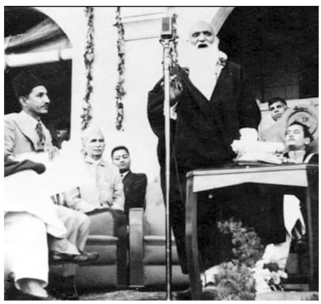

## جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا

فرید ذکریا عالمی شہرت یافتہ تجزیہ کار اور مورخ ہیں۔ ان کی تصنیف Post American World۔ انتہائی اہم اور چشم کشا تحقیقی دستاویز ہے۔ ماہنامہ 'اطراف' کی 2014 سے بنیادی انفرادیت یہی ہے کہ ہم دنیا بھر میں شائع ہونے والی اہم کتابوں کو پاکستانی نوجوانوں کے لیے اُردو میں منتقل کرتے ہیں اور سلسلہ وار پیش کرتے ہیں۔ سید عرفان علی یوسف مصنّف۔ مترجم۔ سینئر صحافی ان کتابوں کا بہت احتیاط سے تدبر سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہیں۔

# گزشتہ 500 برسوں میں تین بنیادی تبدیلیاں

قسط نمبر 2

مصنف: فرید ذکریا — تلخیص و ترجمہ: سید عرفان علی یوسف

### دیگر طاقتوں کا عروج

یہ کتاب امریکہ کے زوال کے بارے میں نہیں بلکہ دیگر ملکوں کے عروج کے بارے میں ہے۔ اس میں دنیا بھر میں رونما ہونے والی ایک عظیم تبدیلی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جس پر اگرچہ اکثر بحث کی جاتی ہے، لیکن اچھی طرح سے سمجھا نہیں جاتا۔ یہ فطری بات ہے۔ اس قسم کی تبدیلیاں، حتیٰ کہ سمندری تبدیلیاں بھی رفتہ رفتہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہم ایک نئے دور کی بات کرتے ہیں، لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے دنیا ایک جیسی ہے اور ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

پچھلے پانچ سو سالوں میں تین ٹیکٹونک طاقتیں منتقل ہوئیں۔ طاقت کی تقسیم میں یہ ایسی بنیادی تبدیلیاں تھیں جنہوں نے بین الاقوامی زندگی کو از سر نو تشکیل دیا۔ ان میں سیاست، اقتصادیات اور ثقافت شامل تھیں۔ پہلا مغربی دنیا کا عروج تھا، ایک ایسا عمل جو پندرہویں صدی میں شروع ہوا اور اٹھارویں صدی کے آخر میں ڈرامائی طور پر تیز ہو گیا۔ اس نے جدیدیت پیدا کی اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی، تجارت اور سرمایہ داری، زرعی اور صنعتی انقلابات شامل تھے۔ اس نے مغربی اقوام کا طویل سیاسی غلبہ پیدا کیا۔

دوسری تبدیلی، جو انیسویں صدی کے اختتامی سالوں میں ہوئی، امریکہ کا عروج تھا۔ رومی سامراجیت کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کا سب سے طاقتور ملک بن گیا۔ دنیا کا وہ واحد ملک جو دیگر اقوام کے ممکنہ اتحادوں سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ پچھلی صدی

**صفِ اوّل کی ریفائنری بھارت میں۔ دنیا کی سب سے بڑی فیکٹریاں چین میں**

کے بیشتر حصے میں، امریکہ کا عالمی اقتصادیات، سیاست، سائنس اور ثقافت پر غلبہ ہو گیا۔ پچھلے بیس سالوں میں یہ غلبہ بے مثال تھا جو جدید تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

اب ہم جدید دور کی طاقتوں کی تیسری تبدیلی سے گزر رہے ہیں۔ اسے "باقی ماندہ ملکوں کا عروج" کہا جا سکتا ہے۔ پچھلی چند دہائیوں کے دوران، دنیا بھر کے ممالک اقتصادی ترقی کی ایسی شرح حاصل کر رہے ہیں جس کا پہلے کبھی تصور نہیں تھا۔ یہ ترقی ایشیا میں سب سے زیادہ نظر آئی لیکن اس تک محدود نہیں رہی۔ اس لیے اس تبدیلی کو "ایشیا کا عروج" کہنا درست نہیں۔ 2006 اور 2007 میں 124 ممالک نے 4 فیصد یا اس سے زیادہ شرح سے ترقی کی۔ اس میں افریقہ کے 30 سے زیادہ ممالک شامل ہیں، جو براعظم افریقہ کا دو تہائی حصہ ہیں۔ انتونی وان اجتمائل Antoine van Agtmael، فنڈ منیجر نے ان کے لیے "ابھرتی ہوئی مارکیٹوں" کی اصطلاح استعمال کی، اور 25 کمپنیوں کی نشاندہی کی جو ممکنہ طور پر دنیا کی اگلی عظیم کثیر قومی کمپنیاں بن سکتی ہیں۔ اس فہرست میں برازیل، میکسیکو، جنوبی کوریا اور تائیوان کی چار، بھارت سے تین؛ چین سے دو؛ اور ارجنٹینا، چلی، ملائیشیا اور جنوبی افریقہ سے ایک ایک کمپنی شامل ہیں۔ امریکہ سے باہر ادھر ادھر دیکھیں۔ دنیا کی سب

**حکومتوں کی بجائے گروہوں اور افراد کا کنٹرول بڑھ رہا ہے**

سے اونچی عمارت اب تائی پے میں ہے، اور یہ جلد ہی دبئی میں تعمیر ہونے والی دنیا کی سب سے اونچی عمارت سے آگے نکل جائے گی۔ دنیا کا سب سے امیر آدمی میکسیکن ہے، اور اس کی سب سے بڑی

عوامی تجارت چینی کمپنی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا طیارہ روس اور یوکرین میں بنایا گیا۔ صف اول کی ریفائنری بھارت میں زیر تعمیر ہے، اور دنیا کی سب سے بڑی فیکٹریاں چین میں ہیں۔ لندن سرکردہ مالیاتی عالمی مرکز بنتا جا رہا ہے، اور متحدہ عرب امارات دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند سرمایہ کاری فنڈ کا گھر ہے۔ ایک بار غیر ملکیوں نے امریکی آئیکنز کو دنیا میں سب سے زیادہ قابل ذکر قرار دیا تھا۔ لیکن اب دنیا کا سب سے بڑا فیرس وہیل سنگاپور میں ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا کیسینو لاس ویگاس میں نہیں بلکہ مکاؤ میں ہے، جس نے جوئے کی سالانہ آمدنی میں لاس ویگاس کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ فلم سازی اور فروخت ہونے والی ٹکٹوں کے اعتبار سے دنیا کیسب سے بڑی فلم انڈسٹری بالی ووڈ (بھارت میں) ہے، ہالی ووڈ اپنا پہلا درجہ کھو چکا۔ یہاں تک کہ خرید و فروخت میں عالمی سطح پر کبھی، امریکہ کو پہلا درجہ حاصل تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے دس تجارتی مراکز (مالز) میں سے صرف ایک امریکہ میں ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مال بیجنگ میں ہے۔ یہ حیرت انگیز ہے کہ صرف دس سال پہلے، امریکہ ان زمروں میں سرفہرست تھا۔

اس بڑھتی ہوئی خوشحالی پر توجہ مرکوز کرنا عجیب ہوسکتا ہے کیونکہ اب بھی کروڑوں لوگ مایوس کن غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت، ایک ڈالر یا اس سے کم یومیہ پر زندگی گزارنے والے لوگوں کا حصہ 1981 میں 40 فیصد سے گھٹ کر 2004 میں 18 فیصد رہ گیا، اور 2015 میں یہ مزید 12 فیصد تک گرنے کا تخمینہ تھا۔ غربت کی شرح ان ممالک میں گر رہی ہے جہاں دنیا کی 80 فیصد آبادی رہائش پذیر ہے۔ 50 ممالک پر جہاں زمین کے غریب ترین لوگ رہتے ہیں، فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ دیگر 142 ممالک میں چین، بھارت، برازیل، روس، انڈونیشیا، ترکی، کینیا اور جنوبی افریقہ شامل ہیں۔ غریب آہستہ آہستہ پیداواری اور بڑھتی ہوئی معیشتوں میں جذب ہو رہے ہیں۔ پہلی بار، ہم حقیقی طور پر عالمی ترقی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک نیا بین الاقوامی نظام تشکیل دیا جا رہا ہے جس میں دنیا کے تمام حصوں میں بہت سے ممالک نمایاں کھلاڑی بن چکے ہیں۔ یہ ایک نئے عالمی نظام کی پیدائش ہے۔

اس نئے دور کا ایک پہلو ریاستوں میں دوسرے اداکاروں کی طاقت کا پھیلاؤ ہے۔ "آسائش" جو بڑھ رہی ہے اس میں بہت سے غیر ریاستی اداکار شامل ہیں۔ گروہ اور افراد با اختیار ہو گئے ہیں، اور درجہ بندی، مرکزیت اور کنٹرول کمزور ہو رہا ہے۔ وہ افعال جو کبھی حکومتوں کے کنٹرول میں تھے اب ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔

بین الاقوامی اداروں جیسے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور یورپی یونین کا دخل بڑھ گیا ہے۔ ملکوں میں مختلف مسائل کے پیش نظر غیر سرکاری گروہوں کی ہنگامہ آرائی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کارپوریشنیں اور سرمایہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے۔ اس کا مقصد کاروبار کرنے کے لیے بہترین جگہ تلاش کرنا ہے۔ القاعدہ، منشیات کے کارٹلز، باغی اور ہر قسم کی نیم عسکری تنظیمیں جیسے دہشت گرد، بین الاقوامی نظام کے اندر جگہ کی تلاش میں ہیں۔ ملکی طاقت قومی ریاستوں میں، اوپر، نیچے، اور اطراف میں منتقل ہو رہی ہے۔ ایسے ماحول میں قومی طاقت کا روایتی استعمال، اور معاشی اور فوجی دونوں طرح کی موثریت کم ہوگئی ہے۔

ابھرتا ہوا بین الاقوامی نظام پہلے کے نظام سے بالکل مختلف ہونے کا امکان ہے۔ سو سال پہلے، ایک کثیر قطبی نظام تھا جسے یورپی حکومتوں کا مجموعہ چلا رہا تھا، اس میں مسلسل بدلتے اتحاد، رقابتیں، غلط تخمینے اور خانہ جنگیاں تھیں۔ اس کے بعد سرد جنگ کی دو قطبیت کا زمانہ آیا، جو کئی اعتبار سے زیادہ مستحکم تھا، لیکن دو عالمی طاقتوں نے ایک دوسرے کے ہر اقدام پر ردعمل ظاہر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1991 کے بعد سے، دنیا امریکی غلبے کے تحت رہ رہی ہے۔ ایک منفرد، یک قطبی دنیا جس میں کھلی عالمی معیشت ڈرامائی طور پر توسیع پذیر ہے۔ یہ توسیع اب بین الاقوامی ترتیب میں اگلی تبدیلی کا باعث بن رہی ہے۔

سیاسی اور فوجی سطح پر، ہم واحد سپر پاور کی دنیا میں رہتے ہیں۔ لیکن دوسری جہتوں میں صنعتی، مالی، تعلیمی، سماجی، ثقافتی تقسیم طاقت پکڑ رہی ہے، اور یہ دنیائیں امریکی تسلط سے دور ہو رہی ہیں۔ اس کا

**دنیا بھر میں امریکی خارجہ پالیسی کی مذمت**

مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم امریکہ مخالف دور میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ہم امریکہ کے بعد کی دنیا کی طرف جا رہے ہیں، جس کی تعریف بہت سے لوگوں نے مختلف جگہوں پر کی ہے۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں کس قسم کے مواقع اور چیلنجز پیدا ہوں گے؟ امریکہ اور اس کے عالمی سطح پر غلبے پر کیا اثرات پڑیں گے؟ جنگ اور امن، معاشیات اور کاروبار، نظریات اور ثقافت کے لحاظ سے یہ نیا دور کیسا ہوگا؟ مختصر یہ کہ امریکہ کے بعد کی دنیا میں رہنے کا کیا مطلب ہوگا؟

### کھیل ختم؟

تصور کریں کہ یہ جنوری 2000 ہے، اور آپ مستقبل بینی کے کسی ماہر سے اگلے کئی سالوں کی عالمی معیشت کی پیشین گوئی کرنے کو کہتے ہیں۔ آپ اسے اپنی "کرسٹل گیند" کو دیکھنے میں مدد کے لیے کچھ سراغ دیتے ہیں۔ امریکہ کو تاریخ کے بدترین دہشت گرد حملے کا سامنا کرنا پڑے گا، آپ اس کو بتاتے ہیں، اور وہ دو جنگیں شروع کر واکے جواب دے گا، جن میں سے ایک یہ ہوگا کہ حالات بری طرح بگڑ جائیں گے اور عراق کو جو دنیا کا تیسرا سب سے بڑا تیل کے ذخائر والا ملک ہے، افراتفری کا شکار ہوجائے گا۔ ایران مشرق وسطیٰ میں طاقت حاصل کرلے گا اور جوہری صلاحیت کی طرف بڑھے گا۔ شمالی کوریا مزید آگے بڑھے گا اور دنیا کی آٹھویں اعلان کردہ جوہری طاقت بن جائے گا۔ روس اپنے پڑوسیوں اور مغرب کا دشمن اور سامراجی ہوجائے گا۔ لاطینی امریکہ میں، وینزویلا اس نسل کی سب سے زیادہ پرجوش مغرب مخالف مہم شروع کرے گا، اور دنیا میں بہت سے اتحادیوں اور مداحوں کو جیت لے گا۔ اسرائیل اور حزب اللہ جنوبی لبنان میں جنگ لڑیں گے، بیروت کی کمزور حکومت کو غیر مستحکم ہوگی، ایران شام کو اپنی جانب کھینچ لے گا، اور اسرائیل کو جھنجھوڑ دے گا۔ غزہ حماس کے زیر اقتدار ایک ناکام ریاست بن جائے گا، اور اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن مذاکرات ہوں گے لیکن فلسطینیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

"ان واقعات کو دیکھتے ہوئے، " آپ بابا سے پوچھیں گے، "اگلے چھ سالوں میں عالمی معیشت کیسی ہوگی؟"

یہ کوئی فرضی مکالمہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس ان سالوں کے بارے میں ماہرین کی پیشین گوئیاں ہیں لیکن وہ سب غلط نکلیں۔ درست پیشین گوئی یہ ہوتی کہ 2000 سے 2007 کے درمیان دنیا کی معیشت چار دہائیوں میں اپنی تیز ترین رفتار سے ترقی کرے گی۔ پوری دنیا میں فی شخص آمدنی تاریخ کے کسی بھی دوسرے دور کے مقابلے میں تیز رفتاری سے (3.2 فیصد) بڑھے گی۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے دو دہائیوں میں، ہم ایک ایسے تضاد سے گزرے، جس کا تجربہ ہم ہر صبح اخبارات پڑھتے ہوئے کرتے ہیں۔ بم دھماکوں، دہشت گردی کی سازشوں، بدمعاش اور باغی ریاستوں اور خانہ جنگی کی روزانہ رپورٹوں کے ساتھ، دنیا کی سیاست گہری پریشانی میں نظر آتی ہے لیکن پھر بھی رکاوٹوں اور بحرانوں کے باوجود عالمی معیشت آگے بڑھ رہی ہے، بلکہ مجموعی طور پر اب بھی بھرپور طریقے سے اوپر کی طرف اس کی پیش رفت جاری ہے۔ مارکیٹوں میں گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن معاشی خبروں پر نہیں۔ اخبار کا صفحہ اول کاروباری حصے سے غیر مربوط لگتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جولائی 2006 میں حزب اللہ کے ساتھ جنگ کے چند دنوں بعد اسرائیلی حکومت کے ایک سینئر رکن سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنے ملک کی سلامتی کے بارے میں حقیقی طور پر فکرمند تھے۔ حزب اللہ کے راکٹ اسرائیل تک اس سے کہیں زیادہ آگے تک پہنچ چکے تھے جتنا کہ لوگوں کے خیال میں ممکن تھا، اور اسرائیلی فوجی ردعمل نے ہمارے اعتماد کو متاثر نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے اس سے معیشت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ معیشت، ہم سب کو پریشان کر رہی ہے۔ "جنگ کے آخری دن اسٹاک مارکیٹ اپنے پہلے دن سے زیادہ تھی! شیکل، (اسرائیل کی کرنسی) کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ 'حکومت بہت زیادہ ڈر گئی تھی، لیکن بازار کا حال ایسا خراب نہیں تھا۔ عراق جنگ پر غور کریں، جس نے خطے میں گہری افراتفری پیدا کی اور پڑوس میں 20 لاکھ سے زیادہ بے گھر پناہ گزینوں کا ہجوم ہوگیا۔

ایسا لگتا ہے کہ سیاسی بحران کا خاتمہ یقینی ہے۔ لیکن عراق کی مشکلات نے اس خطے کو بڑی حد تک غیر مستحکم کیا ہے۔ آپ جہاں بھی جائیں،

لوگ غصے سے امریکی خارجہ پالیسی کی مذمت کرتے ہیں۔لیکن علاقائی عدم استحکام کا اصل ثبوت کہاں ہے؟ مشرق وسطیٰ کے بیشتر ممالک - مثال کے طور پر اردن، سعودی عرب اور مصر عروج پر ہیں۔ترکی کی معیشت، جس کی سرحد عراق کے ساتھ ملتی ہے، جنگ شروع ہونے کے بعد سے اوسطاً 7 فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر چکی ہے۔ابوظہبی اور دبئی، جو ہوائی جہاز کے ذریعے بغداد سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہیں، اس طرح دلکش، شاندار اور فلک بوس عمارتیں اس طرح سے بنا رہے ہیں جیسے وہ کسی دوسرے سیارے پر ہوں۔ وہ ممالک جنہوں نے خود کو عراق، شام اور ایران میں شامل کرلیا، وہ بڑی حد تک عالمی معیشت سے باہر ہیں اور انہیں اقتصادی مشکلات کا سامنا ہے۔

تنزل پذیر سیاست اور مضبوط معیشت کے درمیان اس مماثلت کی کیا وجہ ہے؟ بری خبروں کو زیادہ غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم پاگل پن کے دور میں جی رہے ہیں۔اس لیے جو کچھ آپ ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں اس پر یقین نہ کریں۔ ہمارا افسانوی تاثر ہمیشہ غلط نکلتا ہے۔گزشتہ دو دہائیوں میں جنگ اور منظم تشدد میں ڈرامائی طور پر کمی آئی ہے۔ٹیڈ رابرٹ گر اور یونیورسٹی آف میری لینڈ کے سنٹر فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ اینڈ کنفلیکٹ مینجمنٹ کے اسکالرز کی ایک ٹیم نے اعداد وشمار کا بغور جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے: "عالمی سطح پر جنگ کی عمومی شدت میں 1980 کی دہائی کے وسط سے ساٹھ فیصد سے زیادہ کمی آئی ہے۔سرد جنگ کے دوران تشدد 1950 کی دہائی کے اواخر سے 2004 کے آخر تک اپنی کم ترین سطح پر آ گیا۔سرد جنگ کے دوران تشدد میں 1950 اور 1990 کے درمیان چھ گنا اضافہ ہوا، لیکن یہ رجحان 1991 میں سوویت یونین کے ٹوٹنے سے ٹھیک پہلے عروج پر پہنچ گیا۔اور "سرد جنگ کے بعد پہلی دہائی میں ریاستوں کے درمیان اور ان کے اندر جنگ کی حد تقریباً نصف تک کم ہوگئی۔'' ہارورڈ کے پولی میتھ پروفیسر اسٹیون پنکر کا استدلال ہے کہ ''آج ہم شاید اپنی نسلوں کے وجود میں سب سے پرامن وقت میں رہ رہے ہیں۔"

حقیقت اور اس کے بارے میں ہمارے احساس کے درمیان مماثلت کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انہی دہائیوں کے دوران، ہم نے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں ایک انقلاب کا تجربہ کیا جو ہمیں دنیا بھر کی خبریں فوری، واضح اور مسلسل لاتا رہتا ہے۔موسم کی خرابی ''صدی کا طوفان'' ہے۔ ہر بم جو پھٹتا ہے بریکنگ نیوز ہے۔ان سب کو سیاق وسباق میں رکھنا مشکل ہے کیونکہ معلوماتی انقلاب بہت نیا ہے۔ہمیں 1970 کی دہائی میں کمبوڈیا کے قتل کے میدانوں میں مرنے والے تقریباً 20 لاکھ یا 1980 کی دہائی میں ایران عراق جنگ کی ریت میں مارے جانے والے دس لاکھ افراد کی روزانہ فوٹیج نہیں ملی۔ ہم نے 1990 کی دہائی میں کانگو کی جنگ کی زیادہ فوٹیج بھی نہیں دیکھی، جہاں لاکھوں لوگ مارے گئے۔لیکن اب، ہم تقریباً روزانہ، آئی ای ڈیز یا کار بموں یا راکٹوں کے المناک واقعات کے اثرات کی براہ راست نشریات دیکھتے ہیں۔ دہشت گردی اور تشدد کی بے ترتیبی، شہریوں کو نشانہ بنانا، اور جس آسانی سے جدید معاشروں میں داخل ہونا ممکن ہے، ہماری پریشانی میں اضافہ کرتا ہے۔ دہشت گردوں کے حملے کے بعد لوگ کہتے ہیں کہ "یہ میں ہی ہوں جو زندہ بچ گیا جو مر بھی سکتا تھا۔"

**مغرب کے خلاف جہاد اسلام کی اندرونی جنگ بن گیا**

اس سے ایک بہت ہی خطرناک دنیا کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔کسی بھی قسم کے منظم تشدد کے نتیجے میں آپ کے مرنے کے امکانات کم اور بہت کم ہوتے جا رہے ہیں۔اعداد وشمار بڑے ممالک کے درمیان جنگوں سے دور ایک وسیع رجحان کو ظاہر کرتے ہیں، اس قسم کے تنازع میں بڑے پیمانے پر جانی نقصان ہوتا ہے۔میں نہیں مانتا کہ جنگ متروک ہوگئی ہے۔انسانی فطرت بدل نہیں سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کیا ہے . تاریخ خاموشی کے ان ادوار کی گواہ ہے جن کے بعد غیر معمولی خونریزی ہوئی اور مقتولین

کی تعداد برائی کا واحد پیمانہ نہیں۔1990 کی دہائی کے اوائل میں سابق یوگوسلاویہ میں ہونے والی ہلاکتوں کی نوعیت ، پہلے سے سوچی سمجھی، مذہبی طور پر حوصلہ افزائی تھی، جس نے منظم طریقے سے اس جنگ کو فروغ دیا۔اس میں 200,000 ہلاکتیں ہوئیں۔ ہلاکتوں کی نسبتاً کم تعداد کے باوجود القاعدہ کی خوں ریزی، سر قلم کرنا، جان بوجھ کر بے گناہوں کو نشانہ بنانا بھیانک تھا۔ پھر بھی، اگر ہم اس دور کو سمجھنا چاہتے ہیں جس میں ہم رہ رہے ہیں، تو ہمیں سب سے پہلے اسے درست طریقے سے تاریخی تناظر میں بیان کرنا ہوگا۔

### اسلامی خطرہ:

لبرل جمہوریت کو ایک معقول متبادل کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے۔اب ہم جہادی خطرے پر غور کرتے ہیں۔ 9/11 سے پہلے، جب القاعدہ جیسے گروپ ریڈار کے تحت کام کرتے تھے، حکومتوں نے ان کے خلاف معمولی مزاحمت کی۔القاعدہ کے دہشت گرد دنیا بھر میں آزادانہ گھومتے پھرتے تھے، طاقت میں اضافہ کرتے تھے اور اکثر فوجی اہداف کو نشانہ بناتے تھے۔ان حملوں میں امریکیوں اور دیگر غیر ملکیوں کو ہلاک کیا جاتا تھا۔اس کے باوجود نقصان کافی حد تک محدود تھا۔2001 کے بعد سے، ہر جگہ کی حکومتیں دہشت گردوں کے نیٹ ورکس کا پردہ فاش کرنے، ان کو فنڈز کی فراہمی کا تعاقب کرنے، اور ان کے کارندوں کی بھرتی کرنے والوں کا سراغ لگانے میں جارحانہ رویہ اختیار کر رہی ہیں۔اس کے تقریباً فوری نتائج برآمد ہورہے ہیں۔دنیا کے سب سے بڑے مسلم ملک انڈونیشیا میں حکومت نے ملک کے سب سے مہلک جہادی گروپ اور 2002 میں بالی میں بم دھماکے کرنے والے جماعت اسلامیہ کے سربراہ اور فوجی رہنما دونوں کو گرفتار کرلیا۔القاعدہ طرز کی دہشت گرد تنظیم کے رہنما ابو سیاف کو جنوری 2007 میں فلپائنی فوج نے ہلاک کردیا۔اس کے چھاپہ ماروں کی تعداد چھ سال پہلے کے دو ہزار گوریلوں سے کم ہو کر چند سو رہ گئی۔مصر اور سعودی عرب میں القاعدہ کے اصل اڈوں اور حملہ کرنے والے دہشت گرد مراکز کو گھیرے میں لے لیا گیا اور جو لوگ بچ گئے وہ تین سالوں میں کوئی نیا حملہ کرنے میں ناکام رہے۔ وزارت خزانہ خاص طور پر امریکی محکمہ خزانہ نے دہشت گردوں کے لیے زندگی کو زیادہ مشکل بنا دیا۔عالمی تنظیمیں پیسے کی منتقلی کے بغیر ترقی نہیں کرسکتیں، اس لیے دہشت گردوں کے فنڈز کا پتہ لگانا اور انہیں نشانہ بنانا ضروری ہے۔حکومتوں اور دہشت گردوں کے درمیان یہ معرکہ آرائی جاری رہے گی۔

عراق میں، جہاں دہشت گردانہ حملوں میں کمی آئی ہے، ایک ایسی پیچیدگی ظاہر ہوئی جس نے القاعدہ کو کمزور کردیا۔اپنے اصل فتووں اور دیگر بیانات میں، القاعدہ نے شیعوں کا کوئی ذکر نہیں کیا، صرف "صلیبیوں" اور "یہودیوں" کی مذمت کی۔لیکن عراق نے چیزیں بدل دیں۔سنی حمایت حاصل کرنے کے طریقوں کی تلاش میں، القاعدہ ایک شیعہ مخالف گروپ میں تبدیل ہوگئی۔یہ ایک خالص سنی عالمی نظریہ تھا۔ القاعدہ کے سربراہ ابو مصعب الزرقاوی نے اپنے وہابی طرز کے نظریات کے اظہار میں شیعوں کے لیے شدید نفرت کا اظہار کیا۔فروری 2004 میں اسامہ بن لادن کو لکھے ایک خط میں، اس نے دعویٰ کیا کہ، "شیعوں سے لاحق خطرہ امریکیوں سے لاحق خطرے سے زیادہ ہے۔" اگر کبھی ان کے اور بن لادن کے درمیان کوئی اختلاف ہوا تو زرقاوی جیت گیا۔ نتیجے میں ایک ایسی تحریک جس سے پوری مسلم دنیا کو مغرب کے خلاف جہاد پر اکسانے کی امید کی تھی، اسلام کی اندرونی جنگ میں

تبدیل ہوگئی۔

سنیوں اور شیعوں کے درمیان تقسیم اسلامی دنیا کے اندر محض ایک تقسیم ہے۔ اس میں شیعہ اور سنی، فارس اور عرب، جنوب مشرقی ایشیائی اور مشرق وسطیٰ کے باشندے شامل ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ ان میں اعتدال پسند اور بنیاد پرست سب شامل ہیں۔ جس طرح کمیونسٹ دنیا کے اندر تنوع نے بالآخر اسے کم خطرہ بنا دیا، اسی طرح اسلام کی بہت سی قسمیں اور فرقے، اس کے ایک واحد، یک سنگی دشمن میں متحد و منظم ہونے کی صلاحیت کو کمزور کرتی ہیں۔ کچھ مغربی رہنما دنیا بھر میں ایک واحد اسلامی تحریک کی بات کرتے ہیں۔ روس میں چیچن علیحدگی پسندوں، ہندوستان میں پاکستانی حمایت یافتہ عسکریت پسندوں، لبنان میں شیعہ جنگجوؤں اور مصر میں سنی جہادیوں کو اکٹھا کرنا آسان نہیں۔ درحقیقت، ایک ہوشیار حکمت عملی اس بات پر زور دیتی ہے کہ یہ تمام گروہ الگ الگ ہیں، جن کے ایجنڈے مختلف ہیں۔ بنیاد پرست اسلامی گروہوں میں باہمی تنازعات بدستور جاری ہیں، لیکن ان کا عام طور پر عالمی امنگوں کے بجائے مخصوص مقامی حالات سے زیادہ تعلق ہے۔

اگرچہ شمالی افریقہ میں مسلسل دہشت گردی دیکھی گئی ہے لیکن الجزائر میں، ایک اہم گروہ، ''سلفی گروپ فار کال اینڈ کامبیٹ (جس کا فرانسیسی مخفف GSPC ہے)، الجزائر کی حکومت اور اسلامی حزب اختلاف کی افواج کے درمیان ایک طویل جنگ کا حصہ ہے۔ اسے صرف القاعدہ یا امریکہ مخالف جہاد کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی بات اس اہم علاقے کے بارے میں بھی سچ ہے جہاں القاعدہ کی طاقت میں بہت زیادہ اور انتہائی خطرناک اضافہ ہوا۔ ان میں افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقے شامل ہیں۔ یہیں پر القاعدہ مرکزی کے اتحادی، طالبان، ایک مقامی تحریک ہے جسے طویل عرصے سے پشتونوں کے ایک حصے کی حمایت حاصل ہے، جو افغانستان اور پاکستان میں ایک بااثر نسلی گروہ ہے۔ 9/11 کے بعد، چھ سالوں میں القاعدہ مرکزی، اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی قیادت میں کہیں بھی بڑا حملہ کرنے میں ناکام رہی۔ پہلے یہ ایک دہشت گرد تنظیم تھی لیکن اب یہ ایک کمیون بن گئی ہے۔

لیکن یہ اقساط مسلم دنیا کی بنیادی سمت کی عکاسی نہیں کرتیں۔ وہ دنیا جو جدید ہو رہی ہے، دنیائے اسلام میں رجعت پسند دیگر ثقافتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اور انتہا پسند ہیں۔ لیکن وہ دنیا کے اربوں سے زیادہ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت ہیں۔ دبئی کی رونقیں دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے مسلمان لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں، اور یہ تعداد ایرانی زائرین سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اقلیت جو جہاد چاہتی ہے وہ حقیقی ہے لیکن یہ ان معاشروں میں کام کرتی ہے جہاں اس طرح کی سرگرمیاں تیزی سے غیر مقبول اور غیر متعلق ہو رہی ہیں۔

مغرب میں دہشت گردی کے اثرات ہر ایک اضافی حملے کے ساتھ کم ہوئے ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد عالمی مالیاتی منڈیاں گر گئیں اور دو ماہ تک 10 ستمبر کی سطح پر واپس نہیں آئیں۔ 2004 میں میڈرڈ بم دھماکوں کے بعد، ہسپانوی مارکیٹ کو بحال ہونے میں ایک مہینہ لگا۔ لندن کے بعد جولائی 2005 میں ہونے والے بم دھماکوں سے، برطانوی اسٹاک چوبیس گھنٹوں میں بمباری سے پہلے کی سطح پر واپس آ گئے۔ وسیع تر اقتصادی تصویر بھی ایسی ہی ہے۔ 9/11 کے بعد، امریکہ کو اقتصادی سرگرمیوں میں سینکڑوں ارب ڈالر کا نقصان ہوا۔ اگلا بڑا حملہ، 2002 میں بالی نائٹ کلب میں وا اور اس بم دھماکے نے انڈونیشیا کی معیشت پر ایسا ڈرامائی اثر ڈالا، جس میں سیاحت ختم ہوگئی اور مہینوں کے لیے تجارت اور سرمایہ کاری خشک ہوگئی۔ ایک سال بعد، ایک اور بمباری جکارتہ کے میریٹ ہوٹل میں ہوئی جس سے، مارکیٹ صرف تھوڑی دیر کے لیے گری، لیکن انڈونیشیائی معیشت کو بہت کم نقصان پہنچا۔ 2003 میں مراکش اور ترکی میں بم دھماکوں نے اسی طرح کے چھوٹے اثرات مرتب کیے تھے۔ اسپین میں 2004 اور برطانیہ میں 2005 کے بم دھماکوں نے ترقی کو کمزور کرنے میں کوئی موثر کردار ادا نہیں کیا۔

## بدمعاش ریاستوں کے چیلنجز حقیقی ہیں

اگر کوئی بڑی دہشت گرد تنظیم بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے اہم ہتھیار حاصل کر لے تو یقیناً حالات مختلف ہوں گے۔ ایٹمی حملے کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر خوف و ہراس اور وسیع تر جانی و مالی نقصان ہو سکتا ہے۔ لیکن اس طرح کے ہتھیار حاصل کرنا تصور سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ واشنگٹن کی طرف سے مستقل کوشش جاری ہے کہ ایٹمی تیاروں کو کسی بھی مقدار میں حاصل کرنا ناممکن بنا دیا جائے۔ حیاتیاتی دہشت گردی شاید حیاتیاتی ایجنٹوں کو حاصل کرنے میں آسانی کی وجہ سے سب سے زیادہ پریشان کن ہے، لیکن انہیں مؤثر طریقے سے استعمال کرنا مشکل ہے اور دہشت گردوں کے مطلوبہ نتائج کم ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی یہ تجویز نہیں کرتا کہ انسداد دہشت گردی کی سرگرمیاں غیر ضروری ہیں، بلکہ محتاط، کیلیبر یٹڈ، ذہین پالیسیاں کافی کامیاب ہو سکتی ہیں۔

لوگوں نے تسلیم کیا ہے کہ انسداد دہشت گردی کی بہترین پالیسی لچک ہے۔ دہشت گردی اس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ ایک فوجی حربہ ہے جس کی تعریف تماشائی کے ردعمل سے ہوتی ہے۔ اگر ہم دہشت زدہ نہ ہوں تو یہ کام نہیں کرتا۔ نیویارک اور لندن سے لے کر ممبئی اور جکارتہ تک، لوگ تجربے کے ذریعے اس حقیقت کو سیکھ رہے ہیں اور زندگی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

غیر یقینی صورتحال میں بھی سب سے زیادہ امکانی منظرنامہ یہ ہے کہ امریکہ میں بیگ یا ٹرک بم دھماکوں کا سلسلہ ایک جھٹکا ہوگا، لیکن چند ہفتوں میں اس کے اثرات ختم ہو جائیں گے اور طویل مدتی نتائج کا امکان کم سے کم ہوگا۔ امریکی معیشت اب 13$ ٹریلین ڈالر ہے۔ مسائل آسانی سے ختم نہیں ہوتے۔ جدید تہذیب ہمارے خیال سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔

بدمعاش ریاستوں کے چیلنجز بھی حقیقی ہیں، لیکن ہمیں اس پر سیاق و سباق میں غور کرنا چاہیے۔ ایران کا جی ڈی پی امریکہ کا 1/68 ہے، اس کے فوجی اخراجات پینٹاگون کے 1/110 ہیں۔ * اگر یہ 1938 ہو، جیسا کہ بہت سے قدامت پسند کہتے ہیں، تو ایران رومانیہ جیسا ہے، جرمنی جیسا نہیں۔ شمالی کوریا اس سے بھی زیادہ دیوالیہ اور غیر فعال ہے۔ سب سے بڑا خطرہ جو چینی حکومت کو جاگنے پر مجبور کرتا ہے کہ یہ بلبلہ پھٹ جائے گا اور خطے کو پناہ گزینوں سے بھر دے گا۔ یہ ممالک اپنے پڑوس میں پریشانی کا باعث بن سکتے ہیں اور ان کی جانچ پڑتال ہونا ضروری ہے، لیکن ہمیں اس بڑی دنیا کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے جس کا وہ نسبتاً چھوٹا حصہ ہیں۔ لاطینی امریکہ کو دیکھو۔ وینزویلا ایک مصیبت ساز ہے، لیکن زمین پر اس کا کیا مطلب ہے؟ خطے میں وسیع رجحان۔

*اصطلاحات پر ایک نوٹ: ایسے سیدھے سادے خیال کے لیے، مجموعی گھریلو پیداوار (جی ڈی پی) حیرت انگیز طور پر پیچیدہ پیمائش ہے۔ قابل تجارت اشیاء جیسے iPods یا Nikes کی قیمت ایک ملک سے دوسرے ملک تک تقریباً یکساں ہے۔ وہ سامان جو سرحدوں کے پار نہیں جا سکتے جیسے بیجنگ میں بال کٹوانے کی قیمت جو ترقی پذیر معیشتوں میں کم ہوتی ہے، چنانچہ یہی آمدنی ہندوستان میں برطانیہ کے مقابلے میں بہت آگے جاتی ہے۔ اس کا محاسبہ کرنے کے لیے، بہت سے ماہرین اقتصادیات جی ڈی پی کا ایک پیمانہ استعمال کرتے ہیں جسے قوت خرید کی برابری (PPP)Purchasing Power Parity کہا جاتا ہے، یہ پیمانہ ترقی پذیر ممالک کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کرتا ہے۔ حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ زندگی کے معیار کی بہتر عکاسی کرتا ہے۔ پھر بھی، جب خام قومی طاقت کی بات آتی ہے، تو مارکیٹ کی شرح تبادلہ پر جی ڈی پی کی پیمائش زیادہ معنی رکھتی ہے۔ آپ طیارہ بردار بحری جہاز نہیں خرید سکتے، اقوام متحدہ کے امن مشن کو فنڈ نہیں دے سکتے، کارپوریٹ آمدنی کا اعلان نہیں کر سکتے، یا PPP میں ناپے گئے ڈالروں سے غیر ملکی امداد نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کتاب میں مارکیٹ ایکسچینج ریٹ کا استعمال کرتے ہوئے GDP کا حساب لگاؤں گا۔ جہاں پی پی پی زیادہ مناسب ہے، یا جب صرف نمبر ہی اس شکل میں مل سکتے ہیں، میں اس کا تذکرہ کروں گا۔

برازیل، میکسیکو اور چلی جیسے بڑے ممالک کی پالیسیوں کی مثال کھلی منڈیوں، تجارت، جمہوری حکمرانی، اور ظاہری رجحان کی طرف ہے۔ اور یہ رجحان، ہیوگو شاویز کے پاگل پن سے نہیں، تاریخ کی سمت کی نمائندگی کرتا ہے۔ (جاری ہے)

## اسکردو کا حسن و جمال

اسکردو کا حسن و جمال 'اطراف' کے اندرون و بیرون ملک قارئین کے دلوں میں اتر گیا ہے۔ ایک ایک سطر بہت ہی محبت اور لگن سے لکھی گئی۔ قارئین یہ کہتے ہیں کہ لگ رہا تھا۔ ہم خود بھی اسکردو کی سیر کر رہے تھے۔ ہم ظہیر قندیل صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنے اس دلکش اور مبسوط سفر نامے کے لیے 'اطراف' کے صفحات کو منتخب کیا۔ 'اطراف' کی خواہش ہے کہ ظہیر قندیل ایسی شگفتہ اور دلآویز تحریریں نذر قارئین کرتے رہیں۔

# میری ضد۔ سب نے ایک خوبصورت مقام کو دیکھ لیا

ظہیر قندیل کی دل میں اترتی تحریر

چوتھی اور آخری قسط

**23 جون 2023 بروز جمعہ**

خپلو میں صبح خوش گوار تھی، صبح سویرے اٹھ کر باہر لان میں آیا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے خوش گوار جھونکے آکر ٹکرائے تو ترنگ میں آکر حفیظ جالندھری کی نظم گنگنانے لگا۔

"ہوا بھی خوش گوار ہے، گلوں پہ بھی نکھار ہے، ترنمِ ہزار ہے، بہار پر بہار ہے، کہاں چلا ہے ساقیا، ادھر تو لوٹ ادھر تو آ، ارے یہ دیکھتا ہے کیا، اٹھا سبو سبو اٹھا، سبو اٹھا پیالہ بھر، پیالہ بھر کے دے ادھر، چمن کی سمت کر نظر، سماں تو دیکھ بے خبر، وہ کالی کالی بدلیاں، افق پہ ہو گئیں عیاں، وہ اک ہجومِ مے کشاں، ہے سوئے مے کدہ رواں، یہ کیا گماں ہے بدگماں، سمجھ نہ مجھ کو ناتواں، خیالِ زُہد ابھی کہاں؟، ابھی تو میں جوان ہوں، ابھی تو میں جوان ہوں۔"

یقین مانیں اس نظم اور اس ماحول نے مجھ سے بڑھاپا کوسوں دور کر دیا تھا۔ کاش ! ہم خپلو کے لیے کچھ دن اور وقف کر سکتے۔ ناشتا کیا، آملیٹ اور پراٹھے، گیسٹ ہاؤس والوں نے اگر چہ ٹھنڈا ناشتا ہی کھلایا۔ مگر اس ماحول میں ان کی سب خطائیں اور گیسٹ روم کا اجاڑ پن سب معاف۔ صبح سویرے واپسی کا سفر شروع کیا۔ گوری واپسی پر شاداں و فرحاں بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اب ڈرائیونگ سیٹ سعد نے سنبھال لی تھی۔ وہی مناظر آنکھوں کے سامنے تھے جو کل آتے ہوئے دیکھے تھے مگر حسن جتنی بار بھی آنکھوں کے سامنے آئے، تر و تازہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ احمد ندیم بھائی کا خیال تھا کہ ہم سیدھے اسکردو ہی چلیں اور من ٹھوکا آب شار کا شرفِ دیدار نہ حاصل کریں۔ شروع میں تو میں نے ہاں میں ہاں ملائی مگر جوں جوں من ٹھوکا کی طرف جانے والی سڑک قریب آتی گئی۔ میرا دل مچلنے لگا کہ اتنی دور نہ جانے پھر کب موقع ملے؟ ملے بھی یا نہیں۔ خاموش واٹر فال چوں کہ زیادہ دور ہے اس لیے اسے نہ دیکھنے کا گناہ تو کر سکتے ہیں مگر من ٹھوکا جو بالکل قریب ہی بہ رہی ہے، اسے نہ دیکھنا تو کفرانِ نعمت ہی شمار ہوگا۔ گانچھے ضلع کی چیک پوسٹ پر پہنچ کر میں نے گارڈ سے پوچھا: "من ٹھوکا واٹر فال یہاں سے کتنی دور ہے؟" اس بھلے آدمی نے کہا بس صرف بیس منٹ کا فاصلہ ہے۔ میں نے سعد سے کہا: "آب شار کی طرف گاڑی موڑو۔" سعد نے پس و پیش سے کام لیا اور بال احمد ندیم بھائی کی کورٹ میں پھینک دی۔ "بابا! سر کہتے ہیں، من ٹھوکا چلیں۔" انھوں نے مجھ سے کہا: "سر جی! جمعہ رہ جائے گا۔ ہم

## جرمنی سے ہیوی بائیک پر آیا ہوا سیاح

اسکردو پہنچ کر جمعہ پڑھنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا جمعہ تو ہر جمعے کو آجاتا ہے۔ ہم زندگی میں شاید ایک ہی بار یہاں آئے ہیں۔ حسرت رہ جائے گی۔ اور ویسے بھی جمعے کو ابھی بہت وقت ہے اس وقت دس بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں اور اسکردو یہاں سے بہ مشکل ایک گھنٹے بلکہ اس سے بھی کم کا فاصلہ ہوگا۔ اور اگر فرض کریں وہاں نہ بھی پہنچ سکے تو یہاں بھی سب مسلمان ہیں، مسجدیں ہیں۔ جمعہ کہیں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔" انھوں نے اگر چہ ہر ممکن ہمیں من ٹھوکا جانے سے روکا مگر میری ضد پر نیم دلی سے رضا مندی کا اظہار کیا اور اب ہم اسکردو کارگل روڈ پر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ آگے جا کر ضلع کھرمنگ کی چیک پوسٹ آئی، یہاں اپنا نام و پتا لکھوایا۔ وہاں ایک بچہ چیری بیچ رہا تھا، خریدیں۔ آگے چلے۔ دریا ہمارے بائیں کنارے پر تھا۔ کبھی آبادی آجاتی اور کبھی پہاڑ۔ سب سے پہلے شوئنخاں کا چھوٹا سا گاؤں گزرا اس کے بعد علی میر قصبہ آیا۔ اس سڑک کے کنارے پر آبادی بہت تھی۔ لوگوں نے گندم کاٹ کاٹ کر سڑک کے دونوں کناروں پر سوکھنے کے لیے ڈال رکھی تھی۔ ہر کھیت میں یہاں بھی خواتین ہی کو کام کرتے پایا۔ سرمک کا سرسبز علاقہ گزرا۔ پھر مہدی آباد کا قصبہ آگیا۔ یہ بھی خوب صورت قصبہ تھا۔ کھیت، ایک طرف سندھ کا دریا اور قصبے میں بہتی ندیاں۔ سعد بہت احتیاط سے گاڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ اس لیے وقت کچھ زیادہ لگ رہا تھا۔ جتنا وقت لگ رہا تھا اتنا ہی احمد ندیم بھائی کا پارہ بھی چڑھ رہا تھا۔ میں

دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا اللہ من ٹھوکا کہیں دھوکا نہ دے جائے۔
اگلا قصبہ سرلنگ کا تھا۔ وہ بھی باقی قصبوں سے حسن و جمال میں کم نہ تھا۔ خدا خدا کر کے من ٹھوکا کا قصبہ آیا جہاں سے ہم نے دائیں طرف مڑنا تھا۔ اس چوک میں کئی ہوٹل اور جنرل اسٹور موجود تھے۔ یہاں سے کارگل روڈ کو آگے جانے دیا اور ہم من ٹھوکا واٹر فال کی طرف مڑ گئے۔ راستے میں جگہ جگہ کیمپنگ سائٹس اور ٹینٹ لگے ہوئے دیکھے، یہاں کئی لوگ آ کر رات بسر کرتے ہیں۔ مقامی وغیر مقامی سیاحوں کی اچھی خاصی تعداد بھی دیکھنے کو ملی۔ دو ڈھائی کلومیٹر کے بعد آخر کار من ٹھوکا کو ہم نے دیکھ ہی لیا۔ گانچھے چیک پوسٹ سے یہاں تک پہنچنے میں ہمیں بیس منٹ کی بہ جائے پینتالیس منٹ لگے۔

ایک ہوٹل اس آب شار کے قریب بنا ہوا ہے۔ اندر جانے کے لیے فی فرد ایک سو روپے بھی وصول کیے جاتے ہیں۔ وہاں ایک شخص سے معلوم ہوا کہ ہوٹل والوں نے اپنا ہوٹل چلانے کے لیے پہاڑ سے بہتے نالے کا راستہ تبدیل کر کے یہاں لا کر گرایا۔ یعنی اس کے مطابق یہ ایک مصنوعی آب شار تھی۔ اگر یہ مصنوعی تھی تب بھی کسی طور بھی حسن و جمال اور دل کشی میں قدرتی آب شار سے کم نہ تھی۔ مجھے تو یہ کہیں سے بھی مصنوعی نہیں لگی۔ مجھے لگتا ہے اس بندے سے ہوٹل والوں نے بل کچھ زیادہ لے لیا ہوگا۔ اس آب شار کی اونچائی ایک سو اسی میٹر بتائی جاتی ہے، ہم وہاں چوں کہ فیتہ لے کر نہیں گئے تھے ورنہ ناپ کر صداقت جانچ لیتے۔ احمد ندیم بھائی اور بچوں کو بھی یہ مقام بہت پسند آیا۔ اس آب شار کے پاس ہی ایک نالہ بھی بہہ رہا ہے جس میں اس آب شار کا پانی جا ملتا ہے۔ اس نالے پر ایک چھوٹا سا معلق پل بھی بنا ہوا ہے۔ وہاں ایک مقامی اسکول کے بچے بچیاں پک نک منانے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے اساتذہ بچوں کو پکڑ پکڑ کر پل پار کرا رہے تھے۔ طلبہ کے لیے اس قدر محتاط ہونا مجھے اچھا لگا۔ میں نے ان سے گفتگو کی اور انھیں شاباش بھی دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کیڈٹ کالج کا نام تک نہیں سنا ہوا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، ہم آب شار کے قریب تر ہوتے گئے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی پھواریں ہوا کے ذریعے پورے ماحول میں پھیلی ہوئی تھیں۔ آب شار کے قریب جانے سے پہلے ہی میں نیم تر ہو چکا تھا۔ کچھ تصاویر اور ویڈیو بنائیں۔ احمد ندیم بھائی جوتے اتار کر چھوٹی سی ندی میں سے گزرنے کا ارادہ لے کر آگے بڑھے۔ مگر پانی کے تیز بہاؤ اور یخ بستگی نے ان کے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ واپس مڑ کر دوسری طرف بنے ہوئے چھوٹے سے پل کی طرف شرافت سے چلے گئے۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا اس آب شار کے قرب کا لطف اٹھاتے رہے۔ ہوٹل والوں نے کچھ کمرے زمین پر بنا رکھے تھے اور کچھ درختوں کے اوپر چوبی کمرے اٹکا رکھے تھے، جن پر تالے لٹکا رکھے تھے۔ وہ ٹری ہاؤسز تھے۔ ان کا کم از کم کرایہ تیس ہزار بتایا گیا۔ ہم نے صرف دیکھنے کی کوشش کی مگر ہر کمرا مقفل تھا۔ ہوٹل والے کہہ رہے تھے پہلے بکنگ کروا لیجیے پھر کھول کر بھی دکھائیں گے۔ ہم نے کہا: "کمرے اور منہ بند رکھو۔ اتنے پیسوں میں تو ہم اسکردو کا سارا ٹرپ کریں گے۔" ہوٹل کے واش روم بھی صاف ستھرے نہیں تھے۔ وہ صرف قرب آب شار کے پیسے وصول کر رہے ہیں۔ ہم ان سے ناراض ہو گئے اور یہاں چائے بھی نہیں پی۔ کچھ دیر بعد یہاں سے نکلے اور آ کر گوری میں براجمان ہوئے۔ واپسی کے انھی راستوں پر گوری بھاگنے لگی۔ جب ہم اسکردو پہنچے تو ابھی ایک بھی نہیں بجا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میری ضد کے باعث سب نے ایک خوب صورت مقام کو دیکھ لیا۔

اسکردو پہنچ کر معلوم ہوا کہ جمعہ دو بجے ہوگا۔ وہاں چوں کہ اہلِ تشیع کی کثرت ہے اس لیے جامع مسجد کے قریب ہی سنی العقیدہ مسجد بھی مل گئی۔ جمعے کے بعد ہم سب وہاں کی جیولری شاپ میں چلے گئے۔ احمد ندیم صاحب اور میں نے جیولری کی کچھ اشیا خریدیں۔ انھوں نے ہم دونوں کو پتھر کا بنا ہوا ایک ایک کرسٹل تحفے کے طور پر دیا۔ دکان دار ہمیں دعوت دے رہے تھے کہ آج رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں۔ وہ ہمیں مقامی ڈشز کھلائیں گے۔ ہم نے معذرت کی کیوں کہ ہمارا پروگرام اسکردو کو خیر باد کہہ کر بشوویلی جانے کا تھا۔

**ڈرائیور ہارن بجا کر ڈراتا دھمکاتا جیپ کی رفتار بڑھاتا رہا**

اس کے بعد ہم اسکردو کے در و دیوار، درختوں، دریا، ندی نالوں کو اللہ حافظ کہتے ہوئے جگلوٹ اسکردو روڈ کی طرف چل پڑے۔ اسکردو میں ہماری تین راتیں گزری تھیں اس لیے اس سفر میں سب سے زیادہ یہیں ٹھہرنے کا اہتمام ہوا تھا۔ اسکردو سے واپسی پر بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر جہاں جاتے ہوئے جیپیں نظر آئی تھیں، وہیں پہنچے۔ گاڑی والے سے بھاؤ تاؤ کیا۔ وہ رات بشوویلی میں بسر کرنے کے دس ہزار مانگ رہا تھا اور جا کر واپس آنے کے آٹھ ہزار طلب کر رہا تھا۔ ذرا سی بحث کے بعد نو ہزار پر سودا طے ہوا۔ اب گاڑی پارک کرنے کا مسئلہ تھا۔ ایک ہوٹل پر گئے تو اس نے سات سو روپے مانگے۔ ڈرائیور ہمیں ایک اور ہوٹل پر لے گیا۔ وہاں گاڑی پارک کی انھوں نے چار سو روپے وصول کیے۔ وہاں گوری کو ان کے حوالے کیا اور خود جیپ میں بیٹھ کر بشووادی کی طرف جانے والے رستے کی طرف مڑ گئے۔ نیچے دریا پر پہنچے دریا کے ساتھ ہی ایک بڑی آب شار بہت پرکشش منظر پیش کر رہی تھی۔ بشو کا یہ پل واقعی معلق تھا۔ صرف رسوں کے ساتھ لٹکا ہوا۔ دونوں کناروں پر زمین کے ساتھ نصب نہیں تھا۔ پل کے آغاز اور سڑک کے اختتام کے درمیان تقریباً چھے انچ کا فاصلہ تھا' جب جیپ سڑک سے اتر کر پل پر چڑھی تو سارا پل ہی ایک دم نیچے چلا گیا۔ میں نے فرنٹ سیٹ کی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر جیپ کے پچھلے پہیوں کو پل پر آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا' جب پہیوں نے پل کو چھوا تو لکڑی کا جھولتا ہوا پل سڑک سے بلا مبالغہ چھ سات انچ ہٹا ہوا اور آٹھ نو انچ نیچے جا چکا تھا۔ جیپ جب اس پر چڑھی تو خوف بھی آیا کہ کہیں پل آگے اور پہیا نیچے ہی نہ چلا جائے۔ اس پل سے گڑگڑاتے لرزتے اور جھولتے دوسرے کنارے پر پہنچے۔

یہاں سے بشوویلی کی کچی سڑک بائیں طرف مڑتی ہے۔ یہ سڑک بہت تنگ اور آغاز میں بہت آسان مگر رفتہ رفتہ مشکل اور پتھریلی ہوتی جاتی ہے۔ راستے میں ذرا سی ہموار جگہ آئی یہاں اچھی خاصی آبادی تھی یہاں راستے کے دونوں طرف گھر بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی خالی کھیت تھے جن میں خواتین بیلچے کے ساتھ زمین کو گہرائی تک کھود رہی تھیں۔ بیلچے سے وہ ہل چلانے والا کام لے رہی تھیں۔ پورے بلتستان میں خواتین ہی کو ہر مقام پر محنت اور مشقت کرتے دیکھا۔ فصل لگانے سے کاٹنے تک سب کام وہی کر رہی تھیں۔ اس سارے سفر میں خواتین کو جو سب سے آسان کام کرتے دیکھا وہ خوبانی کی گٹھلیاں نکال کر انھیں کھول کر بڑے بڑے پتھروں پر سوکھنے کے لیے رکھنا تھا۔ ڈرائیور سے پوچھا، یہاں کے مرد کیا کرتے ہیں؟ وہ بولا: "کچھ گاڑی چلاتے ہیں، کچھ ہوٹل چلاتے ہیں، کچھ نوکریاں کرنے دوسرے بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔" کچھ بھی ہو مجھے تو وہاں کی خواتین کے ساتھ دلی ہمدردی ہو گئی ہے اور انھیں داد دیے بنا رہ نہیں سکتا۔ ڈرائیور کے سامنے زیادہ داد نہیں دی اس لیے کہ وہ وہیں کا مقامی باشندہ تھا۔ جیسے ہی سفر بلندی کی جانب شروع ہوا، فور بائی فور جیپ کے ہچکولے اور جھٹکے دعوتِ فکر دے رہے تھے کہ اس قدر حسین مقام بشوواری (سلطان آباد) تک رسائی آسان امر نہیں۔ پتھریلی اور ناہموار راستے نے ہمارے اعضائے رئیسہ وغیر رئیسہ کو ایسا جھنجھوڑا کہ ہمیں لگا ہمارا دماغ ہمارے گھٹنے بل کہ گٹے تک سرک گیا ہے۔ آنکھیں بے قابو پنڈولم کی طرح ہل کر سارے منظر کو ہارر فلم دکھا رہی تھیں۔ گردوں نے سینے میں شفٹنگ کر لی تھی اور پھیپھڑے گلے میں آ کر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا، یہ کام ناک سرانجام دے رہی تھی۔ چڑھائی پر ایک موڑ پر پہنچے تو آگے سے ایک اور جیپ آ رہی تھی۔ ہمارے ڈرائیور نے اسے جگہ دینے کو گاڑی ریورس کی تو ہمارا کلیجہ منہ کو آ گیا، کہ اتنی تنگ سڑک پر کہیں ریورس میں ہم پہاڑ سے نیچے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے پہنچ نہ جائیں۔ اس نے کم از کم سو میٹر اسی طرح ریورس میں گاڑی پیچھے کی۔ ایک موڑ جہاں روڈ میں ہلکی سی کشادگی تھی وہاں کھڑی کی اور اگلی گاڑی کو نکلنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد آگے چلا تو اسی موڑ پر پھر آگے سے ایک اور گاڑی آ گئی۔ وہی سارا عمل پھر دہرایا گیا۔ اسے مشورہ بھی دیا کہ بھائی تم چڑھائی پر ہو، یہ کام اترائی پر آنے والی گاڑی کو سونپو کہ وہ پیچھے جائے۔ مگر وہ کہنے لگا، یہ باہر کے لوگ ہیں، مقامی نہیں ان کا پیچھے جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لیے میں انھیں گزرنے کا موقع دیتا ہوں۔ ہم دعا کرنے لگے کہ اس بندے کی نیکی کہیں ہمیں مہنگی نہ پڑ جائے۔ تیسری بار جب ہم وہاں پہنچے تو پھر ایک گاڑی آ گئی مگر اس بار اوپر

سے آنے والی گاڑی نے ریورس گیئر میں خود کو ڈالا اور کوئی تیس میٹر کے قریب ایک نسبتاً کھلی جگہ پر ہمیں گزرنے کا موقع دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نالے پر بنے پل پر سے گزرے تو اس پل کی وسعت اور گاڑی کی ٹائروں کی وسعت میں صرف ایک دو انچ کا فرق ہی محسوس کیا۔ لکڑی کے اس چھوٹے سے پل پر سے گزرتے ہوئے ہمارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے، انھیں بہلا پھسلا کر بٹھایا۔ پل پار کرتے ہی ڈرائیور رک گیا اور کہا۔ "سر جی! یہاں تصویریں مصوریں بنوالیں، چائے مائے پی لیں۔" اس پل کے ساتھ ہی ذرا سی بلندی پر ایک چھوٹا سا ہوٹل بنا تھا۔ ہم نے تصویریں مصویریں تو بنائیں مگر چائے مائے نہیں پی۔ اسے کہا "چلو اوپر پہنچ کر ہی چائے پییں گے۔" یہ کہنے کو ایک گھنٹے کا جیپ ٹریک تھا جو خطرناک تو اتنا نہیں تھا مگر بدن توڑ ضرور تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ میرا بیٹا زید ایک سال پہلے اپنے کسی کولیگ کے ساتھ یہاں موٹر بائیک پر کیسے آ گیا تھا۔ موٹر سائیکل کے لیے تو یہ بہت بڑا امتحان ہے۔ بشوٹاپ یعنی سلطان آباد سطح سمندر سے تقریباً 3600 میٹر یعنی گیارہ ہزار آٹھ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ سفر اگرچہ انگریزی کا سفر تھا مگر جوں ہی آپ ایک موڑ مڑ کر قدرت کی اس لاڈلی وادی میں داخل ہوتے ہیں تو سامنے وسیع سرسبز میدان کے بیچوں بیچ بہتی ندی دیکھ کر دل ایسا شاد ہوتا ہے کہ سفر کی ساری تھکاوٹ اور کلفت دُم دبا کر بھاگ جاتی ہے۔

چھوٹی سی معصوم سی حسین وادی کا حسن کیسے بیاں کروں؟ زمّرد کو مات دیتا ایک کشادہ شاداب میدان سامنے تھا جس کے درمیان ندی ہلکے سروں میں گنگناتی ہوئی بہ رہی تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ اس میدان کے رکھوالے بنے مستعد و ہوشیار کھڑے تھے۔ ان پر درختوں کے جھنڈ جا بہ جا ان کی وردی بنے پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا سکون اور سَرخوشی تھی کہ اقبال کی ایک آرزو یاد آ گئی۔ اقبال نے شاید خیالوں میں بشوہی کی وادی کے متعلق کہا تھا۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دل فریب ایسا کوہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

پوری نظم تو یہاں لکھ نہیں پاؤں گا مگر اس نظم سے دل نے خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میرے پاس بھی ایک خیمہ ہو اور میں اسے ندی کنارے لگا کر کئی دن ادھر ہی گزار دوں۔ مگر وہاں پہلے ہی سے کئی خیمے لگے ہوئے تھے اور کئی عارضی ہوٹل ندی کے دونوں اطراف میں اپنا کاروبار چلا رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا، اگر رات رہنی ہے تو میں دو ہزار روپے میں ٹینٹ بک کروا دوں گا۔ آپ سے وہ زیادہ مانگیں گے۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے شروع سے آخر تک لے کر جاؤ پھر فیصلہ کریں گے کہ کہاں ٹھہرنا چاہیے۔ راستے میں ایک خیمہ ہوٹل بہت پسند آیا۔ وہاں بھس بھرے یاک بھی کھڑے تھے۔ ندی پر لکڑی کا خوب صورت سا پُل تھا۔ پھول کھلے تھے، پات ہرے تھے، لوگ مسحور تھے اور مسرور تھے، بچے بھاگ رہے تھے۔ خواتین تصاویر بنا رہی تھیں۔ موبائل نیٹ ورک موجود نہیں تھا اس لیے وہاں

موبائل فون کیمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے کہا: یہیں ٹھہرو یہ بہت خوب صورت ہے۔ ڈرائیور نے سنی ان سنی کر دی۔ جب زور دے کر کہا تو بولا سر آگے لے جاتا ہوں پھر آپ فیصلہ کرنا۔ وہ بالکل آخری خیمہ ہوٹل پر جا کر رکا۔ وہاں کا مالک بھاگ کر آیا اور کہنے لگا: "سرکار! رات یہیں قیام کا ارادہ ہے کیا؟" ہم نے پوچھا کرایہ کتنا ہے۔ بولا: "چار ہزار روپے ایک ٹینٹ کے۔" میں نے کہا بہت مہنگا ہے یاک والی جگہ پر چلتے ہیں۔ ڈرائیور نے اس سے بلتی زبان میں کچھ کہا تو مالک بولا: "چلیں سر آپ کے ڈرائیور نے اگر دو ہزار کہا ہے تو اسی کی بات مان لیتا ہوں۔ آپ دو ہزار ہی دے دیں۔" میں نے پھر کہا: "یار چلو اسی یاک والی جگہ پر چلتے ہیں۔" ہوٹل کا میزبان گھبرا گیا بولا: "سر وہ بہت مہنگا ہے آپ یہیں رکیں۔" اب مجھے اس کو چھیڑنے میں مزا آنے لگا، احمد ندیم بھائی اور بچے اس حق میں نہیں تھے کہ واپس جا کر یاک والے خیمہ ہوٹل کو چیک کیا جائے۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہیں جایا جائے۔ ڈرائیور بولا۔ "سر! اگر وہاں جائیں گے تو میں اس سے پیسے کم نہیں کروا سکوں گا۔ یہ بندہ میرا واقف ہے۔ وہ نہیں۔" میں نے جواب دیا: "اس کا مطلب یہ کہ تم اپنے ہی جاننے والے کے پاس جان بوجھ کر لے آئے ہو۔ چلو جی واپس اسی یاک والے ہوٹل پر۔۔۔" اب ڈرائیور اور خیمے کے مالک نے پھر کہنا شروع کر دیا: سر یہ جگہ زیادہ اچھی ہے۔" خیر میں نے ان دونوں کو ہر بات پر خوب ستایا کہ چلو واپس یاک والے ہوٹل پر۔۔۔ چائے، چپس اور پکوڑوں کا آرڈر دیا گیا۔ جب تک وہ تیار ہوتے ہم اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے لگے، سامنے پہاڑ سے ایک آب شار بہتی نظر آ رہی تھی۔ وہاں زیتون اور دیودار کے درختوں کا بڑا جنگل بھی آگے موجود تھا۔ شچائے آئی تو ندی کنارے اس نے کچھ زیادہ ہی لطف دیا۔ وہیں پر دو نو بیاہے بھائی اپنی بیگمات کے ساتھ ہنی مون منانے آئے ہوئے تھے۔ ان سے باتوں باتوں میں پوچھا۔ آپ کو کتنے کا خیمہ دیا گیا۔ انھوں نے کہا ہمیں دو ہزار میں دو خیمے دیے۔ اب مجھے ڈرائیور اور مالک کی ملی بھگت کا علم ہوا، مالک سامنے آیا تو میں نے کہا: "تم نے ہم سے ایک خیمے کے دو ہزار لیے ہیں جب کہ ان کو دو ہزار میں دو خیمے دیے ہیں۔ تمھاری اس بے ایمانی پر ہم یاک والے ہوٹل میں جا رہے ہیں۔" اب وہ شرمندہ تو ہوا لیکن کہنے لگا: "سر! انھوں نے ایک ہی مانگا تھا۔ ہم نے خود ایک چھوٹا ٹینٹ ان کو دے دیا ہے کہ یہ نوزائیدہ دولھے، اپنی دلھنوں کے ساتھ آئے ہیں اس لیے دو خیمے ہونے چاہییں۔" ان نو بیاہتوں کے ساتھ گپ شپ ہوئی۔ ان کا ارادہ اسکردو جانے کا تھا۔ اور سستے ہوٹل کی تلاش میں تھے۔ ہم نے انھیں شاہی ولا کا پتا اور فون نمبر دیا، وہ ممنون ہوئے۔

اسی دوران ایک بہت ہیوی بائیک پر ایک بدیسی سیاح منظر میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا جرمنی سے آیا ہے کئی ممالک سے ہوتا ہوا پاکستان پہنچا ہے۔ اس سے بات چیت ہوئی۔ اس نے موٹر بائیک پر کئی ملکوں کے جھنڈوں کے اسٹکر چسپاں کر رکھے تھے، ہمارے پوچھنے پر وہ پاکستان کو حسین ترین ملک قرار دے رہا تھا۔ اس میں

کوئی شک بھی نہیں ہے۔ وہ زیادہ بات چیت سے گھبرا رہا تھا۔ اس لیے اسے وہیں اس کے حال پر چھوڑا۔ احمد ندیم بھائی نے کھانے کا آرڈر دے دیا تھا۔ تاریکی آہستہ آہستہ اردگرد کے مناظر پر سیاہ چادر اوڑھا رہی تھی۔ آسمان پر ستارے ایک عرصے بعد دیکھے تھے اس لیے یہ منظر بہت حسین لگ رہا تھا۔ افسوس میرا موبائل اس منظر کی عکاسی نہیں کر پایا۔ جنریٹر سے بجلی پیدا کی جا رہی تھی، میں نے مالک سے پوچھا: "یار وائی فائی کا پاس ورڈ تو بتانا۔" وہ بولا یہاں سگنل ہی کوئی نہیں آتا، تو وائی فائی کہاں سے آئے گا۔ میں نے کہا وائی فائی نہیں ہے تو ہم یاک والے ہوٹل میں جا رہے ہیں۔" اب وہ ہنس پڑا۔ کیوں کہ اس کی سمجھ میں آگیا کہ میں اسے چھیڑ رہا ہوں۔ بہت مزے دار کھانا تیار ہوا۔ چکن تکا بوٹی، دال اور پچھلی رات کا بچا ہوا یاک کا گوشت۔ ساتھ گرما گرم چپاتیاں۔ بہت مزے دار طعام تھا۔ پھر قہوے کی فرمایش کی جو کیمپ مالک نے پوری کر دی۔ باہر خنکی نے بھی ہمارا بیٹھنا محال کرنا شروع کیا۔ اس وقت تک ہمارا کیمپ تیار ہو چکا تھا۔ مالک سے کیمپ میں جاتے جاتے پھر کہا: "میں تو چلا یاک کے ہوٹل میں۔۔" وہ صرف ہنسا۔ اور ہم خیمے کے اندر چلے گئے۔ زمین پر گدے بچھے ہوئے تھے اوپر ہم نے رضائیاں اوڑھ لیں۔ اور کچھ ہی دیر میں کچھ ہوش نہ رہا۔

**24 اور 25 جون 2023 بروز ہفتہ اتوار**

رات ٹھٹھرتے ہوئے گزری۔ خیمے میں نہ جانے کہاں سے ہوا کے جھونکے اندر آ آ کر ہمارے ساتھ چھیڑ خوانی کرتے رہے۔ جوں ہی رضائی سے باہر منہ نکالتے۔ کوئی نہ کوئی "ٹھنڈر یلا" آ کر ہمارے منہ سے ایسا منہ جوڑتا کہ فوراً ہمیں رضائی کے اندر دبک کر اپنا دفاع کرنا پڑ جاتا۔ رات کبھی سوتے کبھی جاگتے گزری۔ سحر کے وقت ابھی اندھیرا باقی تھا کہ آنکھ پوری طرح کھل چکی تھی۔ اٹھا اور باہر نکل کر دیکھا۔ ندی بہنے کی آہستہ آہستہ آواز آ رہی تھی۔ ندی خراماں خراماں بہے جا رہی تھی۔ کچھ اجنبی سے پرندے بھی کھلے میدان کے گرد اٹھ کھیلیاں کر رہے تھے۔ کچھ دیر قدرت کے حسین نظارے سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر احمد ندیم بھائی بھی نماز کے لیے اٹھ چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں دیگر خیموں میں سے بھی لوگوں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ صبح چھے بجے تک تقریباً سبھی خیمے جاگ چکے تھے۔ باہر ہوا میں خنکی زوروں پر تھی۔ صبح کے وقت بیت الخلا جانا انسانوں کا فطری تقاضا ہوتا ہے۔ ہم خود کو انسان ہی شمار کرتے ہیں۔ مگر پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے اس تقاضے کو پورا کرنے میں خاصی دشواری بھی پیش ہوئی۔ بچوں کو جگایا گیا۔ خیمے کے مالک نے ناشتے کی پیش کش کی۔ ناشتے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا کہ استک نالے کے ہوٹل کو موقع دیا جائے گا کہ ہماری خدمت کرے۔ ڈرائیور سے واپسی کا کہا اور تقریباً صبح سات بجے ہم واپسی کی راہ پر ہو لیے۔ اس دن ہماری جیپ وادیِ باشو سے نکلنے والوں میں سب پر سبقت لے گئی۔ جیپ اچھلتی کودتی پہاڑ سے نیچے اتر رہی تھی۔ آدھے راستے پر ڈرائیور صاحب نے ایک لڑکے سے اپنی زبان میں کچھ بات چیت کی۔ پھر وہ لڑکا ڈرائیور کی سیٹ پر آ بیٹھا اور ڈرائیور اتر کر جیپ کے پچھلے پائپوں کے ساتھ ہینگر ہو گیا۔ نوجوان لڑکے نے جیپ کی رفتار کو تیز کر لیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ڈرائیور کا شاگرد ہے اور ڈرائیونگ سیکھ رہا ہے۔ ہمارے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ کے توتے اڑ گئے۔ ہم کہتے ہی رہے بھائی آہستہ آہستہ۔۔۔ مگر جیپ ناہموار راستوں پر فٹ بال بنی لڑھکنے لگی۔ قسمت کا مارا ایک بچھیرا اس تنگ روڈ پر جیپ کے آگے کیا آیا۔ نوجوان ڈرائیور کو کھیل مل گیا۔ بچھیرا خوف زدہ ہو کر جیپ کے آگے آگے بھاگنے لگا۔ شاگرد ڈرائیور اسے ہارن بجا بجا کر اور ڈراتا، دھمکاتا، بھگاتا اور اس کے ساتھ ساتھ جیپ کی رفتار بڑھاتا رہا۔ اس بے چارے کو کم از کم پانچ سو میٹر تک تو بھگایا ہی ہوگا کہ آخر کار اسے راہِ نجات مل گئی اور وہ ایک پگڈنڈی پر ہو لیا۔ شکر ہے ڈرائیور صاحب نے اس پگ ڈنڈی کی طرف اپنی جیپ کا رخ نہیں کر لیا۔ صحیح معنوں میں خدا خدا کر کے جیپ پکی سڑک پر پہنچی۔ وہاں ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس خطرناک نوجوان سے جان چھوٹی۔

## پانی کا ریلا گاڑی کے بونٹ کے اوپر سے گزر گیا

گوری ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کی گود میں جا بیٹھے اور واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں ہم استک نالے کے مڈوے ہوٹل پر پہنچے۔ چائے چنے، آملیٹ اور پراٹھوں کی فرمائش کی۔ ناشتا بس ٹھیک ہی تھا۔ پھر ہماری اگلی منزل گلگت کی تھی۔ گلگت پہنچے تو گرمی اپنے خوب جوبن پر تھی۔ سعد نے کہا کہ میں نے شیو بنوانی ہے۔ احمد ندیم بھائی نے بس اڈے کی طرف گاڑی موڑ لی۔ وہاں عوامی ماحول اور خوب افراتفری تھی۔ ایک ہوٹل پر بیٹھ کر ہم نے چائے وغیرہ پی اتنے میں سعد شیو بنوا کر لوٹ آیا۔ ہم بھی وہاں سے روانہ ہوئے۔ گلگت میں ایف سی این اے کے میس میں ہمارا قیام طے ہوا تھا۔ وہاں پہنچے۔ ایک اچھا سجا سجایا کشادہ کمرا ملا۔ اے سی آن کیا کیوں کہ گرمی نے ستا رکھا تھا۔ نیند آنے کی ضد کرنے لگی۔ نیند کو سمجھایا اتنی دور ہم سونے کے لیے نہیں آئے۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے، سعد نے کمرے ہی میں آرام کرنے کی ٹھانی۔ اس لیے اسے وہیں چھوڑا اور باقی ہم تین گلگت کی این ایل آئی مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔ موسم تپ رہا تھا۔ کچھ دیر این ایل آئی مارکیٹ میں شاپنگ وغیرہ کی گئی۔ پھر وہاں کے مشہور ڈرائی فروٹ کی دکانوں سے خشک میوہ جات خریدے۔ گلگت میں جب پچھلی بار گیا تھا تو وہاں بازار میں "ممتو" کھائے تھے۔ وہ بہت مزے کے تھے۔ وہیں سے دوبارہ دو درجن ممتو پیک کروائے اور کمرے میں ساتھ لے آئے۔ بیٹھ کر کھائے۔ واقعی بہت مزے دار تھے۔ اگرچہ سعد کے خیال میں یہ پشاور والے "ممتوؤں" سے کم مزے دار تھے۔ ہم نے چوں کہ پشاوری ممتوؤں کو کبھی منہ نہیں لگایا تھا اس لیے اس کی بات کی تصدیق یا تردید کرنے کی کوئی دلیل نہیں رکھتے تھے۔ سو چپ رہے۔ کچھ دیر لیٹ کر وقت گزارا۔ رات کے کھانے پر ہمارے شاگردِ عزیز میجر مبارک گھمن نے "گمار کو پولو" کے پہلو میں ایک کیفے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ تیار ہو کے وہاں پہنچے۔ مبارک گھمن سے ایک عرصے بعد ملاقات اور بات چیت ہوئی۔ طعام اور گفت و کلام کے حوالے سے بہت مزے دار محفل تھی۔ کئی باتیں کئی یادیں دہرائیں۔ رات گئے واپس آئے۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں خراٹوں کے بھونپو بجنے لگے۔ یہ ہمارے اس سفر کی آخری رات تھی۔

اگلے دن علی الصبح ہی ہم نے گلگت کو خیر باد کہ دیا۔ ساڑھے پانچ بجے ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جاتے وقت جو جوش اور جذبہ تھا وہ ماند پڑ چکا تھا۔ دونوں نوجوان پچھلی سیٹ پر خراٹے لے رہے تھے۔ جگلوٹ گزرا تو چاچو کی یاد آئی۔ فون کیا لیکن جواب موصول نہیں ہوا۔ رائے کوٹ کے پل کو عبور کرتے، تتا پانی کو پیچھے چھوڑتے اس مقام پر آ پہنچے جہاں سات سال پہلے میں نے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ وہاں آ کر برنچ کیا۔ اس کے بعد واپسی کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ انھی جانے پہچانے راستوں سے واپس آ رہے تھے۔ دل ان حسین مقامات کو الوداع کہنے کا بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ بابوسر ٹاپ سے ہوتے گیتی داس سے گزرتے بغیر رکے ناران پہنچے۔ ناران میں واش روم کی تلاش کی گئی۔ فراغت کے بعد دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ محسوس یہی ہو رہا تھا کہ واپسی کے راستے بہت اداس ہیں۔ ناران سے واپسی پر پھر ایک طویل ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ گھنٹوں اس میں پھنسے رہے۔ نالے پر پل زیرِ تعمیر تھا۔ ناران میں سیاحوں کی بہتات تھی۔ آنے اور واپس جانے والوں کی تعداد یکساں تھی، نالے میں پانی میں سے گزرنے کے باعث بہت سی گاڑیاں بند ہو جاتی تھیں جن کو وہاں پر موجود رضا کار سیاح دھکے دے دے کر نکلوا رہے تھے۔ جب ندیم بھائی نے گوری کو گہرے پانی سے گزارا تو اگلی گاڑی اچانک بند ہو گئی۔ آپ نے انتہائی حاضر دماغی اور چستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاڑی مزید گہرے پانی کی طرف موڑتے ہوئے گاڑی کو رکنے نہ دیا۔ پانی کا ایک ریلا شیشوں تک آ کر ٹکرا گیا بونٹ کے اوپر سے دوسرا ریلا گزر گیا۔ خوف تھا گاڑی بند ہو جائے گی۔ مگر احمد ندیم بھائی کی مہارت اور گوری کی ہمت کے باعث یہ مشکل بھی ختم ہوئی۔ واپسی پر بغیر رکے ہم بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ شام ہو چکی تھی جب ہم بالاکوٹ کے بازار سے گزرے۔ ایک ہی دھن تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچا جائے۔ میں تو احمد ندیم بھائی کی ہمت کو داد دیتا ہوں کہ وہ صبح کو گلگت سے نکلے اور بغیر تبدیلی کے سارا دن ڈرائیونگ کر کے آخر کار رات دس بجے کو ہم گھر پہنچ گئے۔ یوں یہ اسکردو کا حسین دورہ اختتام پذیر ہوا۔ (اختتام)

## کراچی پریس کلب کی اعزازی رکنیت

"پاکستان کے سب سے بڑے پریس کلب نے ہمیں بڑھاپے میں اعزازی رکنیت سے نوازا ہے۔اس موقع پر 29 اگست کو بارش کے باوجود تقریب منعقد ہوئی ۔اہل قلم کافی بڑی تعداد میں موجود تھے۔پریس کلب کے سیکرٹری شعیب احمد۔قائم مقام نائب صدر نواب قرشی۔سابق ایڈیٹر اخبار خواتین شمیم اختر۔نئی بات کے ایڈیٹر مقصود یوسفی نے خطاب کیا۔ میں نے جو اظہار خیال کیا اس کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔"

# پاکستان میں ہر پیدا ہونے والے کی جوانی میں ایک مارشل لا ضرور لگتا ہے

### تقریب سے محمود شام کا خطاب

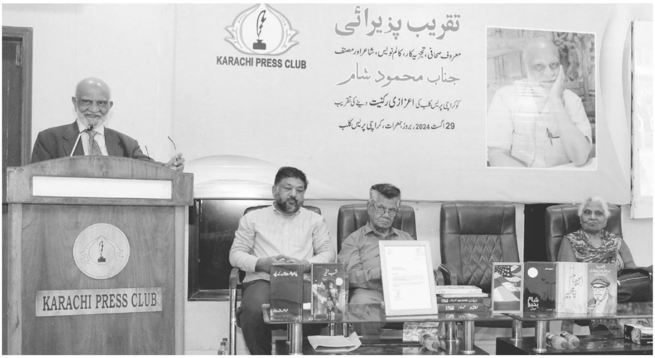


57 سال پہلے ہم 1967 میں کراچی پریس کلب کے باقاعدہ کونسل ممبر بنے۔ جسے ووٹ دینے کا حق تھا۔پھر 1975 ایسوسی ایٹ ممبر کیونکہ رسالے کے پبلشر بن گئے تھے۔پھر پریس کلب کے نادہندہ ہوئے فہرست میں نام آویزاں رہا۔اب بڑھاپے میں اعزازی رکنیت سے نوازے جارہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ عشق کے تمام مرحلے طے ہوگئے۔صرف تعزیتی ریفرنس رہ جائے گا۔

میں کراچی پریس کلب کی موجودہ منتخب انتظامیہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس خاکسار کو اس قابل سمجھا۔کراچی پریس کلب کی اعزازی رکنیت یقینا ایک گراں قدر اعزاز ہے کیونکہ کراچی پریس کلب کی "آزاد علاقے"، "Liberated Area" کی حیثیت سے دنیا بھر میں ایک وقعت ہے۔اور ہمیں یہ اطمینان ہے کہ اسے آزاد کروانے اور اس کی آزادی برقرار رکھنے میں ہمارا ابھی کچھ

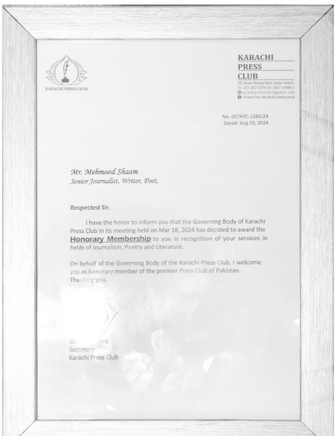

KARACHI PRESS CLUB

KARACHI
PRESS
CLUB
267 Sarwar Shaheed Road, Saddar, Karachi.
Tel: 021-35212579 Cell: 0327-2499613
karachipressclub1@gmail.com
The Karachi Press Club (official) / www.kpc.com.pk

No. GC/KPC-1285/24
Dated: Aug 29, 2024

*Mr. Mehmood Shaam*
*Senior Journalist, Writer, Poet,*

Respected Sir,

I have the honor to inform you that the Governing Body of Karachi Press Club in its meeting held on Mar 18, 2024 has decided to award the **Honorary Membership** to you in recognition of your services in fields of Journalism, Poetry and Literature.

On behalf of the Governing Body of the Karachi Press Club, I welcome you as honorary member of the premier Press Club of Pakistan.
Thanking you,

Sh[illegible]ed
Secretary
Karachi Press Club

اعزازی رکنیت کی پیشکش۔شعیب احمد۔سیکرٹری پریس کلب بائیں سے دوسرے۔قائم مقام صدر نواب قریشی۔دائیں سے دوسرے انتہائی دائیں بیگم محمود شام

حصّہ رہا ہے۔ پاکستان جہاں ہر پیدا ہونے والے کی جوانی میں ایک مارشل لاء ضرور لگتا ہے۔ وہاں کراچی پریس کلب میں اقتدار ہمیشہ ووٹ کے ذریعے منتقل ہوا ہے۔ کبھی فارم 45 اور 47 کا جھگڑا نہیں ہوا۔ الیکشن کے نگراں حسن امام صدیقی قابل فخر ہیں۔

ملک کی آبادی بڑھی ہے تو کراچی پریس کلب میں بھی ممبرز کی تعداد

> **کراچی پریس کلب ہمیشہ سے ''آزاد علاقہ'' رہا ہے**

میں اضافہ ہوا ہے۔ ستم یہ ہے کہ اخبارات و رسائل کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا پر یوٹیوب چینل اَن گنت ہوتے جا رہے ہیں۔ پریس بھی بند ہو رہے ہیں۔ اب دوست دشمن ہم اخبار والوں کو ''میڈیا'' کہتے ہیں۔ میڈیا آزاد ہو رہا ہے سوشل میڈیا مادر پدر آزاد۔ عام لوگ میڈیا کی عزت کی بجائے میڈیا سے خوف کھاتے ہیں۔

علی الصباح چوں مردم بہ کاروبار روند
بلا کشان محبت بہ کوئے یار روند

کراچی پریس کلب کوئے یار بھی تھا۔ بہت سے عشق یہاں ہوئے کامیاب بھی ناکام بھی۔ فرزانہ خان ان کے میاں شبیر حسین یاد آ رہے ہیں۔ شبیر حسین ہمارے رابطے میں ہیں ان سے کچھ تاریخی تصاویر حاصل ہوئی ہیں۔ ان کے صاحبزادے رافع تو یہیں پلے بڑھے۔ ڈان کے ہمدان امجد علی۔ اخبار جہاں کی نوشابہ مقبول کا رشتہ بھی یہیں ہوا۔ تشنگان کے لیے یہاں سہولت کاری بھی ہے۔ جہاں حبیب جالب۔ عبدالحمید چھاپرا۔ بشیر مرزا اور بڑی بڑی ہستیوں سے ملاقات رہتی تھی۔ فنون لطیفہ کی سرپرستی بھی یادگار رہی ہے۔ اقبال بانو کی غزل سرائی کے ساتھ ڈان کے چیف رپورٹر حضور احمد شاہ کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہیں سعید خان عبدالستار بھی یاد آتے ہیں۔ بڑی بڑی گلوکارائیں۔ مغنی کراچی پریس کلب میں اپنے

مقصود یوسفی

شمیم اختر

# کراچی پریس کلب کی اعزازی رکنیت

کراچی پریس کلب کی لائبریری کے لیے محمود شام اپنی کتابیں پیش کررہے ہیں

سیشن کے لیے سفارشیں کرواتے تھے۔ اداکار محمد علی۔ اداکار حبیب۔ مصطفی قریشی۔ منور سعید کی پرچھائیاں ذہن میں رقص کررہی ہیں۔

جنوبی ایشیا کے عظیم صحافی کئی کتابوں کے مصنف خوشونت سنگھ کی آمد بھی یادگار ہے۔ عصمت چغتائی بھی یہاں گفتگو میں کتنی خوش تھیں۔ مجنوں گورکھپوری بھی۔ ٹیرس میں دانش کے موتی لٹارہے ہیں۔ جگجیت سنگھ۔ چترا کی مدھر آوازیں بھی ٹیرس میں گونجتی رہتی ہیں۔ ٹیرس میں ہی جنوری 1970 کی ایک سہ پہر میرے سامنے ہے۔

## انتظامیہ ہمیشہ ووٹ کے ذریعے تبدیل ہوتی ہے

میری طویل نظم 'کارڈیوسپازم' کی رُونمائی ہورہی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو مہمان خصوصی ہیں۔ عبدالحمید چھاپرا صدر ہیں۔ غلام مصطفی کھر بھٹو صاحب کو ڈرائیو کرکے لائے ہیں۔ طارق عزیز ہیں۔ ابراہیم جلیس۔ محسن بھوپالی۔ شوکت صدیقی۔ ظفر رضوی۔ سعیدہ افضل۔ رعنا فاروقی۔ 1970 کی طویل ترین انتخابی مہم کا آغاز اس تقریب سے ہوگیا ہے۔ بھٹو صاحب کے علاوہ پریس کلب میں شیخ مجیب الرحمن۔ خان عبدالولی خان۔ ایئر مارشل اصغر خان۔ مولانا کوثر نیازی۔ سردار عبدالقیوم خان۔ شورش کاشمیری۔ مولانا شاہ احمد نورانی۔ فضل القادر چوہدری۔ قاضی حسین احمد۔ پروفیسر غفور احمد۔ معراج محمد خان۔ فتحیاب علی خان۔ نوابزادہ نصر اللہ خان۔ بے نظیر بھٹو۔ فاطمہ بھٹو نے بھی کلب کے ارکان سے خطاب کیا ہے۔

انو بھائی کا کارنر بھی یاد آرہا ہے۔ 'ڈان' کے سینئر اسپورٹس ایڈیٹر۔ ڈان کے ہی مجید صاحب۔ کبیر صاحب۔ برنی صاحب۔ اب جہاں پارکنگ ہوتی ہے یہاں والی بال کا نیٹ لگا ہوا ہے۔ غیاث بابو۔ کبیر والی بال اچھالتے دکھائی دے رہے ہیں۔

احتجاج کے موسم میں کراچی پریس کلب گل وگلزار ہوجاتا تھا۔ ایوبی آمریت کے خلاف۔ یحییٰ خان کے دَور میں۔ پھر بھٹو صاحب۔ جنرل ضیا کے سفاک دور میں کراچی پریس کلب ہی سب باغیوں کی آخری پناہ گاہ ہوتی تھی۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے جرنلسٹ گھروں میں نہیں یہاں ابراہیم جلیس ہال میں سوجاتے تھے پولیس تو کیا کسی وگویا ڈالے کی ہمت نہیں تھی کہ پریس کلب کی چار دیواری میں داخل ہوسکے۔

پھر کچھ اچھے دن آئے تو ہم ہر اتوار بچوں کو سمندر کے کنارے لے

(دائیں سے بائیں)۔ رشید جمال۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد۔ نواب قریشی۔ بیگم محمود شام۔ شعیب احمد۔ مہناز رحمن۔ شہناز احد اور شمیم اختر

منصور ساحر اجرک پیش کر رہے ہیں

جاتے۔ساحل کی ریت پر انگریزی ناول پڑھتے۔وہیں گھر سے لایا ہوا کھانا نوش جاں کرتے۔ واپسی پر بچوں کا اصرار ہوتا چائے اور شامی کباب پریس کلب میں۔ اکثر اوقات بحیرہ عرب کی ریت یہاں کے غسل خانے میں بہائی جاتی۔ پریس کلب کے شامی کباب اور دال کی دھوم تھی۔

ہماری بیگم بچوں نے پریس کلب کے سالانہ کھیلوں میں با قاعدہ حصّہ لیا۔انعامات بھی حاصل کیے۔

اُردو۔سندھی۔پشتو۔بلوچی۔سرائیکی ادب کے فروغ میں بھی پریس کلب مرکز جاہ و جمال رہا ہے۔ جمال کے حوالے سے تو اطہر جاوید صوفی۔قیصر جعفری۔عبدالواسع قریشی بہتر بتا سکتے ہیں۔ ٹی وی فلم جرنلٹس ایسوسی ایشن اداکاروں۔اداکاراؤں اور حسیناؤں کو پریس کلب میں لاتی تھی۔ 1986 میں ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھی پریس کلب کی یادگار محفلوں میں سے ہے۔

1975 میں ہمارے پہلے مجموعۂ کلام 'چہرہ چہرہ مری کہانی' کی مہورت بھی یہیں ہوتی ہے۔مولانا کوثر نیازی مہمان خصوصی ہیں۔ ابراہیم جلیس۔مختار زمن۔ابن انشا نے کرم فرمایا۔سحر انصاری بھی تھے۔ اور احباب بھی۔

کراچی پریس کلب ایک گلدستہ ہے۔حکومتیں تو قومی یکجہتی کے فقط نعرے لگاتی ہیں۔اربوں روپے کھا جاتی ہیں۔مگر کراچی پریس کلب میں ہم نے سب نسلوں کو۔سب زبانوں کو شیر و شکر دیکھا ہے۔ پہلے بنگلہ اُردو ساتھ ہوتے تھے پھر اُردو۔سندھی۔پشتو۔بلوچی۔سرائیکی۔

**احتجاج کے موسم میں پریس کلب گل و گلزار ہو جاتا ہے**

براہوی۔کشمیری۔بلتی کے پھول اور پتیاں۔ یہاں کا لان ٹیرس گواہی دے رہا ہے کہ اُردو۔سندھی۔پشتو۔بلوچی شاعری ان درختوں نے بھی سنی ہے۔

1978 کی صحافیوں کی تحریک جو روزنامہ 'مساوات' کی بحالی کے لیے چلائی گئی تھی۔ وہ کبھی کامیاب نہ ہوتی۔ اگر رسول بخش پلیجو۔اور فاضل راہو اپنی عوامی تحریک کے کارکنوں کو اس میں شامل نہ کرتے۔ ہفت روزہ 'معیار'۔'الفتح' اور کئی اخبارات کے پریس کارڈ انہیں دیے گئے۔ رضا کارانہ گرفتاریاں اس لیے طویل عرصہ تک چلتی رہیں۔

بیسویں صدی کے کراچی پریس کلب میں اگر جلال تھا۔تو اکیسویں صدی کے پریس کلب میں جمال بھی ہے۔کمال بھی ہے۔

اب کبھی کبھار کسی تقریب کے لیے یہاں آنا ہوتا ہے تو پاکستان کے نادار پامال طبقوں کو اس کے سامنے احتجاج کرتے دیکھتے ہیں۔اب یہ صرف صحافیوں کے لیے مقام آہ و فغاں نہیں ہے۔ بلکہ خلقت شہر یہاں اپنے افسانے سنانے آتی ہے۔کراچی پریس کلب سے ہی عوامی احتجاج کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اب پاکستان کے سارے پریس کلب تحریر اسکوائر بن گئے ہیں۔

آخر میں پھر ایک بار اظہار تشکر۔شعیب احمد کے لیے۔سعید سربازی کے لیے۔پوری گورننگ باڈی کے لیے بھی۔

لوگ جائیں گے۔لوگ آئیں گے
کل یہاں اور کتنے ہم جیسے
کچھ نئی مشعلیں جلائیں گے

مشعلیں جلتی رہیں گی۔ پرچم بلند ہوتے رہیں گے۔انشاءاللہ۔

ایک یادگار فوٹو

> سلیم عمران کا نشتر تیز ہوتا جا رہا ہے۔ قارئین کی پسند بڑھتی جا رہی ہے۔ قارئین 'اطراف' خود بھی اظہار خیال کے لیے بے چین ہیں۔ ڈرامے آپ بھی دیکھتے ہیں۔ سمندر پار پاکستانی بھی۔ ٹی وی ڈراما مافیا کے خلاف آواز بلند کریں۔ تہذیب کی فغاں ہے۔ تمدن کی آہ ہے۔ ہماری اقدار بین کر رہی ہیں۔ سیاست میں تو اظہار سے ڈر لگتا ہے لیکن ڈرامے تو آپ اپنی پسند کے دیکھ سکتے ہیں۔

# دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے ڈراموں میں کیا۔؟

تحریر: عمران سلیم

دنیا میں ایک طرف سائنسی ترقی کے ہوشربا مناظر دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ خلائی جہازوں میں عام لوگ جو پیسے والے ہیں۔ بس سائنس دان نہیں ہیں نہ ہی ان کا مقصد خلا میں جانے کا کسی سائنسی مشن کی تکمیل ہے۔ یہ ایسے عام لوگ ہیں جو خلا میں گھومنے پھرنے کے مزے لوٹنے کی خاطر سائنس کی نئی کوششوں کا حصہ ہیں۔ کئی بار ایسی خبریں بھی سننے اور دیکھنے میں آ رہی ہیں کہ خلائی سیاروں پر انسانی بستیوں کی آبادکاری کے منصوبوں پر گہرائی سے غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں مسلم دنیا جو سائنس کی ایجادات کے استعمال سے مستفید تو ہوتی ہے مگر وہ سائنسدان پیدا کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ دوسروں کی کاریگری کو خرید کر استعمال کرنے کی عادت تو سب کو ہے لیکن خود اس لائق کبھی نہیں بنتا کہ ایسے کاریگر اپنی قوم میں پیدا کیے جائیں چنانچہ ایک عام رائے کے مطابق مسلم دنیا نے گزشتہ آٹھ سو برس سے کوئی قابل ذکر سائنسدان پیدا نہیں کیا اور کسی خطے میں ایسے مفکر بھی پائے نہیں جاتی کہ مسلمانوں کو بھی سائنس کے میدان میں ان ممالک کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جن کی وجہ سے آج زندگی سائنسی فتوحات کے مرہون منت اس قابل ہے کہ کوئی کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے ایک چھوٹے سے موبائل میں اتنی بڑی دنیا دیکھی

## دماغ سے بنے ڈرامے عوامی پذیرائی نہیں پاتے

جا سکتی ہے کہ محو حیرت ہو کہ۔۔۔۔

گزشتہ دنوں اسرائیل نے جس طرح لبنان میں حزب اللہ کے ڈی سی پیجروں کے ذریعے دنیا کو ایک نئے جنگی پینترے سے روشناس کرایا ہے۔ اس واقعہ نے تمام حساس دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ انسانوں کے ہاتھوں میں موجود موبائل فون بھی اس ٹیکنالوجی کے استعمال سے ایک وسیع تباہی اور انسانی ہلاکتوں کا ایسا دردناک واقعہ بن کے رونما ہو سکتا ہے۔ جس کے بعد ہر انسان کو یہ احساس کرا دیا جائے گا کہ اس کی موت اس کی اپنی مٹھی میں بند ہے اور اس کا ریموٹ کنٹرول سائنسی ترقی سے مالا مال کسی ایسے ملک کے ہاتھوں میں ہے جسے وہ ٹھیک سے جانتا تک نہیں ہے!

ایک طرف یہ منظرنامہ ہے اور دوسری طرف ہمارے ڈراموں کے موضوعات ملاحظہ کیجیے۔ ہم ٹی وی سے ایک ڈراما گزشتہ مہینوں میں شروع ہوا جس کا عنوان ہی ''من جوگی'' اسے ظفر معراج نے لکھا ہے اور اس کے ڈائریکٹر کاشف نثار ہیں۔ یہ جوڑی پہلے بھی ایسے کئی ڈرامے پیش کر چکی ہے جن میں سماجی مسائل کو دیگر ڈراما بنانے والوں کے مقابلے میں زیادہ گہرائی اور سنجیدگی سے ڈس کس کیا گیا تھا۔ (یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ڈراموں کے ذریعے سماج میں بہتر رجحانات کو فروغ حاصل نہیں ہوتا البتہ الٹے سیدھے منفی موضوعات پر مبنی ڈراموں سے ایسی

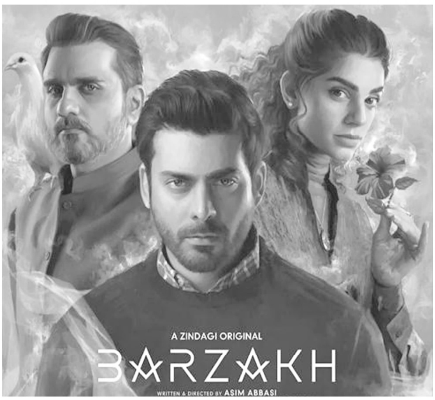

باتیں تیزی سے پھیلتی ہیں جن سے سماج کو بالعموم نقصان پہنچنے کا اندیشہ موجود ہوتا ہے۔) سنجیدگی سے کسی بھی موضوع پر جب بھی کوئی ڈراما بنایا جاتا ہے اس کے لئے صرف یہ امید کی جاسکتی ہوتی ہے کہ شاید اسے لکس ایوارڈ کے لئے نامزدگی مل جائے۔ وگرنہ دماغ سے بنائے ہوئے ڈراموں کو ناظرین کے وسیع حلقوں میں پسندیدگی اور پذیرائی حاصل نہیں ہوتی۔ جسے کہا جاتا ہے بے شمار ریٹنگ کا آنا اور عوامی سطح کی حیر معمولی مقبولیت سے ہمکنار ہونا ایسے ڈرامے جیسے ''تیرے بن'' ایک ڈراما تھا جسے کہتے ہیں کہ ایسی مقبولیت حاصل ہوئی جو بہت کم ڈراموں کا مقدر بن سکی ہے۔ لیکن جب اس ڈرامے کا سنجیدگی سے جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح کسی انسان یا پوری قوم کو نشے کی لت میں مبتلا کردیا جاتا ہے اور وہ قوم نشے کی تباہ کن پستیوں میں گرتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کام اس نوع کے ڈراموں سے لیا جارہا ہے۔ ڈراما دیکھنے والی خواتین ہوں یا مرد حضرات سب کو اس مخصوص نشے کی ''لت'' پڑ چکی ہے لہٰذا ایسے ڈرامے کثرت سے کامیاب ہوتے ہیں یا کامیاب کرائے جاتے ہیں۔ اور جو ڈرامے زیادہ سنجیدگی سے ناظرین کی توجہ کسی ایسے مسئلے کی طرف دلانا چاہتے ہیں جسے ڈراموں کے ذریعے حل تو نہیں کیا جاسکتا مگر اس پر ایک صحت مندانہ سماجی بحث کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ ''من جوگی'' بھی ایسی ہی دعوت فکر دیتا ہوا ڈراما ہے جس میں ''حلالہ'' جیسے پٹے ہوئے اور اجنبی موضوع کو زیر بحث لایا گیا۔ ظفر معراج نے پوری چابک دستی سے اس موضوع کے نتیجے میں ہونے والا استحصال اور اس کے غلط استعمال کو ڈرامائی منظر کا حصہ بنایا ہے۔ کرداروں کی مظلومیت اور مجبوریوں کو اچھی طرح اور نمایاں انداز سے دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن اس وقت شاید یہ موضوع خارج از بحث ہے شہروں کی حد تک تو اس موضوع کی مقبولیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن جاگیرداری سماجوں میں سیاسی کھیل تماشے کی طرح اس سے اب بھی کھیلا جاتا ہے (غالباً) جیسا کہ مذکورہ ڈرامے میں دکھایا گیا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ڈراما شہری سماج سے ناظرین کی دلچسپی سمیٹنے میں ناکام ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ جس انداز سے من موجی میں اس موضوع کو لکھا اور دکھایا گا ہے مذہبی ٹھیکداروں نے اس پر اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا یا انھیں خبر نہیں ہوئی یا پھر یہ ایک منی سیریل ہے۔ اور ان سطور کی اشاعت تک اس ڈرامے کا خاتمہ ہوجانا ہے۔ بعد میں فارغ بیٹھے مولویوں نے شور بھی مچایا تو کیا، جنگل میں ناچنے والے مور جنھوں نے دیکھنا تھا وہ دیکھ ہی چکے ہوں گے۔ ایسا ہی کچھ ''برزخ'' کے ساتھ ہوا تھا اس ڈرامے میں ''ہم جنس پرستی'' کے

حوالے سے ایک ٹریک رکھا گیا تھا۔ مذہبی اور دقیانوسی حلقوں نے جس وقت شور وغوغا بلند کیا تب تک ''برزخ'' اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لہٰذا ایسے مذہبی طبقے برزخ کو کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام رہے۔ غالباً ''من موجی'' کے ساتھ بھی یہی ہونے والا

**دبسمل، ریٹنگ کی دیوی**
**زنجبیل عاصم کا شاہکار**

ہے۔ ''حلالہ'' کا موضوع برصغیر میں سب سے اچھے اور معیاری انداز سے حسن طارق کی فلم ''دیدار'' میں پیش کیا گیا تھا۔ پاکستان میں یہ فلم بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی۔ (ان وقتوں میں مولوی مذہب کے سنجیدہ کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے اس لئے کسی مذہبی طبقے کی جانب سے کوئی شور وغلغلہ بھی بلند نہیں ہوا۔ اور فلم آئی اور گزر گئی) اسی فلم دیدار کی کہانی کو جب انڈیا والوں نے ''نکاح'' کے عنوان سے بنایا جو پاکستانی فلمی اداکارہ سلمیٰ آغا کی پہلی انڈین فلم تھی تو ہندوستان میں نکاح نے کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے کہ نئے ریکارڈز قائم ہوئے۔

من موجی میں ''حلالہ'' ایسے ہی قابل اعتراض انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اگر فارغ بیٹھے مولویوں کو اس کی خبر ہوجاتی تو وہ کچھ دیر کو شور شرابا کرکے اپنے لئے مصروفیت کا انتظام کرسکتے تھے۔ ایک لڑکے کو (جونئ نسل کے ہیرو بلال عباس ہیں) جسے مولوی نے پالا پوسا ہے ایک علاقائی سیاستدان نے طیش میں آکے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے اور اپنی غلطی کا اسے جلد ہی

احساس ہوجاتا ہے وہ مولوی سے ساز باز کر کے ''حلالہ'' کا بندوبست کرنے کو کہتا ہے۔لڑکے کی مرضی کے خلاف مولوی اس کی قربانی دینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔لڑکا گڑگڑاتا ہے مگر اس کی شادی اس عورت سے زبردستی کردی جاتی ہے۔رات گزرنے کا

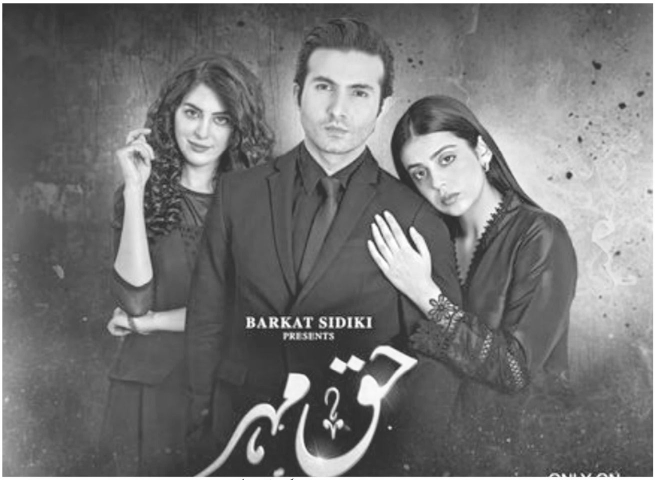


سیاستداں بے چینی سے انتظار کر رہا ہے مگر واقعہ من چاہا رونما نہیں ہوتا بلکہ ہوتا یوں ہے کہ مولوی کالے پالک لڑکا اس عورت کے ایما پر اسے رات کے اندھیرے میں لے کر بھاگ جاتا ہے۔ اسلام میں ''حلالہ'' کا یہ طریقہ یقیناً نہیں بتایا گیا ہے۔ بڑا ہی نادر موقع تھا جو فالتو کے کاموں میں ملوث مولویوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب سلطانہ صدیقی (جو اس ڈرامے کی پراسرار انداز میں پریذیڈنٹ ظاہر کی گئیں وہ کچھ عالمی فورموں پر یہ کہنے کے لائق ہوگئی ہیں کہ انھوں نے حلالہ جیسے موضوع پر ڈراما پیش کیا۔ دقیانوسی مذہبی طبقے اعتراضات اٹھا دیتے تو سلطانہ کو عالمی فورموں پر زیادہ توانائی سے ہیرو بننے کا موقع مل سکتا تھا جیسا کہ ہمیشہ بی بی سی وغیرہ کے سوالوں کے سامنے انھیں پسپائی کا سامنا رہتا ہے۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ان کا چینل بھی ریٹنگ کے حصول میں سرگرم کیوں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سماج کی اصلاح اور مکروہ چہروں کی نقاب کشائی کے لئے کچھ کیوں نہیں کرتیں۔؟ ٹی چینلوں کی دنیا میں پہلی خاتون صدر کے پاس دینے کو کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں ہوتا۔ سردست اس ڈرامے نے کاروباری ڈرامائی دنیا میں صرف اس امید کو ہی ٹھیس پہنچانے کا کام کیا ہے کہ شاید لکس ایوارڈ والے اس ٹاپک پر کچھ ہمدردی کا مظاہرہ کرسکتے ہوں۔

''بسمل'' یہ ڈراما اے آر وائی سے پیش کیا جارہا ہے، اسے زنجبیل عاصم نے لکھا ہے جو ''ریٹنگ ماسٹر'' کہلاتی ہیں۔ کسی زمانے میں کامیاب کمرشیل فلمیں بنانے والے بھی لائق توقیر و توصیف ہوا کرتے تھے کیوں کہ وہ فلمیں بھلے ہی کمرشیل بناتے تھے لیکن فلم کی تکمیل کے ہر ہر حصے اور شعبے کو ڈیزائن کرتے وقت سماجی حدود اور اپنی جنریشن کی اخلاقیات کا بھی بڑی حد تک خیال رکھا کرتے تھے مزید براں تخلیقی زاویوں سے فلم کو بہت حد تک آرٹ کا نمونہ بنانے میں کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ جیسے انڈیا کی ''مغل اعظم''، اور ''مدر انڈیا'' جبکہ پاکستان کی ریاض شاہد کی ''زرقا'' اور مسعود پرویز کی ''ہیر رانجھا'' ٹی ڈراموں

## 'جیو' 'حق مہر' کا بچہ۔ یا گڈا۔ جو چوں بھی نہیں کرتا

میں اس سے بھی زیادہ سماجی حساسیت کا دھیان رکھا جاتا تھا کہ تعمیری رجحانات کو ٹھیس نہ پہنچے علاوہ ازیں اس کے باوجود ایسے متنوع موضوعات پر ڈرامے لکھے اور پیش کئے گئے ماضی میں کہ آج بھی ان ڈراموں کی یادگاریں کئی نسلوں کے دلوں میں گردش کررہی ہیں۔ ڈرامے وہ سب بھی کاروباری ہی تھے مگر گئے عہد کے فلم میکرز اور ڈراما میکرز اور لکھنے والے سماج کی طرف سے اپنی ذمہ داریوں کا مظاہرہ اس طور پر کیا کرتے تھے کہ آج بھی لوگ ماضی کے ان ڈراما اور فلم میکرز کا نام عزت سے لیتے ہیں۔

موجودہ فلم اور ڈراما بنانے والوں کا سماج کی طرف سے کوئی ایسا ذمہ دارانہ رویہ نہیں ہے۔ وہ تو ریاست قدرے چوکنی ہے (اپنے مفادات کو نقصان پہنچنے کے معاملے میں دنیا کی پھٹیچر سے پھٹیچر ریاست بھی چوکنی ہوتی ہے) ورنہ آج کے ڈرامے بنانے والے وہ کچھ دکھا سکتے ہیں کہ ایکتا کپور کو بھی شرم سے آنکھیں بند کرنا پڑسکتی ہیں۔ بسمل کا موضوع ایسا ہی ہے۔ ایک نوکر پیشہ باپ کی بیٹی اس کے مالک کو اپنی جوانی اور اداؤں سے اس کے باوجود رجھانے اور پھانسنے کا کام کررہی ہے کہ اس بڑے سرمایہ دار کی ایک بیوی ہے اور ایک جوان بیٹا ہے۔ مگر لڑکی جو لالچ کی پوٹ ہے۔ اچھی طرح جانتی ہے کہ جوان لڑکا تو ابھی قلاش ہے باپ کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ دولت و ثروت کا اصل سرچشمہ تو باپ ہے لہٰذا پوری ڈھٹائی اور بے شرمی سے وہ باپ کو پھانس رہی ہے۔ اس قسم کے موضوعات کے معاملے میں یہ بی بی زنجبیل عاصم انگنت ماہرانہ پینترے چلنے اور لکھنے میں مشاق ہیں۔ چنانچہ انھیں ریٹنگ کی دیوی کہنا شاید غلط نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے ایسے خیالات اور نظریات سماج میں کتنے اور کیسے بگاڑ کا پیش خیمہ ہیں! کہنا چاہیے کہ ایسے ہی ڈراموں نے پاکستانی قوم میں لالچ، بے ایمانی اور اعلیٰ انسانی قدروں کی وہ بیخ کنی کی ہے کہ اب اس خرابے میں کوئی بھی معیاری ڈراما اپنے پاؤں جما ہی نہیں سکتا۔ آپ خود ہی سوچ کر دیکھئے ''پب'' کے باہر انجیل کے نسخے فروخت کرنے والے کا کیا انجام ہوسکتا ہے۔

''حق مہر'' جیو ٹی وی چینل ڈرامے کا سب سے بڑا چینل سمجھا اور مانا جاتا ہے مگر اس چینل کی تخلیقی قلاشی ملاحظہ کیجیے کہ مذکورہ ڈرامے کے بے شمار مناظر میں ایک شیر خوار بچہ اسکرپٹ کا حصہ ہے مگر یہ نام نہاد چینل ناظرین کی آنکھوں میں ایسی ڈھٹائی سے دھول جھونکتا رہا ہے کہ کسی ایک بھی منظر میں ایک چھوٹا بچہ حقیقت میں دکھا نہیں سکا۔ گڈوں سے کام چلایا گیا ہے یا پھر کپڑوں کے چھوٹے سے گٹھر کو بچہ بتایا جاتا رہا ہے (ناظرین کو دکھائی دے رہا ہے کہ جس بچے کا ذکر کیا جارہا ہے وہ موجود ہی نہیں ہے) کسی ایک سین میں بھی بچے کی ''چوں'' تک سنائی نہیں دی۔ اس طرح کے عظیم ڈرامائی مظاہروں کے بعد یہ نام نہاد چینل ناظرین کو باور کراتا ہے کہ اس کے ڈرامے کروڑوں لوگ پاکستان اور پاکستان سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت کے عالی سطح پر ڈنکے بج رہے ہیں۔ کیا واقعی دنیا میں اتنے زیادہ لوگ ہیں جو بے وقوف بنائے جاسکتے ہوں؟ کم سے کم تخلیقی ضرورتوں کو پورا کرنے میں تو ایمانداری دکھانی ہی چاہیے! حق مہر کو 57 ویں ایپی سوڈ کے بعد سات بجے کے بجائے یکایک رات دس بجے دکھایا جارہا ہے۔ ❁

## ٹی وی ڈراما مافیا تجزیہ

’اطراف‘ کی طرف سے ’فیس بک‘ پر دریافت کیا گیا تھا۔

### ”ڈرامے کون سے چینل کے ٹھیک لگتے ہیں اور کیوں؟“

اس سلسلے میں جو تجاویز تبصرے آئے ہیں وہ نذر قارئین ہیں۔ آپ بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں۔

**واٹس ایپ: 0300-8210636**

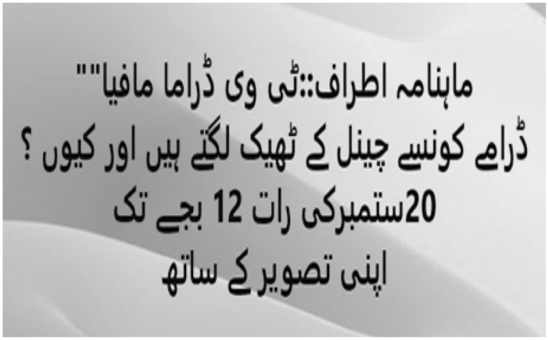


## ڈرامے میں اپر کلاس۔ غریب اور مڈل کلاس کیوں نہیں؟

☆اطراف فیس بک سروے

**سید مکرّم سلطانی بخاری.....** اہم موضوع

**صوفی رائو جاوید اختر.....** جاری رکھئے۔

**اسد نقوی.....** پاکستانی چینلز پر اُردو ڈرامے کی موجودہ صورت حال 2002 سے 2021۔ ایم فل اُردو کا مقالہ اسی موضوع پر لکھا تھا۔

**خالد ظفر.....** ہم ٹی وی کے ڈرامے نسبتاً بہتر ہیں۔

**ام حبیبہ.....** ہم ٹی وی

**ناہید عزمی.....** مدت ہوئی ڈرامہ لکھنا اور دیکھنا چھوڑ چکی۔

**بشیر خان.....** اب ڈرامے خوش لباس چکا چوند جگ مگ کرتی بڑی بڑی قیمتی کاریں، ڈھائی سو گرام چہرے پر میک اپ پچھتر پرسنٹ۔ ڈرائنگ روم میں کھڑے کھڑے مکالموں کی ادائیگی بیس پرسنٹ۔ کار میں بیٹھ کر ہیرو ہیروئن کی گفتگو پانچ پرسنٹ ڈرامہ۔

**سمانہ نقوی.....** ڈرامے میں اپر کلاس کو دکھاتے ہیں غریب اور مڈل کلاس کو نہیں۔

وزارت تجارت کے جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہونے والے سید ارتقا احمد زیدی 'اطراف' کے مستقل قلمی سرپرست ہیں۔ انتہائی اہم مشوروں سے نوازتے ہیں۔ سبزیوں پھلوں۔ خشک میوے۔ وٹامن پر ان کی تحقیق کئی ماہ کی مقبولیت خاص و عام حاصل کرتی رہی ہے۔ اب وہ ماشاللہ کتابی صورت میں شائع ہوگئی ہے۔ وہ درد مند پاکستانی ہیں۔ کئی بار بنگلہ دیش جاچکے ہیں۔ اب امریکہ میں قیام کے دوران ڈاکٹر محمد یونس سے بھی رابطہ رہا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا۔ بہت ہی درد اور کرب سے لکھا گیا ہے۔ اس کی گیارہویں قسط ملاحظہ کیجئے۔ اب صورت حال بدل گئی ہے۔ بھارت سے نفرت اور پاکستان سے محبت کا موسم ہے۔ پاکستان کی قیادت اس سے فائدہ اٹھائے۔ یہ مصنّف کی دعا اور تجویز ہے۔

# ڈاکٹر محمد یونس۔ غبن کے مقدمے سے بنگلہ دیش کے سربراہ تک

قسط نمبر 11

☆تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

8اگست کو ڈاکٹر محمد یونس نے بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے سربراہ کے طور پر بحیثیت چیف ایڈوائزر حلف اٹھایا۔ ان کی عمر 84 سال ہے۔ وہ شروع سے ہی پاکستان کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے حسینہ واجد نے پاکستان دشمنی سے مغلوب ہو کر ان کے خلاف غبن کا جھوٹا مقدمہ بنایا اور انہیں ملک چھوڑنا پڑا۔ اور وہ امریکہ چلے گئے۔

## جماعت اسلامی الیکشن میں کافی سیٹیں حاصل کرے گی

ڈاکٹر یونس دنیا کے وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے امن کا نوبل پرائز (2006) امریکہ کے صدارتی میڈل (2009) اور امریکہ کے Congressional Gold Medal (2010) کے علاوہ 27 ملکی اور بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کئے۔ انہیں امن کا نوبل پرائز گرامین بینک کے بانی کی حیثیت سے دیا گیا۔ گرامین بینک کے قیام کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر یونس ذاتی طور پر بہت رحم دل اور خدا ترس انسان ہیں۔ 1974 میں بنگلہ دیش میں قحط کی وجہ سے 27,000 افراد لقمہ اجل بن گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے 27 امریکی ڈالر کے برابر رقم غریب خاندانوں میں بطور قرض دی تا کہ وہ قحط کی تباہ کاریوں کے بعد نئے سرے سے اپنے کاروبار کا آغاز کر سکیں انہوں نے یہ قرض بغیر کسی ضمانت اور بلا سود دیا۔ اور آسان قسطوں میں واپسی طے پائی۔ یہ تجربہ انتہائی کامیاب رہا۔ 99 فیصد لوگوں نے قرض واپس کر دیا۔ اور اسطرح مزید قرض دینے کے لئے ڈاکٹر یونس نے وسیع پیمانے پر انتظامات کئے اور اپنے قابل اعتماد لوگوں کے ذریعے کامیابی سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ 1976 میں انہوں نے ایک پروجیکٹ بنایا جس میں بنگلہ دیش بینک کے تعاون سے قرضوں کی رقم میں اضافہ کر دیا اور آہستہ آہستہ اس پروجیکٹ کا دائرہ وسیع کر دیا 2 اکتوبر 1983 کو انہوں نے پروجیکٹ کو گرامین بینک میں تبدیل کر دیا۔ گرامین بنگالی زبان میں دیہات کو کہتے ہیں چونکہ انہوں نے قرض دینے کا سلسلہ دیہات سے شروع کیا تھا اس کے بینک کا نام گرامین Grameen Bank رکھا۔ یہ ایک ایسا بینک تھا جہاں قرض لینے والوں کو بینک نہیں آنا پڑتا تھا بلکہ بینک کا عملہ خود ضرورت مندوں کے گھر جا کر قرض

## گرامین بینک کا عملہ خود دیہات میں جا کر قرض دیتا تھا

دیتا تھا اور واپسی کی قسط بھی وصول کرتا تھا۔ قرضہ لینے والوں کی اکثریت خواتین کی ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھ کر 98 فیصد ہو گئی اور گرامین بینک خواتین کے بینک کے طور پر جانا جانے لگا۔ گرامین بینک کی کامیابی کی کہانیاں پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ امریکہ کے شہر شکاگو میں واقع ایک کمیونٹی ڈویلپمنٹ بینک نے فورڈ فاؤنڈیشن کے تعاون سے گرامین بینک کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا اور گرامین بینک تیزی

وزیر اعظم محمد شہباز شریف اور بنگلہ دیش کے صدر ڈاکٹر محمد یونس نیویارک میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر

## مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟

سے ترقی کرنے لگا۔ 2005 میں گرامین بینک نے 4.7 ارب مریکی ڈالر کے برابر قرضے دیئے۔ اور قرضے دینے کا یہ حجم بتدریج بڑھتے بڑھتے 2008 میں 7.6 امریکی ڈالر ہو گیا۔

گرامین بینک کے کامیاب تجربے سے بے شُمار ملکوں نے فائدہ اٹھایا۔ جن میں نہ صرف ترقی پزیر بلکہ ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہیں۔

گرامین بینک کے تجربے سے پاکستان نے بھی فائدہ اٹھایا ڈاکٹر امجد ثاقب نے 1985 میں اخوت کے نام سے بلاسود قرضے دینے شروع کئے۔ بعد میں 2001 میں اخوت کا دائرہ کار بڑھا کر اخوت فاؤنڈیشن کے نام سے یہ کام جاری رکھا۔ اس وقت ماشاء اللہ اس کی ملک بھر میں 800 برانچیں 400 شہروں میں موجود ہیں جو 5 لاکھ تک قرض فراہم کر رہی ہیں جو 13 سے 60 ماہ کی اقساط میں واجب الادا ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش کے عوام خوش نصیب ہیں جنہیں ڈاکٹر یونس جیسا اعلیٰ تعلیم یافتہ سربراہ میسر آ گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد یونس نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ امریکہ کی ریاست ٹینیسی Tennessee کے شہر نیشول Nashville میں واقع ونڈر بلٹ Vanderbilt یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ ونڈر بلٹ یونیورسٹی کا امریکہ کی 439 یونیورسٹیوں میں 18 واں نمبر ہے۔

حسینہ واجد آج کل ہندوستان میں پناہ لئے ہوئے ہے۔ وہ وہاں بیٹھ کر ہندوستان کی مدد سے آئندہ ہونے والے انتخابات میں عوامی لیگ کی فتح کے لئے بھر پور کوشش کرے گی۔ ادھر انڈیا بھی بنگلہ دیش میں حسینہ

### پاکستان کو بنگلہ دیش سے دفاعی معاہدہ کرنا چاہیئے

واجد کے خلاف جنگ آزادی کو اتنی آسانی سے نہیں بھلا سکے گا اور اس کی بھی کوشش یہی ہوگی کہ عوامی لیگ اقتدار میں دوبارہ آجائے کیونکہ انڈیا کو بنگلہ دیش میں اپنا سرمایہ ڈوبتا ہوا نظر آرہا ہے۔ سیاسی تجزیہ کاروں کے مطابق عوامی لیگ کے انتخابات جیتنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ میری بنگلہ دیش میں دوستوں سے بات ہوتی رہتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش میں پاکستان کے حامیوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور امکان اس بات کا ہے کہ جماعت اسلامی دوسری مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر انتخابات میں کافی تعداد میں سیٹیں حاصل کرلے گی۔ اگر وہ حکومت بنانے میں کامیاب نہ بھی ہو سکی تو ایک مضبوط حزب اختلاف کا کردار ادا کرے گی۔ ان کا خیال ہے کہ عوامی لیگ کے اقتدار کا سورج اب ہمیشہ کے لئے ڈوب چکا ہے۔ بنگلہ دیشیوں کی پاکستان سے محبت کی جھلک چند واقعات سے نمایاں ہوتی ہے۔ 14 اگست کو بنگلہ دیش میں پاکستان کے پرچم گھروں پر لہرائے گئے۔ عوامی لیگ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بہار سے ہے جنہوں نے ابھی تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا اور اب بھی اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عبوری حکومت نے ایک تقریب میں جو 13 ستمبر کو ڈھاکہ میں قائداعظم محمد علی جناح کے 76 ویں یوم وصال پر منعقد کی گئی، پاکستان کے سفیر سید احمد معروف کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔

پچھلے ہفتے ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر شاہد الزمان نے آرمی آفیسرز سے ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان

### آئندہ انتخابات پر ہندوستان اثر انداز ہونے کی کوشش کرے گا

کے خلاف بنگلہ دیش کو تحفظ درکار ہے۔ اس لیے اسے پاکستان سے جو ایک جوہری طاقت ہے ایک دفاعی معاہدہ کرنا چاہیئے تا کہ ہندوستان کو معلوم ہو جائے کہ بنگلہ دیش تنہا نہیں ہے اور پاکستان کسی صورت بنگلہ دیش پر انڈیا کی طرف سے جارحیت کو برداشت نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر شاہد الزمان کی اس تجویز کی حمایت تقریب کے شرکاء نے بھر پور تالیوں سے کی۔

میرے خیال میں اس بات کا بہت خدشہ ہے کہ ہندوستان بنگلہ دیش

میں ہونے والے عام انتخابات میں اثر انداز ہونے کی پوری کوشش کرے گا۔ جس کی وجہ سے بنگلہ دیش سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے اور شاید سرحدی جھڑپوں کی نوبت آجائے۔ اس لئے حکومت پاکستان کو بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کے سربراہ ڈاکٹر یونس کو سفارتی سطح پر یہ یقین دہانی کرا دینی چاہیئے کہ پاکستان ہندوستان کے مقابلہ میں بنگلہ دیش کی دفاعی صلاحیت بڑھانے کے لئے بحری، بری اور فضائی تعاون کے لئے تیار ہے۔ پاکستان بنگلہ دیش کی بحری طاقت

### بنگلہ دیش سے تجارتی معاہدہ بھی پاکستان کے حق میں ہوگا

میں اضافے کے لئے نئے جنگی بحری جہازوں کی تیاری میں مدد کر سکتا ہے۔ اسی طرح فضائی افواج کو تربیت دے سکتا ہے اور لڑاکا جنگی جہازوں کی تیاری میں مدد کے علاوہ نئے جہاز بھی فراہم کر سکتا ہے۔

دوسرا بڑا شعبہ جس میں پاکستان بنگلہ دیش کی مدد کر سکتا ہے وہ تجارت ہے۔ 2022 میں انڈیا نے بنگلہ دیش کو 13.8 ارب ڈالر کی برآمدات کیں۔ یہ برآمدات پچھلے 5 سال میں 14 فیصد کی شرح سے بڑھی ہیں۔ جبکہ پاکستان نے بنگلہ دیش کو 2022 میں صرف 839 ملین ڈالر کی برآمدات کی ہیں۔ پچھلے 5 سالوں میں یہ برآمدات صرف 5.35 فیصد کے حساب سے بڑھی ہیں۔

بنگلا دیش کے عوام کے جذبات ہندوستان کے خلاف اور پاکستان کی حمایت میں ہونے کی وجہ سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کی بنگلہ دیش کو برآمدات میں کمی آئے گی اور پاکستان کی بنگلا دیش کو برآمدات میں اضافہ ہوگا حکومت پاکستان کو چاہئے کہ ایک اعلی تجارتی وفد بنگلہ دیش بھیجے جس میں وزارت تجارت کے متعلقہ افسران کے علاوہ وزارت دفاع کے اعلیٰ افسران بھی شامل ہوں تا کہ بنگلہ دیش سے تجارتی اور دفاعی معاہدوں پر گفت وشنید کی جائے۔

وقت کی ایک اور اہم ضرورت یہ ہے کہ بنگلہ دیش سے آزاد تجارت (Free Trade) کا معاہدہ کیا جائے۔ میں نے 2005 میں جب وزارت تجارت میں جوائنٹ سیکرٹری تھا۔ سیکرٹری تجارت کی ہدایت پر اپنے پروجیکٹ منیجر کے ساتھ بنگلہ دیش کا ایک ہفتہ کا دورہ کیا

۔ اس دورے کا مقصد اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ کیا بنگلہ دیش کے ساتھ آزاد تجارت کا معاہدہ ممکن ہے اور کیا ایسا کرنے سے دونوں ملکوں کے تجارتی حجم میں اضافہ ہوگا۔ اور پاکستان بنگلہ دیش کا تجارتی توازن پاکستان کے حق میں ہوگا؟۔ اس دورے میں ہم نے بنگلہ دیش کے وزارت تجارت کے اعلیٰ حکام اور نجی شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد سے میٹنگز کرنے کے بعد جولائی 2005 میں وزارت تجارت کو ایک رپورٹ پیش کی کہ بنگلہ دیش سے آزاد تجارتی معاہدہ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں کے مفاد میں ہے اور ایسا کرنے سے پاکستان کی بنگلہ دیش کو برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔ کیونکہ بنگلہ دیش یہ اشیا اس وقت انڈیا سے درآمد کر رہا ہے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں معاہدے کے بارے میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی کیونکہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان سیاسی کشیدگی میں کمی نہ آسکی۔

اس وقت بنگلا دیش سے تجارتی معاہدہ کرنے کے لیے حالات بہت سازگار ہیں۔ ان سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔ (جاری ہے)

## درخت میرے بیٹے ہیں

”ہما بیگ ’اطراف‘ کی خیر خواہ اور سرپرست ہیں۔ سینئر افسانہ نگار۔ شاعرہ۔ ادبی محفلوں میں سرگرم۔ ہماری درخواست پر انہوں نے درختوں کے بارے میں بہت ہی دل نواز تحریر ارسال کی ہے۔ وہ فلاحی کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔ مگر سب سے زیادہ عشق انہیں پودوں سے ہے۔ عام طور پر وہ کسی کی سالگرہ پر پودے کا تحفہ دیتی ہیں۔ اس سال گرمی جتنی شدت سے پڑی۔ حبس نے جس طرح ہمارے حواس گم کیے۔ ان میں درختوں کی ضرورت اور بڑھ گئی۔ بہت ہی محبت سے لکھی گئی یہ تحریر پڑھیں اور اپنی رائے سے نوازیں۔“

# میں اور میرے پودے اکثر باتیں کرتے ہیں

تحریر: ہما بیگ

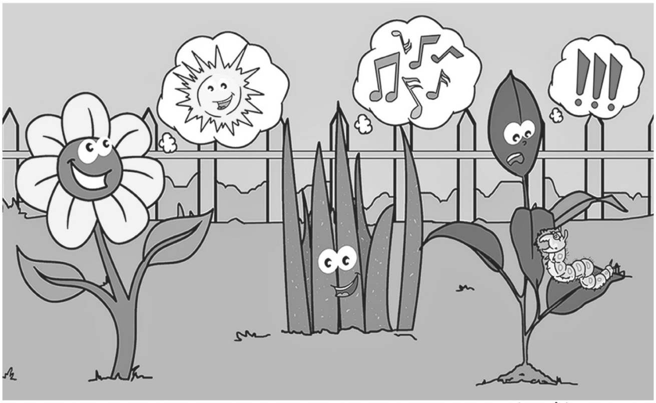

میں اور میرے پودے اکثر یہ باتیں کرتے ہیں!
”اماں یہ جو تم اتنے سالوں سے محنت کر کے بیج لگا کر ہم کو بڑا کرتی ہو، پھر لوگوں کو دے دیتی ہو اس کی کیا وجہ ہے۔“
گل مہر کے سوال نے مجھے سوچ میں ڈال دیا، میں نے پیار سے اس کے پتوں کو صاف کرتے ہوئے کہا ”میرے پیارے بیٹے میں چاہتی ہوں میرا وطن سرسبز و شاداب رہے، ناسمجھی میں ہم نے اپنے جنگل کے جنگل کاٹ دیے پہاڑ گرا دیے اسی وجہ سے زلزلے، طوفان اور گرمی بڑھ گئی ہے۔ اگر ہم سب مل کر کوشش کریں تو ماحولیاتی تبدیلی کو قابو میں کر سکتے ہیں انشاءاللہ“
چمپا نے کسمسا کر کہا۔
”مگر اماں دیکھو یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرتے ہیں! ہر سال آزادی کے موقع پر اور دوسرے دنوں میں دھوم دھام سے درخت لگاؤ مہم مناتے ہیں جوش خروش سے ہم کو زمین میں لگا کر تصویریں بنواتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں کوئی ہم کو پھر پانی بھی نہیں دیتا، ہم تو چھوٹے بچوں کی طرح ہیں۔“
بات گو سچ ہے مگر میں اپنی بات سے ہٹنے والی کہاں!
”ہم لوگوں کے دلوں میں آپ سب کے لیے محبت پیدا کر رہے ہیں، ان کو آپ کی موجودگی کا اور ضرورت کا احساس دلا رہے ہیں۔ آپ

**گل مہر نے۔ چمپا نے۔ نیم نے۔ چنبیلی نے۔ بوگن ویلیا نے۔ پیپل نے مجھے کہا......**

کے بغیر تو ہم سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اب لوگ درخت ہی دیکھنے کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرتے ہیں“
نیم کے دو سال کے پودے نے حسرت سے مجھے دیکھا اور سانس بھری۔ ”ہمارے پتوں پر مٹی جمع ہوتی رہتی ہے کوئی صاف بھی نہیں کرتا۔ لوگ گھر تو بڑا کر لیتے ہیں ہمارے لیے ان کے دلوں میں اور گھر میں کوئی جگہ نہیں، فوٹو سینتھیسز کا عمل نہیں ہوگا تو ہم تو مرجھا جائیں گے۔“
یہ سب مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں میں نے پُرنم مگر پُرامید نظروں سے چنبیلی کی طرف دیکھا۔
”کیوں پریشان ہوتے ہو تم......؟“
اب ہم سب مل کر درخت لگائیں گے اور ہر انسان ایک درخت کی ذمہ داری اٹھائے گا۔ اس کو پانی دینا، کھاد اور مٹی کا وقتاً فوقتاً بدلتے رہنا۔
یہ درست ہے درخت لگانا سب سے آسان کام ہے مگر اس کو سنبھالنا ذرا مشکل، اگر ہم چاہیں تو کیا نہیں کر سکتے، پانی کا مسئلہ ہے وہ بھی سمجھداری سے حل کیا جا سکتا ہے دل میں شوق اور ضرورت کا احساس ہو تو۔“
بوگن ویلیا میرا لاڈلا پودا جو سارے سال پھولوں سے لدا رہتا ہے صرف ایک ٹہنی توڑ کر لگانے سے جلد ہی جڑ پکڑ لیتا ہے اور دیکھ بھال اور زیادہ پانی بھی نہیں مانگتا اس نے بھی لب کشائی کی۔
”اماں میں تو تھرپارکر جیسی جگہ پر بھی آسانی سے رہ جاتا ہوں پھر بھی لوگ میرا خیال نہیں کرتے“
”میرے بچے ہم کو اس وقت Mangroves کی اشد ضرورت ہے ہم اس کے بھی درخت کاٹتے جا رہے ہیں۔ گھبراؤ مت جتنی گرمی

**کونو کارپس۔ کروڑوں کی تعداد میں ہمارا پانی پی رہے ہیں**

بڑھتی جا رہی ہے اب سب درخت لگائیں گے اور اپنے بچوں کی طرح خیال کریں گے۔ جیسے دنیا کے دوسرے ممالک میں کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے ہماری زمین تو بہترین زرخیز تری ہے صرف محنت اور معلومات کی ضرورت ہے کہ کون سا درخت کس جگہ اور کب لگانا ہے۔ تم سب بالکل پریشان مت ہو مجھ سے اچھے چاہنے والے ملین

گے اللہ سے امید اچھی رکھو۔''
پیپل کا گملے میں لگا پودا پُرعزم لہجے میں بولا۔
''جی اماں آپ بالکل پریشان مت ہوں آپ اپنا سفر جاری رکھیں ہم اپنا۔''

## توبہ کریں تو پودا لگائیں۔ پیاروں کی برسی پر لگائیں

22 کروڑ آبادی کے اس ملک پاکستان کے مضافات سڑکوں اور آبادی میں درخت نا ہونے کی برابر ہیں اور جو سالہا سال سے کونو کارپس نام کا درخت کروڑوں کی تعداد میں لایا جارہا ہے وہ ایک ٹی بی کی طرح ہماری زمینوں کا پانی تیزی سے پی رہا ہے اس کو باڑ لگانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ درخت آکسیجن خود پی جاتا ہے اور اس کی جڑیں گھروں کے اندر پہنچ کر بنیادیں کمزور کر دیتا ہے اور اس کے پھول سانس کے امراض پیدا کرتا ہے۔

نیم لگائیں، گل مہر لگائیں، املی کے آم کے چیکو کے بادام کے درخت لگائیں سمبل کے درخت لگائیں انجیر اور بے شمار درخت ہیں کچنار بھی ہے۔ اللہ پاک نے پاک سرزمین کو ہماری اوقات سے بڑھ کر نوازا ہے۔

صرف 14 اگست کو نہیں بلکہ بچوں ی پیدائش پر لگائیں، توبہ کریں تو پودا لگائیں، مرحومین کی برسی پر لگائیں دل میں کسی کے لیے محبت کی کونپل پھوٹے تو درخت لگائیں، ترقی ملے تو شکرانے کے طور پر لگائیں اور پھر ان کی نگہداشت بھی ایسے کریں جیسے چھوٹے بچوں کی طرح کرتے ہیں۔۔ انہی کی وجہ سے ہم کو آکسیجن ملتی ہے، چھاؤں ملتی ہے۔ ایک درخت ہم کو بے حساب فوائد فراہم کرتا ہے پھر کیوں نہ ہم درخت لگائیں مگر پہلے ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور پھر ان کا خیال رکھیں۔ ہم مشینی زندگی کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ حقیقت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ آیئے ایک بار پھر اس مصنوعی دنیا سے نکل کر سادہ زندگی اپنا لیں۔

پاکستان میں گھروں میں لگانے کے لیے کس قسم کے درخت موزوں ہیں جو نہ صرف سایہ فراہم کرتے ہیں بلکہ ماحول کے لیے بھی فائدہ مند ہیں کچھ بہترین درختوں کی فہرست یہ ہے۔

1 نیم کا درخت۔ نیم کا درخت اپنے طبی فوائد اور کیڑے مار خاصیت کی وجہ سے مشہور ہے۔

2۔ آم کا درخت۔ یہ نہ صرف سایہ فراہم کرتا ہے بلکہ اس کا پھل بھی لذیذ ہوتا ہے۔

3 پیپل کا درخت۔ سائے اور ٹھنڈک کے لیے مشہور ہے۔

4۔ جامن کا درخت۔ سائے اور پھل کے لیے بہترین ہے۔

## گھروں میں لگانے کے لیے موزوں درختوں کے نام

5۔ گل مہر کا درخت۔ خوبصورت پھولوں سے لدا درخت جو خوبصورتی کے ساتھ ٹھنڈے چھاؤں فراہم کرتا ہے۔

6۔ چنار کا درخت۔ ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرنے کے ساتھ اس کے پتے خزاں میں خوبصورت رنگ بدلتے ہیں۔

7۔ لیموں کا درخت۔ اس کی کئی اقسام ہیں جن کے مختلف نام ہیں گھروں میں لگانے کے لیے مفید ہے۔

**فائدے**

نیم کا درخت

نیم کے پتیوں، چھال اور تیل میں اینٹی بیکٹیریل' اینٹی فنگل اور اینٹی انفلامٹری خصوصیات ہوتی ہیں۔

سب سے جلدی پھل دینے والا درخت۔

پپیتا۔ اس کا درخت عام طور پر ایک سال کے اندر پھل دینا شروع کر دیتا ہے یہ تیزی سے بڑھتا ہے اور ب آسانی اگایا جاسکتا ہے۔

کیلا۔ یہ بھی تیزی سے بڑھتا ہے اور عام طور پر 12 سے 18 مہینے میں پھل دینا شروع کر دیتا ہے۔

## نیم۔ آم۔ پیپل۔ گل مہر۔ چنار۔ لیموں۔ ماحول دوست

امردو۔ امرود کا درخت دو سے تین سال میں زیادہ دیکھ بھال کے بغیر بھی پھل دیتا ہے۔

لیمو۔ اس کا پودا یا درخت عام طور پر دو سال میں پھل دینا شروع کر دیتا ہے یہ بھی ب آسانی سے کم دیکھ بھال کے رکھا جاسکتا ہے۔

جامن۔ جامن کا درخت بھی دو سے تین سال میں پھل دینے لگتا ہے اس کے پھل مزیدار اور غذائیت سے بھرپور ہوتے ہیں اور شوگر کے مریضوں کے لیے بہترین ہیں۔

آم۔ آم کے درخت کو تین سے چار سال پھل دینے میں لگتے ہیں اگر اچھی دیکھ بھال کی جائے۔

جنگل جلیبی۔ جنگل جیلیبی ایک سال کے اندر پھل دیتی ہے۔

فالسے۔ فالسے کے بیج ایک سیزن میں لگائیں اور اگلے سال گھر بیٹھے کھائیں۔

گوندنی۔ یہ بھی ایک سال میں پھل دیتا ہے۔

کنکرونده۔ خوبصورت اور فائدہ مند پھل۔

---

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایہ ہو
**(ظفر زیدی)**

وہی چراغ جس کی لو قیامت تھی
اسی پہ ضرب پڑی جو شجر پرانا تھا
**(افتخار عارف)**

شجر سمجھ کے مرا احترام کرتے ہیں
پرندے رات کو مجھ میں قیام کرتے ہیں
**(عباس تابش)**

پھل دار تھا گاؤں اسے پوجتا رہا
سوکھا تو قتل ہوگیا وہ بے زباں درخت
**(پروین کمار اشک)**

وہ لمحہ جب مرے بچے نے ماں پکارا مجھے
میں ایک شاخ سے کتنا گھنا درخت ہوئی
**(حمیرا رحمٰن)**

مرے حالات کو بس یوں سمجھ لو
پرندے پر شجر رکھا ہوا ہے
**(شجاع خاور)**

ہر دم دعائے آب و ہوا مانگتے رہے
ننگے درخت سبز قبا مانگتے رہے
**(انور مینائی)**

اس راستے میں جب کوئی سایہ نہ پائے گا
یہ آخری درخت بہت یاد آئے گا
**(اظہر عنایتی)**

درخت کرتے نہیں اس لیے امید وفا
وہ جانتے ہیں پرندوں کے پر نکلتے ہیں
**(کلدیپ کمار)**

خدا کرے کہ یہ پودا زمیں کا ہوجائے
کہ آرزو مرے آنگن کو ایک پھول کی ہے
**(شکیل اعظمی)**

میرے آنگن میں ایک پودا ہے
پھول بن کے مہک اٹھے گا تو
**(عادل منصوری)**

شدید دھوپ میں سارے درخت سوکھ گئے
بس اک دعا کا شجر تھا جو بے ثمر نہ ہوا
**(علینا عترت)**

برسات تھم چکی ہے مگر ہر شجر کے پاس
اتنا تو ہے کہ آپ کا دامن بھگو سکے
**(احسن یوسف زئی)**

کل رات جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بہت پیار تھا اس بوڑھے شجر سے
**(پروین شاکر)**

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
**(حیدر علی آتش)**

میں اک شجر کی طرح رہگزر میں ٹھہرا ہوں
تھکن اتار کے تو کس طرف روانہ ہوا
**(نصیر ترابی)**

دشتِ بے آب سے پوچھو کہ وہاں کے اشجار
کن مراحل سے گزرتے ہیں نمو پانے تک
**(مقبول عامر)**

سمجھو وہاں پھل دار شجر کوئی نہیں ہے
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گرتا
**(قتیل شفائی)**

اپنے بس میں رہے گی کیا آندھی
اپنے بل پر شجر رہے گا کیا
**(رسا چغتائی)**

تُلا ہے دھوپ برسانے پہ سورج
شجر بھی چھتریاں لے کر کھڑے ہیں
**(راحت اندوری)**

چند تنکے نہ تھے نشیمن کے
باغ و شاخ و شجر کا قصہ ہے
**(صبا اکبر آبادی)**

آتی جاتی ہوئی فصلوں کا محافظ ہوں میں
پھل تو سب اس کی امانت ہیں شجر میرا ہے
**(معراج فیض آبادی)**

گھرا بادل خموشی سے خزاں آثار باغوں پر
ہلے ٹھنڈی ہواؤں میں شجر آہستہ آہستہ
**(منیر نیازی)**

## ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

”پروفیسر شاداب احمد صدیقی حیدر آباد میں 'اطراف' کے بیورو چیف ہیں۔ ادبی حلقوں کی معروف شخصیت۔ ریڈیو پاکستان سے اہم شخصیتوں پر پروگرام نشر کرتے ہیں۔ 'اطراف' کی درخواست پر اُردو کی بہت ہی محترم شخصیت پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی خدمات کے بارے میں انتہائی تفصیلی تحریر سے نوازا ہے۔ تنگیٔ داماں کے باعث اس مقالے کو کچھ مختصر کرنا پڑا۔ اس کے لیے ہم پروفیسر شاداب احمد صدیقی سے بھی، آپ سے بھی معذرت خواہ ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

# صرف ایک شخصیت نہیں۔ آسمان علم کے تابندہ ستارے

تحریر: پروفیسر شاداب احمد صدیقی
بیورو چیف حیدرآباد

سندھ دھرتی اولیا اور صوفیائے کرام کی سرزمین ہے، جہاں بلا رنگ ونسل، مذہب، پیار محبت اور امن کا درس ملتا ہے۔ سندھ خاص طور پر حیدرآباد شہر کو ہر دَور میں علمی، ادبی اور مذہبی حوالے سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہر زمانے میں اس خطہ ارضی میں ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی علمی وادبی، سیاسی اور تحقیقی کاوشوں سے لازوال خدمات انجام دیں۔

آپ کی دینی تعلیم کا آغاز گھر ہی سے ہوا، بڑے بھائی نذیر احمد خان نے پہلے پارے کے چند رکوع بہت سمجھا کر پڑھا دیے تھے پھر مکمل قرآن پاک ڈاکٹر صاحب نے خود ہی پڑھا۔ 1923 میں پرائمری پاس کرنے کے بعد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کو انجمن اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ آپ نے 1928 میں نویں جماعت کا امتحان پاس کیا اور دسویں جماعت کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ اس وقت ہندوستان میں علم و ادب کا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا۔ علی گڑھ میں قیام ڈاکٹر صاحب کی تعلیم و تربیت کا اہم ترین اور زریں دَور ہے۔ 1929 میں میٹرک پاس کیا۔ اپریل 1931 میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ 1931 ہی میں یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اپریل 1935 میں ایم اے فارسی فائنل کا امتحان پاس کیا۔ اور آپ کی ایم اے فارسی میں تھرڈ ڈویژن آئی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے ناگ پور یونیورسٹی سے 1937 میں فارسی ہی میں دوبارہ ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں علی گڑھ مرکزی اہمیت کا حامل رہا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر صاحب نے تقریباً 8 برس تعلیم حاصل کی۔ جس وقت آپ یہاں آئے تھے، آپ کی عمر 16 سال تھی اور واپسی پر 24 سال کے تھے۔ یعنی نوجوانی کا یہ اہم دَور آپ نے وہاں گزارا۔ لہٰذا علی گڑھ آپ کے لیے دوسرا وطن تھا۔ اس اہم دَور میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی تربیت کے ساتھ ان کی ذہنی تدریجی ترقی کا علم بھی ہوتا ہے۔

**شاگردوں میں جمیل جالبی۔ اسلم فرخی۔ فرمان فتحپوری۔ ابوالخیر کشفی۔ انوار احمد زئی۔ وفا راشدی جیسے نامور**

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے اساتذہ اور محسنین اپنے عہد کے جید علماء اور مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان شخصیات کا فیضانِ نظر اور ان کی مکتب کی کرامت نہایت روشن ہے۔ ان اساتذہ میں سید سلیمان ندوی، ضیاء احمد بدایونی، رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی، مولانا ابوبکر شیث جون پوری، قاری ضیاء الدین الہ آبادی، مولانا سلیمان اشرف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان اساتذہ کے علاوہ چند محسنین بھی قابلِ ذکر ہیں جن سے آپ نے بڑا فیض پایا ہے۔ یہ شخصیات بھی کسی تعریف کی محتاج نہیں، ان میں بہادر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن شیروانی، ڈاکٹر

عبدالستار صدیقی، علامہ پرنسپل محمد شفیع بہت اہم ہیں۔

پبلک سروس کمیشن کی طرف سے اُردو کے استاد کے لیے آپ کو انٹرویو لیٹر موصول ہوا، یہ انٹرویو 5 جولائی 1937 کو ناگپور میں ہوا اور انٹرویو میں آپ کو منتخب کرلیا گیا۔ اور 15 جولائی 1937 کو آپ نے اپنے فرائض منصبی سنبھال لیے۔ آپ لیکچرار اُردو ہونے کے ساتھ شعبۂ اُردو کے صدر بھی تھے۔ جب سی پی میں اُردو کا کوئی استاد نہیں تھا، اس وجہ سے باقاعدہ شعبۂ اُردو بھی نہیں تھا، ڈاکٹر صاحب نے سی پی میں شعبۂ اُردو کی بنیاد رکھی اور پہلی مرتبہ ایم اے اُردو کے لیے باقاعدہ نصاب مرتب کیا۔

1946 میں تین سال کے لیے آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1947 میں آپ کا تبادلہ مارکس کالج میں ہوگیا، مگر یہاں زیادہ وقت نہیں گزارا کہ 14 اگست 1947 کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ ستمبر میں ڈاکٹر صاحب کے دونوں بڑے بھائی حاجی نذیر احمد خان اور حاجی عبدالرحمن خان، والدہ صاحبہ محفوظ النساء بیگم کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے بچے سراج احمد خان اور بیٹی ہاجرہ کو لے کر پاکستان آ گئے، فسادات کا دَور تھا، ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا، اُدھر مارکس کالج سے پروفیسر ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کو خط لکھا کہ آپ واپس آ جائیں اور مارچ تک کام کر کے اپریل سے تعطیل ہونے پر چلے جائیں، چنانچہ آپ دسمبر میں ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچے، وہاں سے ریل میں ناگ پور پہنچے، ناگ پور میں کل 20-25 دن کام کیا، لیکن پھر بڑے بھائی صاحب نذیر احمد خان نے کراچی سے تار کیا کہ سراج احمد خان ڈاکٹر صاحب کے بیٹے کو موتی جھرا نکل آیا ہے، لہٰذا آپ نے مستقل طور پر پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا اور گیارہ سالہ Gazetted Post ترک کر کے 22 جنوری 1948 کو ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے۔ پہلے آپ بغدادی محلہ چاکی واڑا کراچی میں رہے پھر پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان خرید لیا۔ آپ کی پہلی شادی آپ کے ماموں عبدالمجید خان کی صاحب زادی کنیز آمنہ بی سے 14 اکتوبر 1936 کو بھان گلیا جبل پور میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کی پہلی اہلیہ کا انتقال 1947 میں ہوا۔ پہلی اہلیہ کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد قمر بیگم صاحبہ سے 30 اگست 1949 کو آپ کا عقدِ ثانی ہوا۔

جنوری 1948 میں ڈاکٹر صاحب اپنی سروس ناگ پور سے استعفیٰ دے کر مستقل طور پر کراچی آ گئے۔ یہاں چند ماہ بعد ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مرحوم اور عبدالمجید قریشی کی کوششوں سے اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس کالج کے سرپرست تھے۔

آپ شعبۂ اُردو کے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں بھی آپ نے نصاب مرتب کیا۔

قیام پاکستان بعد ڈاکٹر صاحب کا پہلا مضمون اگست 1948 میں اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا جو ان کے مقالے ''حسن غزنوی'' کی پہلی قسط تھی پھر یہ سلسلہ جاری رہا، لیکن ان اقساط کے علاوہ پاکستان میں پہلا مضمون اسلامیہ کالج کے پہلے میگزین 1949 میں ''چند علمی نکات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے 1950 میں اُردو کالج فعال کیا، اکرام الرحمن مرحوم نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا تذکرہ کیا اور درخواست بھی پیش کردی اور ڈاکٹر صاحب کو مولوی عبدالحق کے کہنے پر شعبۂ اُردو کے صدر کی جگہ پر لیا گیا۔ آپ اُردو کراچی کالج میں تقریباً 6 برس سروس مکمل کر کے 1956 میں مستقل طور پر کراچی سے حیدرآباد آ گئے۔ سندھ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی کے اصرار پر 14 جولائی 1956 کو سندھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے چارج لیا۔ 1972 میں ڈاکٹر صاحب کی عمر 60 سال ہوگئی، چنانچہ آپ ریٹائر ہوگئے، لیکن یونیورسٹی نے ملازمت میں ایک سال کی توسیع کردی یہ توسیع چار مرتبہ ایک ایک سال کے لیے ہوتی رہی یوں 20 سال آپ نے سندھ یونیورسٹی میں گزارے، اور 1985 میں جامعہ سندھ نے آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو

## اُردو دنیا میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سب سے زیادہ مقالات کے نگراں

پروفیسر ایمریطس کے درجے پر فائز کیا۔

آپ نے مفید مشوروں پر مشتمل ایک مضمون 1961 میں فنِ تحقیق لکھا۔ اس سے پہلے اس موضوع پر پاکستان میں کوئی مضمون نہیں ملتا۔ ڈاکٹر صاحب کا نظریہ تنقید یہ ہے کہ تنقید کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ کسی۔۔۔۔۔ یا تحقیق کار کی محض ستائش اور مداحی تنقید نہیں ہے اور صرف عیب جوئی اور تلاش معائب کو تنقید کہا جاسکتا ہے کلمہ حق گوئی، اعتدال، توازن اور تخلیق یا تخلیق کار کا صحیح مقام ظاہر کرنا، اس سے متعلق اپنی ذاتی پسند کو کم دخل دینا اور صحیح درجہ مقرر کرنا، اصل تنقید ہے اور ایسا عمل آسان نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب ماہر لسانیات بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان پر ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے نگاہ ڈالی اور دیگر کامل زبانوں پر اُردو کے اثرات تلاش کیے، جس سے اُردو کی اہمیت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر صاحب کا نمایاں اور قابل ذکر کام ''فارسی پر اُردو کا اثر'' ہے، جس میں ایسے بہت سے الفاظ دیے گئے ہیں جو اُردو کی وساطت سے فارسی میں داخل ہوگئے۔ اگرچہ ان کی شکل

## 'سندھی اُردو لغت' ان کا عظیم کارنامہ

تبدیل ہوگئی لیکن ان کی اصل پہچان اُردو ہی ہے کیونکہ زبان ماحول اور حالات سے اثر قبول کرتے ہوئے شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں ایک اہم کارنامہ ان کا تحقیقی مضمون ''اُردو املا کی تاریخ'' ہے۔ اس میں قدیم اُردو کے نمونے پیش کیے گئے ہیں اور حرف پر تنقید علاقائی حروف کی اشکال کی مدد سے کی گئی ہے۔ آپ نے خاص طور پر مقامی زبانوں کے اُردو کے ساتھ روابط پر تحقیق کی۔ اسی پس منظر میں ''اُردو سندھی لسانی روابط'' کے موضوع پر اپنے ایک شاگرد سے پی ایچ ڈی بھی کرائی۔ لسانیات آپ کی دلچسپی کا خاص میدان تھا، ڈاکٹر صاحب نے خان آرزو اور انشاءاللہ خان انشا کی تصریحات کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ ''اُردو املا کی تاریخ'' میں غالب اور احسن کے علاوہ ان جملہ تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اس موضوع کے سلسلے میں ہوتی رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی نعت نویسی ان کی شبانہ روز محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اولین باقاعدہ اور باضابطہ کام ''سندھی اُردو لغت'' ہے۔ وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کی طرف سے سندھ یونیورسٹی کو اس کام کی مدد میں فنڈز کی پیش کش کی گئی اور یہ طے پایا کہ اُردو اور سندھی بولنے والوں کی آسانی کے لیے دو لغات ''سندھی اُردو لغت'' اور ''اُردو سندھی لغت'' مرتب کرائی جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب کو ان لغات کے اُردو حصہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اُردو صرف و نحو پر کتاب لکھی، جس کا عنوان ''اُردو صرف و نحو'' ہے۔ اس میں اُردو نحو کے قواعد اور اصولوں کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اُردو نصاب کی تدوین کے سلسلے میں خدمات کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے نصاب کو مرتب کیا بلکہ بچوں کا نصاب بھی ترتیب دیا۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کا نصاب بھی مرتب کرنے والوں میں آپ شامل رہے۔ آپ کا ایک مضمون ''نظریہ پاکستان'' کے عنوان سے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل ہے، جو پاکستان کی اساس پر ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کا نصاب مرتب کرنے والوں میں بھی آپ شامل رہے۔ آپ کا ایک مضمون ''نظریہ پاکستان'' انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل ہے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے بھی اس مضمون کی جامعیت، اختصار اور افادیت کے پیشِ نظر اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔

آپ نے اُردو نصاب سے فرقہ ورانہ تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور نصاب میں پاکستانیت اور اخلاقیات کو پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی اس وسیع اور متنوع، علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کا اعتراف اب تک ملکی سطح پر متعدد بار ہوچکا ہے اور آپ کو ملک کے سب سے بڑے سول اعزاز کے علاوہ بہت سے اعزازات و انعامات، حکومت اور دیگر اداروں کی طرف سے پیش کیے گئے۔ ان انعامات و اعزازات کی طویل فہرست ہے۔ کچھ کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔ 1983 میں اقبال ایوارڈ۔ (بمع پچیس ہزار روپے)

2۔ 1988 میں جامعہ سندھ کی طرف سے ماہر تعلیم کا طلائی تمغہ۔

3۔ 1988 میں انجمن ترقی اُردو کراچی کی جانب سے نشان سپاس۔

4۔ 1990 میں جامعہ سندھ کی طرف سے 50، سالہ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں طلائی تمغہ۔

5۔ 1992 میں ستارۂ امتیاز (حکومت پاکستان) کی طرف سے

6۔ 1992 میں پاکستان نیشنل اکیڈمی کی طرف سے پاکستان

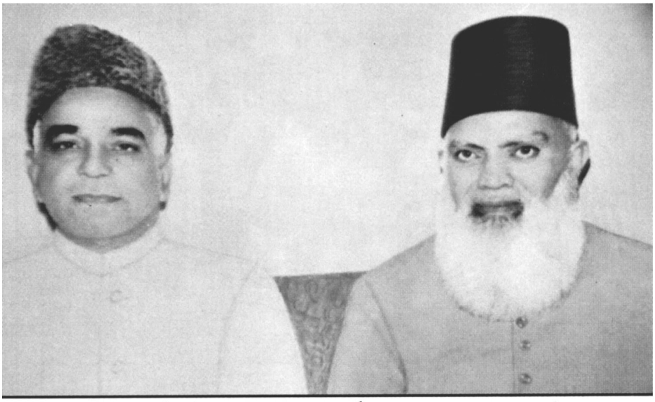

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب اور ان کے علیگڑھ کے کلاس فیلو پروفیسر چوہدری عبدالحمید جالندھری

میں سب سے زیادہ پی ایچ ڈی مقالات کی نگرانی کرنے کے اعتراف میں نشانِ سپاس۔

7۔1997 میں ''قائداعظم ایوارڈ'' پاکستان گولڈن جوبلی قائد اعظم ایوارڈ۔

8۔7 ستمبر کو بلدیہ اعلیٰ حیدرآباد کی جانب سے تاج پوشی اور نشانِ بلدیہ پیش کیا گیا۔

**لسانیات ان کی دلچسپی کا خاص میدان**

9۔علامہ سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''نقوشِ سلیمانی'' (دوسرا ایڈیشن) میں چار مقالات پر ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دیا ہے۔

10۔پنجاب یونیورسٹی سے انسائیکلوپیڈیا ''دائرہ معارف اسلامیہ'' (اُردو) میں ڈاکٹر صاحب کے چودہ تحقیقی مقالات شامل ہیں۔

11۔ایران سے شائع ہونے والے انسائیکلو پیڈیا میں ڈاکٹر صاحب کی چار مقالات شامل ہیں۔

12۔آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اُردو دنیا میں آپ نے سب سے زیادہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی کی۔

13۔اُردو ادب میں قرآن پاک سے متعلق سب سے زیادہ تحقیقی کام آپ ہی کی نگرانی میں مکمل ہوا۔

14۔پاکستان کے علاوہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالات کے ممتحن بھی رہے۔

15۔آپ کی مقالات معارف (اعظم گڑھ) اُردو (دہلی) اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) کے ساتھ سندھ یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور اور ناگ پور یونیورسٹی کے سالانہ ریسرچ جرنل میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔

16۔سندھ یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل ''تحقیق'' نے (شمارہ نمبر 4) 1990 میں آپ کی نصف صدی سے بھی زائد عرصے کو محیط علمی خدمات جلیلہ پر گوشۂ تہنیت شائع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں 100 سے زائد کتب تصنیف و تالیف کیں۔ جن میں علمی نقوش (1957)، حالی کا ذہنی ارتقا (1956)، ادبی جائزے (1959)، تحقیقی جائزے (1968)، جامع القواعد (حصہ نحو۔ 1973)، سرگزشتِ کابل (1980)، حسن غزنوی (حیات اور ادبی کارنامے 1947)، تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی) لاہور (1955)، چند فارسی شعراء (1989)، فارسی پر اُردو کا اثر (1952)، تاریخ اسلاف (1956)، سندھی اُردو لغت (1959)، اُردو سندھی لغت (1960)، تحریر و تقریر (1962)، قرآنی عربی (1966)، مجدد الف ثانی تحقیقی

جائزہ (1965)، برصغیر میں فارسی ادب (انگریزی۔ 1972)، جامع القواعد (حصہ نحو۔1972)، ندائے سحر (ریڈیائی تقریریں۔ 1976)، اقبال اور قرآن (علامہ اقبال پر 1940 سے 1981 تک بہترین کتاب قرار دی گئی۔ صدارتی تمغہ)، 1977 میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سے شائع ہوئی، معارفِ اقبال (اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی سے 1978 میں اور پھر 1990 میں طبع ہوئی، اُردو میں قرآن و حدیث کے محاورات (1980)، مطالب القرآن (پورے قرآن کا خلاصہ )1982، ہمہ قرآن در شان محمد ﷺ حیدرآباد سے 1983، مقدماتِ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان حیدرآباد سے 1983، منتخبات حیدرآباد۔ 1985، ہمارا علم و ادب حیدرآباد (1985)، ہمارا تلفظ (بعض اُردو الفاظ کا صحیح املا اور صحیح تلفظ کی مختصر فرہنگ (1990) اور اس کے علاوہ دیگر آپ کی کتابیں شامل ہیں جو علمی و ادبی سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بے شمار شاگرد ہیں۔ آپ کے کچھ نامور شاگردوں کے نام یہ ہیں ان میں سے ہر ایک دنیائے علم و ادب میں اپنی شناخت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ابن انشا، ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر سید معین الرحمن، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ڈاکٹر احمد رفاعی، ڈاکٹر الیاس عشقی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں

**اصل تنقید نے تخلیق کار کا صحیح مقام متعین کیا**

پوری، پروفیسر انوار احمد زئی، قمر علی عباسی، ڈاکٹر نظر کامرانی، ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر وفا راشدی، ڈاکٹر حسن محمد خان اور دیگر شامل ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ 25 ستمبر 2005 اتوار کو دنیائے فانی کے کئی تشنگان علم و ادب کو سیراب کر کے خود امر ہو گئے اور وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر کے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس روز ایک عہد ختم ہو گیا، ایک عظیم باب علم و ادب اور ایک محترم بابِ مدرسہ شریعت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کی آنکھوں کے ساتھ بند ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر 93 برس 2 دن کی تھی۔ آپ کے جنازے میں بلا مبالغہ آٹھ نو ہزار افراد شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب احاطہ مسجد غفور یہ نزد ٹول پلازہ سپر ہائی وے بائی پاس حیدرآباد میں آسودہ خاک ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صرف ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ آسمان علم کے درخشندہ و تابندہ ستارے، علم و ادب کے کوہ گراں، عظیم مربی اور علم و حکمت کا ایک جاوداں باب تھے۔

## دسمبر میں کراچی کتاب میلے کے تاریخی موقع پر

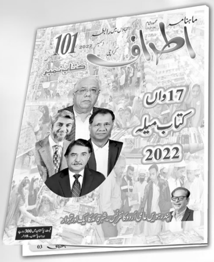

# ماہنامہ اطراف کراچی

اپنی روایات کے مطابق

شایانِ شان

# "کتاب نمبر"

شائع کرے گا

## آپ سے درخواست ہے

- ☆ اپنی تازہ ترین پسندیدہ کتاب پر ایک صفحے کی تحریر 15 اکتوبر تک ارسال کریں
- ☆ اگر ممکن ہو تو اپنے شہر کی پسندیدہ کتاب کی دکان۔ دکاندار۔ کے بارے میں لکھ کر بھیجیں۔ دکاندار کے والدین کیا یہی کاروبار کرتے تھے۔؟

## 20 اکتوبر تک

مزید تفصیلات کے لیے

Ph:0300-8210636

Email: Mahmoodshaam@gmail.com

اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔

## بنگلہ دیش فسطائیت سے حقیقی آزادی کی طرف

> بنگلہ دیش میں حالیہ انقلابی تبدیلیاں دنیا میں خاص طور پر پاکستان میں مثال بنی ہوئی ہیں۔ یہ پاکستان سے بچھڑا ہوا اکثریتی علاقہ ہے۔ پاکستان میں بھی حالات بنگلہ دیش جیسے ہی ہیں۔ نوجوان یہاں محروم بھی ہیں۔ برہم بھی۔ انتخابات میں یہاں بھی دھاندلیاں کی گئیں۔ عوام کی اکثریت کا مینڈیٹ کچل دیا گیا۔ اس تناظر میں بنگلہ دیش کے حالیہ حالات سے آگاہی بہت ضروری ہے۔ فرح فیصل خان کی یہ تحریر اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

# وقت آیا فوج نے عوام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے

تحریر: فرح فیصل خان

عالمی سیاسی منظرنامے میں آج کل بنگلہ دیش میں رونما ہونے والے سیاسی نظریاتی اور تاریخی انقلاب کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ بنگلہ دیشی طلبہ کی یہ اہم احتجاجی تحریک اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ کسی منظم سیاسی جماعت یا قیادت کے بغیر کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔

طلبہ شیخ حسینہ کے جبری ہتھکنڈوں کے خلاف صف آراء ہوئے۔ ان نوجوانوں کے غم و غصے کے پیچھے سالہاسال کی احساس محرومی اور معاشی عدم مساوات پر مبنی نظام تھا۔ ایک کروڑ اسّی لاکھ گریجویٹس نوکری سے محروم ہیں۔ بنگلہ دیش کی آبادی کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ 40 فیصد نوجوان طبقہ بیروزگار ہے۔

> **نوجوانوں نے فوجی قیادت میں عبوری حکومت کے قیام کو منظور نہیں کیا**

جن معاشروں میں مثبت انداز میں نوجوانوں کی فکری تربیت پر توجہ دی جاتی ہے وہاں کے نوجوانوں میں سیاسی بیداری ملکی مسائل کا ادراک اور بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ کسی ملک کا مستقبل اس کے نوجوانوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہی حصول تعلیم کے بعد آگے چل کر ملکی نظم ونسق میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔

رواں سال بنگلہ دیشی نوجوان طلبہ نے اپنے ملک کے جابرانہ فسطائی انداز کیخلاف احتجاجی تحریک کی قیادت کی وہ قابل تحسین ہے۔ 20 سال سے ملک پر آمرانہ انداز میں حکومت کرنے والی حسینہ واجد کو نہ صرف مسند اقتدار سے اتار پھینکا بلکہ فوجی قیادت میں قائم کی جانے والی کسی بھی عبوری حکومت کو ماننے اور اس کا حصہ بننے سے انکار کردیا۔ نامور ماہر اقتصادیات گرامین بینک کے بانی اور نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر محمد یونس جن کی بنگلہ دیشی معیشت کو مستحکم کرنے میں بڑی خدمات ہیں ان کی سربراہی میں عبوری حکومت قائم کروائی۔ جس کی 17 رکنی کابینہ میں طلبہ تحریک کے اہم رہنما ناہید اسلام اور آصف محمود بھی شامل ہیں۔

واضح رہے کہ یہ طلبہ تحریک شیخ حسینہ کے خلاف 1971 میں بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں حصہ لینے والے فریڈم فائٹرز کے بچوں اور ان کے پوتے پوتیوں یعنی ان کی تیسری نسل کو سرکاری ملازمتوں میں 30 فی صد کوٹہ دیے جانے کے خلاف ڈھاکہ یونیورسٹی سے شروع ہونے

# بنگلہ دیش فسطائیت سے حقیقی آزادی کی طرف

خالدہ ضیا

والا احتجاج تھا جو ریاست کی طرف سے طاقت کے بے دریغ استعمال کے بعد ملک بھر کی طلبہ تنظیموں کی اس میں شمولیت اور ان کی مشترکہ جدوجہد کا باعث بنا۔ اس کوٹے کا بڑا مقصد عوامی لیگ کو نوازنا اور ان کو بیوروکریسی اور انتظامیہ کا حصہ بنانا تھا تاکہ آمرانہ حکومت کو طول دیا جاسکے۔ حسینہ واجد نے طلبہ تحریک کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے مظاہرین کو دہشت گرد غدار اور رضا کار قرار دیا۔ رضا کار 1971 میں پاکستانی فوج کے حمایتی اور پاکستان کے حامی تھے۔

حسینہ واجد اپنے والد بنگلہ دیش کے بانی شیخ مجیب الرحمن کی موروثی اور نظریاتی سیاستی کی جانشین تھیں جو بھارت نواز اور پاکستان دشمنی پر مبنی تھی۔ انہوں نے ایسی آمرانہ طرز حکومت کو قائم کیا جس طرز حکمرانی پر ان کے والد مجیب الرحمن کو 1975 میں ڈھاکہ میں ان کے خاندان کے 18 افراد کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ جس میں ان کا 10 سالہ پوتا شیخ ارسل بھی شامل تھا۔

حسینہ واجد کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی حکومت سول ڈکٹیٹر شپ پر مبنی تھی جس میں پولیس فوج عدلیہ انتظامیہ، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ان کا مکمل کنٹرول تھا۔

ایک سیکولر رہنما کے طور پر دائیں بازو کی اپوزیشن جماعتوں بی این پی اور جماعت اسلامی کو بدترین ظلم اور بربریت کا نشانہ بنایا۔ ان کے ہزاروں کارکنوں کو جیل میں ڈالا۔ سیاسی انتقام کا نشانہ بنتے ہوئے سینکڑوں اپنی جان سے گئے۔

بی این پی کے سربراہ اور بنگلہ دیش کی سابق وزیر اعظم خالدہ ضیاء کو 6 سال پابند سلاسل رکھا حال ہی میں صدر مملکت کے حکم پر جیل سے رہا کی گئیں۔

جماعت اسلامی کے سینئر ترین بزرگ رہنماؤں کو پھانسی پر لٹکایا۔ اپوزیشن جماعتوں کو بری طرح کچلتے ہوئے ملک میں ایک پارٹی سسٹم رائج کیا۔

جنوری 2024 کے نام نہاد انتخابات میں دھاندلی کے بعد چوتھی بار اقتدار پر قابض ہوئیں۔

2018 میں ہائی کورٹ کی جانب سے 30 فیصد کوٹہ ختم کر کے 5 فی صد مقرر کر دیا گیا لیکن شیخ حسینہ چوتھی مرتبہ حکومت قائم ہونے کے بعد 4 جولائی 2024 کو ہائی کورٹ سے 30 فی صد کوٹہ بحال کرالیا۔

اس سماجی اور معاشی ناانصافی کیخلاف طلبہ تنظیمیں ہم آواز اور صف آراء ہوگئیں اور ملک گیر پیمانے پر اس کے خلاف احتجاج شروع ہوگیا۔

حسینہ واجد نے بنگلہ دیشی طالب علموں پر وہ انسانیت سوز مظالم ڈھائے جس کی مہذب دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔

بدترین ریاستی تشدد 200 سے زائد طلبہ کی ہلاکتیں بڑے پیمانے پر پولیس اور مظاہرین کی جھڑپیں۔ اسنیپر زشوٹنگ۔ بیلٹ گنز اور دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم اور انٹرنیٹ پر پابندی۔ فیس بک' انسٹا گرام' ٹوئٹر' براڈ بینڈ مکمل بند کر دیے گئے۔ دس ہزار سے زائد مظاہرین کو گرفتار کیا گیا۔ ملک میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

بعد ازاں سپریم کورٹ نے 30 فیصد کوٹے کو محدود کر کے 5 فیصد کر دیا۔ کوٹہ سسٹم کے خاتمے کے باوجود حکومت کے تحقیر آمیز رویے اور کشت وخون کا بازار گرم کرنے کے بعد احتجاجی مظاہرین کا مطالبہ صرف حسینہ واجد کا استعفیٰ ہوگیا۔ جس پر حکومت نے مزید سفاکیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے 4 اگاست اتوار کے دن 95 مظاہرین کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔ الجزیرہ چینل نے جسے Bloody Sunday بلڈی سنڈے کے نام سے موسوم کیا۔

ملک گیر ہنگاموں اور مشتعل ہجوم کو قابو کرنے کے لیے فوج نے عوام کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اور شیخ حسینہ کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا اور آرمی ہیلی کاپٹر میں بھارت روانہ کر دیا۔

## حسینہ واجد سول ڈکٹیٹر۔ پولیس فوج۔ عدلیہ انتظامیہ اور میڈیا پر مکمل کنٹرول

اس دوران فوج کا کردار اہم اور مثبت رہا جس کے وزیر اعظم کے مطالبے کے باوجود ملک میں طاقت کے استعمال کے امکان کو رد کرتے ہوئے عوام پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور ملک میں مزید انتشار اور بدامنی کو پھیلنے نہیں دیا۔

عوام کے غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ بابائے قوم بنگلہ بندھو شیخ مجیب الرحمن کی تصاویر کو نذر آتش کیا گیا۔ مجسموں کو مسمار کیا گیا۔ عوامی لیگیوں کی املاک کو نذر آتش کیا گیا۔ دھان منڈی میں مجیب الرحمن کی رہائش گاہ کو آگ لگادی گئی جس میں 6 افراد زندہ جل گئے۔

عوام فاتحانہ انداز میں وزیر اعظم ہاؤس میں داخل ہوگئے اور لوٹ مار اور توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ مجیب الرحمن کے مجسمے کو ڈھا دیا گیا۔

طلبہ تحریک کا پس منظر بنیادی وجوہات' ان میں پایا جانے والا احساس محرومی اور اس انقلاب کے محرکات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ملکی نظم و نسق سنبھالنے والے ذمہ داران اور حکمران طبقے کو

## بنگلہ دیش کے عوام نے بھارت نواز پالیسی مسترد کر دی

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔ ملکی مسائل کا حقیقی ادراک کرتے ہوئے معاشرے کی محروم طبقات کی آوازوں پر لبیک کہتے ہوئے ان کی محرومیوں کا بروقت ازالہ کرنا چاہیے۔ عدم تشدد کی سیاست کے ساتھ جمہوری طریقے سے بات چیت اور ڈپلومیسی کے ذریعے قومی مسائل حل کرنے چاہئیں۔ اتنے وسیع پیمانے پر ہونے والے جانی نقصان 32 بچوں سمیت 300 سے زائد احتجاجی مظاہرین کے قتل عام کی ذمہ داری عوامی لیگ اور بنگلہ دیشی وزیر اعظم حسینہ واجد پر عائد ہوتی ہے۔ ان قیمتی جانوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔

1971 میں بھی لاکھوں کی تعداد میں غیر بنگالیوں کا خون بہایا گیا۔

یہ مکافات عمل ہے اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہے کہ آج مجیب الرحمن اور حسینہ واجد عبرت کا نشان بن گئے ہیں۔ اور عوام ان کے خلاف نفرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ بنگلہ دیش فسطائیت کے سفر سے حقیقی آزادی کے سفر پر تیزی کے ساتھ گامزن ہونا شروع ہو چکا ہے۔

بنگلہ دیش کے عوام نے بھارت نواز پالیسی کو سختی سے مسترد کر دیا۔ مجیب کا نظریہ دفن ہوگیا اور دو قومی نظریہ آج بھی قائم و دائم ہے۔

”اطراف“ کمانڈر نعیم یوسف کا ممنون ہے کہ وہ اپنی بے حد مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنے ہم وطنوں کو احتیاطی تدابیر سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہماری درخواست پر انہوں نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہماری کوتاہی ہے کہ کسی مہینے ان کی تحریر کی اشاعت میں ناغہ ہو جاتا ہے۔ وہ سوشل میڈیا پر بھی باقاعدگی سے ایسی حفاظتی تدابیر آویزاں کرتے رہتے ہیں۔“

# گیس سلنڈروں سے ہونے والے دھماکوں سے بچاؤ کیسے

تحریر: کمانڈر نعیم یوسف
نیشنل ڈساسٹر مینجمنٹ اتھارٹی

ہر سال گھروں میں دکانوں میں اور مختلف آفسز میں گیس سلنڈر کے دھماکوں اور آگ لگنے کے واقعات سے درجنوں خواتین بچے اور مرد ہلاک اور جھلس کر زخمی ہوجاتے ہیں گیس سلنڈرز کے دھماکوں کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

1۔ ان میں سب سے بڑی وجہ ناقص سلنڈرز ہیں کیونکہ ہمارے ہاں نہ تو یہ عالمی معیار کے ہوتے ہیں اور نہ ہی مینوفیکچرنگ اور سیفٹی کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں بنایا جاتا ہے۔

2۔ اوگرا نے جن کمپنیوں کو سلنڈر بنانے کے لیے لائسنس جاری کیے ہیں ان سلنڈرز کو نہ تو عالمی معیار کے مطابق بنایا جاتا ہے اور نہ ہی ہر مرحلے پر چیک اینڈ بیلنس کیا جاتا ہے۔

3۔ سلنڈرز ری فلنگ کی دکانوں پر سیفٹی آلات اور بھرنے والے عملے کا تربیت یافتہ نہ ہونا۔

4۔ سلنڈر دھماکوں کی ایک اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سلنڈر استعمال کرتے ہوئے صارفین کا نہ تو احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اور نہ ہی وقفے وقفے سے ان سلنڈرز کو چیک کرنا کہ کہیں سے یہ لیک تو نہیں۔

5۔ شہروں، محلوں اور آبادی کے درمیان غیر قانونی فلنگ اسٹیشنز اور دکانوں کا قیام۔ جیسا کہ 30 مئی 2024 میں حیدر آباد کے علاقے پریٹ آباد میں گیس سلنڈر دھماکے کے نتیجے میں متعدد افراد ہلاک وزخمی ہوگئے جن میں بڑی تعداد خواتین اور بچوں کی ہے۔

اوپر بیان کی گئی ان وجوہات کے ساتھ آج کل گھروں، دکانوں اور ہوٹلوں میں گیس سلنڈر پھٹنے کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے جس کی وجہ سے ہر سال سینکڑوں قیمتی جانیں ضائع ہوجاتی ہیں۔

گیس سلنڈر میں دھماکوں کی اور بہت سے اسباب میں گیس سلنڈر، گیس کنکشن، ریگولیٹر، گیس کی لائنوں اور متعلقہ الات سے گیس کا اخراج ہے سلنڈر سے لیک ہونے والی گیس اگر کسی محدود جگہ یا کمرے میں جمع ہورہی ہے تو ایک معمولی سا اسپارک یا چنگاری یا بجلی کا سوئچ آن کرنے سے بھی گیس زوردار دھماکے سے آگ پکڑ لیتی ہے۔ یہ دھماکے مختلف دھماکہ خیز گیسوں کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں جن میں قدرتی گیس (متھین)، ایل پی جی، پروپین، بیوٹین اور ویلڈنگ کرنے والی آکسیجن گیسیں بھی شامل ہیں۔

## سلنڈر معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ غیر قانونی دکانیں

گیس سلنڈرز استعمال کرتے وقت اپنی، اپنے بچوں و اہل خانہ کی جان کی حفاظت کے لیے بیان کیے گئے ان مشوروں پر ضرور عمل کریں۔

## سلنڈر کے استعمال کی جگہ ہوا کا گزر یقینی بنائیں

1۔ جب آپ گیس سلنڈر استعمال کر رہے ہوں تو گیس سلنڈر بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں ور گیس کھولنے والے والو Valve کو مضبوطی سے بند کردیں تاکہ اگر کوئی بچہ سلنڈر تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہوجائے تو اس کا والو نہ کھول سکے۔

2۔اس بات کو یقینی بنالیں کہ آپ کا کچن اور وہ ایریا جہاں آپ کھانے پکانے کا کام کرتے ہیں۔ وہاں ہوا کی آمد و رفت کا یعنی Vantilation کا مناسب انتظام ہونا چاہئے تاکہ اگر کبھی کسی لمحے اگر گیس سلنڈر سے گیس لیک بھی ہوجائے تو وہ اس جگہ جمع نہ ہوسکے کیونکہ گیس اگر کسی کمرے میں جمع ہوگی تو دھماکے اور آگ لگانے کا سبب بن سکے گی۔

3۔جب بھی صبح یا کسی بھی وقت کچن میں چولہا جلانے جائیں تو کچن کی کھڑکی اور دروازے تھوڑی دیر کے لیے کھول دیں تاکہ اگر گیس لیک بھی ہورہی ہو تو کمرے میں جمع نہ ہوسکے گی اور دھماکے اور آگ کا خطرہ نہیں ہوگا۔

4۔لوگوں کو یہ تربیت لینا چاہئے کہ گیس سلنڈرز کو محفوظ طریقوں سے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

5۔گیس سلنڈرز کے ساتھ لگے چھوٹے مختلف آلات مثلاً گیس سلنڈر کا والو۔نلکی۔نوزل وغیرہ کو صابن یا سرف کے پانی کا جھاگ بنا کر اسفنج کے ٹکڑے کے ساتھ ان جگہوں پر یہ جھاگ والا پانی ڈالیں اگر بلبلے نکلنے لگیں تو سمجھ جائیں کہ آپ کے یہ آلات لیک ہیں ان سے گیس خارج ہورہی ہے فوری طور پر کسی اچھے پلمبر یا مکینک کو بلوا کر اسے درست کروالیں۔

6۔کمزور، زنگ آلو بہت زیادہ پرانے گیس سلنڈرز استعمال نہ کریں کسی بھی وقت کمزور باڈی ہونے کی وجہ سے ان کے پھٹنے کا خدشہ رہتا ہے۔

**5 سال میں ایک مرتبہ کسی معیاری کمپنی سے ضرور جانچ کروائیں**

7۔گیس سلنڈر کی باڈی Container کی میعاد پوری ہونے پر کسی اچھی معیاری کمپنی سے ان سلنڈر کی طاقت کا ٹیسٹ Hydrostatic Test کروالیں۔

8۔گیس سلنڈر کو کسی بھی آگ پکڑنے والے مادے سے 20 فٹ کے فاصلے پر رکھیں۔

9۔گیس سلنڈر کو خشک اور ہوادار جگہ پر رکھیں۔

10۔آکسیجن گیس سلنڈر کو مائع گیس سلنڈر سے کم از کم 20 فٹ کے فاصلے پر رکھیں۔

11۔جب گیس سلنڈر استعمال نہ ہو رہا ہو تو اس بات کو یقینی بنالیں کہ اس کا مین والو اور دوسرے حفاظتی آلات مضبوطی سے بند کردیے ہیں۔

12۔گیس سلنڈر کو کبھی بھی بند جگہ یعنی بند اسٹور یا بند لاکرز میں اسٹور نہ کریں کیونکہ اگر آپ نے گیس سلنڈر بند جگہ پر لاک کردیا ہو اور کسی وجہ سے اس بند جگہ میں طاقتور دھماکہ ہوگیا تو وہ پورے گھر یا پوری بلڈنگ کو زمین بوس کرسکتا ہے۔

13۔گیس سلنڈر آپ اگر استعمال کرتے ہیں تو 5 سال میں ایک مرتبہ کسی اچھی ٹیسٹ کرنے والی کمپنی سے اس سلنڈر کا Hydrostatic Test ضرور کرائیں۔

14۔ ہمیشہ گیس سلنڈر کو سیدھا یعنی عمودی Vetical کھڑا کریں۔اگر آپ نے گیس سلنڈر زمین پر لٹادیا تو اس میں لیک ہونے کے چانسز بڑھ جاتے ہیں۔

**سلنڈر کو آگ پکڑنے والے مادے سے 20 فٹ دور رکھیں**

15۔اگر ایل پی جی گیس سلنڈر کے خارج ہونے کی شرح اس کی مقرر کردہ حد سے زیادہ ہوگی تو گیس سلنڈر کی باڈی پر پانی کے قطرات کی شکل میں نمودار ہونے شروع ہوجائیں گے اور اگر یہ اخراج جاری رہا تو سلنڈر کی باڈی پر برف کی تاریک سی تہہ جمنی شروع ہوجاتی ہے جو حفاظتی اصولوں کے منافی ہے۔

16۔گیس سلنڈر چاہے کسی بھی قسم کا ہو اسے سورج کے سامنے دھوپ میں گرمی میں بارش میں یا گرد و غبار میں نہ رکھیں۔

17۔کسی بھی قسم کے کپڑے یا برتن سے گیس سلنڈر کو نہ ڈھانپیں۔

18۔گیس سلنڈر کو ہوسکے تو ایسی جگہ رکھیں جو ہوادار ہو۔

19۔گیس سلنڈر کو چولہے سے۔ ہر قسم کے الیکٹرک سے چلنے والے آلات اور حرارت اور آگ پیدا کرنے والی اشیا سے دور، مناسب فاصلے یعنی کم از کم 10 سے 20 فٹ کے فاصلے پر رکھیں۔

20۔اگر آپ اپنے گھر میں گیس سلنڈر استعمال کررہے ہیں تو اس بات کو یقینی بنالیں کہ یہ سلنڈر آپ کے گھر میں داخل ہونے اور باہر آنے والے راستوں یعنی Entry اور Exit پر نہ رکھے ہوں۔

21۔اگر آپ کہیں گئے ہوئے ہیں اور گھر واپس آتے ہیں تو گھر کا دروازہ کھولتے وقت بہت ہوشیاری سے یہ محسوس کرلیں کہ گھر میں کہیں گیس کی بو تو نہیں آرہی۔ گیس میں ایک خاص قسم کی بو ہوتی ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے اگر گیس کی بو کمرے میں داخل ہوتے ہی محسوس ہو تو کمرے کی لائٹ نہ جلائیں نہ موبائل استعمال کریں نہ ہی ماچس یا لائٹر جلائیں کیونکہ ایسا کرتے ہی کمرے میں موجود گیس ایک دھماکے سے آگ پکڑ سکتی ہے سب دروازے کھڑکیاں کھول دیں تاکہ گیس کمرے سے نکل جائے۔گیس ڈپارٹمنٹ کو فون کریں یا سلنڈر استعمال کرتے ہوں تو اسے باہر کھلی فضا میں لے آئیں اور چیک کریں۔

22۔اگر کسی کمرے میں گیس مسلسل لیک ہورہی ہے چاہے اس میں آگ نہ بھی لگی ہو تو ایسی صورت میں بھی اگر آپ سوئے ہوئے ہیں تو یہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ گیس زائد مقدار میں پھیپھڑوں میں جانے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے دم گھٹ سکتا ہے اور ہلاکت ہوسکتی ہے لہٰذا گیس سلنڈر اور گیس سے چلنے تمام آلات کو کم از کم ہر تین ماہ میں ایک بار ضرور ان کی کوالٹی اور لیکیج چیک کرتے رہیں۔

23۔اگر کوئی گیس سلنڈر لیک ہوگیا ہے تو اس کی لیکیج کو بند کرنے کا فوری طریقہ یہ ہے کہ گیس سلنڈر پر لگا ہوا والو بند کردیں اور اگر پھر بھی لیکیج ہورہی ہے تو سلنڈر پر لگے ہوئے ریگولیٹر کو سلنڈر کی باڈی سے علیحدہ کردیں۔ سلنڈر میں لگا ہوا والو خود بخود بند ہوجائے گا۔ ریگولیٹر کو سلنڈر کی باڈی سے علیحدہ کرنے سے پہلے کمرے کی کھڑکی اور دروازے کھول دیں تاکہ لیکیج کی وجہ سے کمرے میں جمع ہونے والی گیس باہر خارج ہوجائے۔ اس کے بعد آپ گیس سلنڈر کمپنی کو فون کرکے اپنی شکایت دور کرائیں۔

24۔ یاد رکھئے جہاں گیس سلنڈر رکھا ہو وہاں کسی بھی قسم کا الیکٹرک کا، ویلڈنگ کا، مشینوں کا کام یا کوئی بھی ہاٹ ورک Hot Work نہ کرائیں۔ ورنہ بہت بڑا حادثہ ہوسکتا ہے۔

25۔اگر گیس سلنڈر کسی بھی وجہ سے آگ پکڑ لے تو اس جگہ کو فوری طور پر خالی کردیں اس سے دور ہوجائیں۔ محفوظ مقام پر چلے جائیں۔

26۔اگر کبھی گیس سلنڈر لیک ہوجائے تو اوپر بتائے گئے طریقوں پر احتیاط سے عمل کرتے ہوئے اس کی گیس کو بند کردیں۔

**27 ہدایات پر عمل۔ اہل خانہ کی حفاظت کے لیے ناگزیر**

27۔اگر کبھی گیس سلنڈر کا والو آگ پکڑ لے تو بہت ہوشیاری سے بہت احتیاط سے اور مستعدی سے کوئی موٹا تولیہ یا موٹا پائیدان یا چادر گیلی کرکے اس کے والو یا برنر کے گرد سلنڈر سے محفوظ فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے گرد لپیٹ دیں آگ بجھ جائے گی اس کے بعد اس سلنڈر پر پانی ڈال کر ٹھنڈا کردیں کیونکہ گیس سلنڈر کمپنی سے مکینک آنے میں کچھ دیر لگ سکتی ہے ایسا نہ ہو سلنڈر میں لگنے والی آگ پورے گھر میں پھیل جائے۔

دنیا بھر میں ڈزاسٹر مینجمنٹ پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے اس لیے کہ قدرتی یا انسانوں کی وجہ سے آنے والی آفات و حادثات کہیں بھی، کسی بھی وقت آسکتے ہیں اگر ہم نے اپنے بچاؤ کے طریقے سیکھ لیے تو یقینا ہم نہ صرف اپنی، بلکہ اپنے بچوں، اہل خانہ اور پڑوسیوں کی جان بھی بچاسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب کو اور پوری دنیا اور انسانیت کو ہر طرح کی قدرتی اور انسانوں کی غلطی و کوتاہی کم علمی کی وجہ سے آنے والے حادثات سے اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھے۔ آمین ❁

## تذکرہ کتابوں کا

خان ظفر افغانی اس بار دو اہم کتابوں کا تذکرہ لے کر آئے ہیں۔ دونوں کے موضوعات الگ الگ ہیں۔ لیکن بہت تاریخی اور لائق تحسین و تحقیق۔ آغا شورش کاشمیری برصغیر کی اہم سیاسی۔ ادبی۔ علمی شخصیات میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی۔ پاکستان میں اظہار کی آزادی اور جمہوریت کے استحکام کے لیے ان کے ہفت روزہ 'چٹان' کا ایک اہم ترین مقام ہے شورش کاشمیری۔ انگریز کے دَور میں بھی زنجیریں پہنتے رہے۔ اور اپنوں کے عہد میں بھی۔ قلم فائونڈیشن ان کی تمام کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کر رہا ہے۔ دوسری کتاب تقسیم ہند کے ایک گوشے پر روشنی ڈال رہی ہے۔ پڑھئے اور دونوں کتابیں اپنے ذاتی کتب خانے کی زینت بنائیے۔

# "موت سے واپسی"

## زنداں میں شورش کاشمیری کے 232 دنوں کی سرگزشت

☆ خان ظفر افغانی

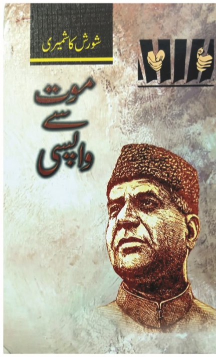


اصول پرستی وحریت پسندی، بیباکی و بہادری، عزم وہمت کا پیکر۔ خطیب، شاعر، صحافی وسیاسی رہنما آغا عبدالکریم شورش کاشمیری۔ ایسی شخصیت ہمارے معاشرے میں آج ناپید ہے۔ سیاسی، نظریاتی اختلاف تو کسی سے بھی ہوسکتا ہے لیکن ہر پہلو سے اعلیٰ کردار کا حامل ہونا، قابل رشک وموجب احترام ہے۔

پاکستان کے پہلے، غاصبِ اقتدار جنرل ایوب کے دَورِ آمریت میں آغا شورش نے زنداں میں جو 232 روز صعوبت کے گزارے ان کی سرگزشت ''موت سے واپسی'' کے عنوان سے قلمبند کر کے کتابی شکل میں اپنے ادارے ''مطبوعات چٹان'' (لاہور) کے زیر اہتمام 1972 میں شائع کی تھی۔ ہمارے ذخیرۂ کتب میں جو نسخہ موجود ہے وہ اشاعتِ دوم اکتوبر 1988 ہے۔ تازہ ترین اشاعت ''قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل'' (لاہور) کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔

زیر تذکرہ سرگزشت میں' آغا شورش نے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ سے ملاقات کے موقع پر ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا ہے کہ'' دوران گفتگو' میں نے اندازہ کیا کہ وہ سیاسی فہم بالکل نہیں رکھتے' اکل کھرے انسان ہیں' ان کے نزدیک غالباً ہر شخص کی قیمت ہے اور ہر قضیہ کسی معاوضے سے چکایا جاتا ہے۔ گورنر نے کہا' ان سے (جنرل ایوب) مل لو۔' میں نے عرض کیا جب بھی یاد کریں گے ضرور جاؤں گا۔ کہنے لگے' ان سے وقت لو اور چلے جاؤ۔'

میں نے ایک پچھلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اسی گورنر ہاؤس میں ملک امیر محمد خان گورنر اور شیخ خورشید احمد وزیر قانون کی موجودگی میں صدر سے ملا تھا' وہ مجھ سے تین سوا تین گھنٹے گفتگو کرتے رہے اور اپنے الطاف سے نوازنے کے خواہاں تھے۔

میں نے اُن سے کہا کہ سیاست میں روپیہ لے کر کام کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان خودکشی کر لے یا ماں' بہن' بیٹی کو بالا خانے پر بٹھا کر ان کی کمائی کھاتا رہے۔''

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو' الطاف گوہر نے صدر ایوّب پر اپنی دانشوری کا نقش بٹھانے کے لیے بہت سے دانش ور اپنے گرد جمع کر رکھے تھے اور ان سے مختلف سرکاری یا درباری مہمات میں کام لیتے رہے۔ دانش ور کا لفظ انہی کے عہد میں رواج پایا۔ ایک زمانہ تھا ان لکھاریوں کو اہل قلم کہتے تھے، پھر ادیب وشاعر۔ ترقی پسند مصنفین نے فنکار کے لفظ کو رواج دیا۔ جب لکھنے پڑھنے کی عادت شل ہوگئی تو وہ لوگ جن کی چرب زبانی کو تنقید یا تجزیہ کی چاٹ لگی ہوئی تھی دانش ور کہلانے لگے۔ وہ شخص جو اپنی کوئی تصنیف یا تالیف نہ رکھتا ہو لیکن ہر تصنیف اور تالیف پر تنقید کر سکے دانش ور تھا۔''

آغا شورش کی حریت پسندی، بے باکی، حکمرانوں اور ان کے کاسہ لیس ٹولے کی مخالفت کو خریدنے، دبانے کی بہت کوشش کی گئی، مال وزر کا لالچ دیا گیا، زنداں کی صعوبتوں کا نشانہ بنایا گیا لیکن کبھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دیکھئے ان کی عزم وہمت، اپنے اصولوں پر قائم رہنے کا عہد، ''کسی ماں نے آج تک وہ بچہ ہی نہیں جنا جو میرے قلم وزبان کو خرید سکے۔ میرے نزدیک قلم فروشی، عصمت فروشی سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی قبیح اور مکروہ ہے۔ قدرت نے قلم اس لیے نہیں دیا کہ بیچا جائے، اس سے بہتر ہے کہ ہاتھ شل ہوجائیں، زبان اس لیے نہیں بخشی کہ مرہونِ غیر ہو، ایسی زبان پر فالج گر جائے تو خدا کا احسان ہے۔''

یہ تھے آغا شورش جنہوں نے ہر حکومت کے ظلم وجبر، آمرانہ اقدامات کی کھل کر زبان وقلم سے مخالفت کی جس کی پاداش میں زنداں میں جانا مستقل رہا۔ زیر تذکرہ کتاب زنداں کی سرگزشت ہے جو 232 دنوں پر مشتمل ہے۔ اسے پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ وطن عزیز میں ایسے بہادر، اصول پرست، جمہوریت پسند لوگ بھی سیاست وصحافت کے میدانوں میں ہوتے تھے جنہیں نہ خریدا جاسکا اور نہ جھکایا جاسکا! قید کے دوران آغا شورش نے 52 روز بھوک ہڑتال کر کے حکمرانوں کو گھٹنے ٹکوا کر اپنے مطالبات منوائے۔

کتاب کے ناشر عبدالستار عاصم کہتے ہیں کہ ''پسِ دیوارِ زنداں اُن پر جو کچھ بیتی وہ حیرت انگیز داستان ہے جسے آغا صاحب نے اپنے قلم سے صفحۂ قرطاس پر رقم کر کے' موت سے واپسی' کا عنوان دیا۔ 240 صفحات پر

محیط یہ داستانِ اسیری چشم کشا بھی ہے اور سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ ظلم و زیادتی کے بھیانک چہرے پر زوردار طمانچہ بھی ہے۔ ’قلم فاؤنڈیشن‘ کو یہ اعزاز حاصل ہونے جارہا ہے کہ ہم آغا صاحب کی تمام کتب جو ’مکتبۂ چٹان‘ کی ملکیت ہیں، آغا صاحب کے صاحب زادوں کی زیرنگرانی ایک نئی آب و تاب سے شائع کر رہے ہیں۔‘‘

مضبوط جلد میں سمائی ہوئی اس کتاب کی قیمت ہے پندرہ سو روپے۔ جب اس داستانِ اسیری کا مطالعہ شروع کیا جاتا ہے تو اس کی ہر سطر، پڑھنے والے کو جکڑے رکھتی ہے اور یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مطالعہ ایک ہی نشست میں مکمل ہو جائے۔

جی چاہ رہا ہے کہ آغا شورش کی تحریر سے چند سطریں مزید پیش کی جائیں:

’’میرے نزدیک وہ تمام ادیب، شاعر، صحافی، واعظ، مقرر اور خطیب، بالا خانوں کی مخلوق ہیں جنہوں نے جوہرِ قلم اور جوہر زبان کو بازار کی جنس بنا دیا ہے اور جن کا خیال ہے کہ انہیں دربار کی چوکھٹ پر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ میں اس کا نام عبرت ہے۔‘‘

# ’’مال گاڑی میں امانتیں‘‘

## چوہدری محمد اسماعیل کی کہانی، محمد حنیف بندھانی کی زبانی

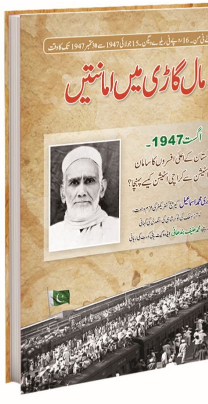


14 اگست 1947! برصغیر میں ایک نئی مملکت کے قیام کا دن۔ جسے قائم ہوئے اس سال‘ 2024 میں 77 برس ہوئے۔ ان برسوں میں اس مملکت پاکستان کے قیام کے حوالے سے مورخین نے تاریخی واقعات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اس مملکت کے وجود میں آنے کی وجوہات، مہاجرین کا قتل عام، بھارت و پاکستان میں اثاثوں کی تقسیم، دستاویز کا ذکر تاریخ کا قصّہ ہے۔ قیام پاکستان کی تاریخ بہت المناک ہے جسے مورخین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں نے بھی اپنا موضوع بنایا جو کتابوں کی شکل میں محفوظ ہو گیا۔ لیکن اس سال یعنی 2024 میں ایک ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جو منفرد اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں دونوں ممالک کی مختلف وزارتوں کے درمیان ہونے والی خط کتابت کے عکس دیے گئے ہیں۔ مختلف ادائیگیوں اور معاہدات کے عکس ہیں اور یادداشتیں ہیں۔ یہ قومی خزانہ ہے، قومی دستاویز ہے جو ’’مال گاڑی میں امانتیں‘‘ کے عنوان سے کتابی شکل میں ’’اطراف مطبوعات‘‘ نے شائع کیا ہے۔

اس قومی دستاویز کے حصول اور اسے کتابی شکل میں محفوظ کرنے کے لیے قابل آفریں ہیں ہمارے شام جی جن کا زرخیز ذہن انوکھے موضوعات، تاریخی واقعات و معلومات کی کھوج میں رہتا ہے۔ ’’مال گاڑی میں امانتیں‘‘ اس جستجو اور لگن کی عملی شکل ہے۔

اس بارے میں شام جی بتا رہے ہیں کہ ’’14 اگست جب بھی آتی ہے، برصغیر کے تاریخی ہنگامے، مہاجر کیمپ، ریلیاں، شہادتیں، بلوے، فسادات بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔ میں کثیرالاشاعت اُردو اخبار، روزنامہ جنگ میں تین چار سال قبل یہ سوچ رہا تھا کہ نئی نسل کو ان مہاجر کیمپوں کی یاد دلاؤں جو اگست 1947 میں بھارت میں اپنے ہنستے بستے گھر بار، دکانیں، دفاتر، زمینیں، باغات چھوڑ کر آنے والوں کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ تجسس یہ تھا کہ پہلا کیمپ کہاں قائم ہوا، آخری کیمپ کونسا تھا، اس میں کتنے خاندان تھے۔ بہت سی کتابیں نظر سے گزریں، نیٹ پر بہت کوششیں کیں۔

ان ہی دنوں میں جن دردمند پاکستانیوں سے رابطہ استوار ہوا، ان میں سے ایک بہت سینئر ماہر قانون محمد حنیف بندھانی ایڈووکیٹ ہیں۔ جب ہمیں معلوم ہوا کہ ان کے عظیم والد چوہدری محمد اسماعیل نے قیام پاکستان کے حوالے سے ایک اہم ذمے داری بھی ادا کی کہ مرکز کے جن اعلیٰ سرکاری افسروں نے حکومت پاکستان سے وابستگی کا انتخاب کیا، ان کے گھریلو سامان، کاغذات، فرنیچر اور کتابوں کی بھارتی دارُالحکومت دہلی ریلوے اسٹیشن سے پاکستانی دارُالحکومت کراچی کے کینٹ ریلوے اسٹیشن تک منتقلی کا ٹھیکہ انہیں ملا تھا۔ اس سے متعلقہ بہت سی دستاویزات، خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں۔

ایک روز حنیف بندھانی صاحب یہ 76 سالہ پرانا اثاثہ اپنے ساتھ لے کر ’اطراف‘ کے دفتر تشریف لائے۔ بہت ہی اہم اور حساس معلومات سے مرصّع۔ ہم نے عرض کی کہ پہلے تو ان کو دستبرد زمانہ اور ماہ و سال کی گرد سے محفوظ کیا جائے، پھر انہیں ترتیب دے کر ایک قومی دستاویز کی شکل میں قوم کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ نئی نسل تک یہ پیغام پہنچے کہ پاکستان نے کس کرب میں جنم لیا اور سرکاری افسروں کی امانتیں کس ماحول، کس انداز میں صدیوں پرانی راجدھانی سے ایک نوزائیدہ ملک کے بالکل نئے سرے سے قائم ہونے والے دارُالحکومت میں کیسے پہنچیں!

یہ امانتیں چوہدری محمد اسماعیل بلووں، فسادات، ٹرینوں پر حملوں کے درمیان کراچی ساتھ لائے۔ یہ ایک اہم تاریخی ذمے داری تھی۔

’اطراف‘ یہ قومی خزانے قارئین اور پاکستان کے عوام کی خدمت میں ’مال گاڑی میں امانتیں‘ کے نام سے پیش کر رہا ہے۔‘‘

قارئین کرام! یہ کتاب تاریخی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز داستان ہے کہ عام آدمی، کتنا خاص کردار ادا کر رہا ہے، تاریخ رقم کر رہا ہے۔ اور نوزائیدہ مملکت کے ذمہ داران کے کیسے رعونت بھرے رویے ہیں! عظیم باپ کے بیٹے کی زبانی اس داستان کا ’’یادداشتوں کا مطالعہ، قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں کے واقعات و ماحول کی تصویر بن کر سامنے آجاتا ہے۔

’اطراف مطبوعات‘ کی یہ پیشکش 160 صفحات پہ محیط ہے۔ اس کی قیمت ہے بارہ سو روپے۔ کتاب کے حصول کے لیے سرکولیشن منیجر راجہ شاہد (0300-8210636) سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

# SBCA اور SDA سے منظور شدہ مین ایم 9۔ موٹر وے پر بن احسان گرین سٹی فیز I اور II میں ترقیاتی کام جاری ہیں

## بن احسان گرین سٹی فیز I اور II

ماہنامہ اطراف کراچی کی ایک فخریہ تحقیقی پیشکش

دسمبر 2024 کے کتاب نمبر میں

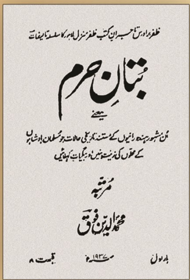


# مسلمان بادشاہوں کی ہندو رانیاں

محمد بن قاسم سے لے کر آخری مغل بادشاہ تک جو محلوں کی زینت بنیں۔ اور بیگمات کہلائیں

**1937 میں شائع ہونے والی مستند تاریخی دستاویز**

فوراً مستقل خریدار بنئے۔ رابطہ: 0300-8210636

---

حیدرآباد سندھ میں ماہنامہ اطراف کراچی کے

## بیورو چیف پروفیسر شاداب احمد صدیقی

بہت شیریں بیان۔ سخن فہم اور حرف مطبوعہ کے عشاق میں سے حیدرآباد اور اس کے مضافات کے تمام اہل قلم۔ دانشور۔ ماہرین تعلیم ومعیشت سے رابطہ کر رہے ہیں۔ آپ سے مکمل تعاون کی درخواست ہے۔ 'اطراف' میں اپنی تحریریں۔ بیانات۔ تصاویر۔ اشتہارات کی اشاعت کے لیے ان سے رابطہ کریں۔ 'اطراف' کی سالانہ خریداری کے لیے بھی اسکول۔ کالج یونیورسٹیاں ان کو زحمت دے سکتی ہیں۔

رابطہ فون: 0332-2640840

---

ممتاز قلم کار۔ صحافی۔ دردمند پاکستانی

## عاصم متین خان

نے امریکہ میں ماہنامہ اطراف کراچی کے نمائندہ خصوصی بننے کی پیشکش قبول کر لی ہے۔

وہ ہر مہینے امریکہ کی سیاسی۔ سماجی۔ ادبی صورت حال پر قارئین 'اطراف' کی آگاہی کے لیے مکتوب ارسال کریں گے۔

امریکہ میں مقیم پاکستانی ماہنامہ 'اطراف' میں اپنے مضامین کی اشاعت اپنی کتاب پر تبصرے 'اطراف لاؤنج' میں اپنی اور اہل خانہ کی تصاویر کی اشاعت کے لیے ان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

آن لائن خریداری کے لیے بھی ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔

1 (516) 647-6408 ppanews@aol.com

# اطراف لاؤنج

## محمد اسلم قریشی۔ حیدر آباد

انٹرنیشنل باکسنگ ریفری
اور باکسنگ جج
**محمد اسلم قریشی**
حیدر آباد، سندھ

انٹرنیشنل باکسنگ ریفری اینڈ جج محمد اسلم قریشی پاکستان کا وہ درخشاں ستارہ ہیں جو کم وسائل کے باوجود اپنی محنت کے بل بوتے پر ملک وقوم کا نام روشن کررہے ہیں۔ دنیا بھر میں پاکستان کی نمائندگی کرنے اے محمد اسلم قریشی کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ محمد اسلم قریشی نے دوران تعلیم 1975 میں باکسنگ کا آغاز مون اسٹار باکسنگ کلب سے کیا۔ زندگی کا پہلا مقابلہ 15 جون 1975 کو پکے قلعے میں کیا۔ 1978 میں پاکستان کی جونیئر ٹیم میں منتخب ہوئے اور انٹرنیشنل باکسنگ ٹورنامنٹ میں کانسی کا تمغہ حاصل کیا۔ 1979 میں پاکستان نیوی میں شمولت اختیار کی اور 1980 میں پاکستان گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1979 میں پاکستان ریلوے میں چلے گئے۔ دو مرتبہ پاکستان ریلوے چیمپئن رہے۔ 1982 میں پاکستان CAA میں منتخب ہوئے۔ اس کے بعد دس سال تک نیشنل سندھ گیمز میں سرفہرست رہے۔

تحریر: شکیل قریشی

'اطراف' کا ایک مقبول سلسلہ دوبارہ شروع کیا جارہا ہے۔ آپ بھی اپنی تصاویر اور تعارف بھیج سکتے ہیں۔ 0300-8210636

# ’’پاکستان لائبریری‘‘ کا وطن عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دو لاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے (Rs:30,000) میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اور اپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اور اپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: 100 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

**قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں**
**کتابیں ایک سو ایک، مقصد اعلیٰ اور نیک**

## قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

ای میل: qalamfoundation2@gmail.com 0300-0515101 / 0309-4105484

Prime Real Estate, Worldwide!
STAR
Marketing (Pvt.) Ltd.
رئیل اسٹیٹ مارکیٹنگ کی
برانڈ لیڈرشپ
– پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں دفاتر
– سیلز اور مارکیٹنگ کے ماہرین کی کامیاب ترین ٹیم
– تخلیقی ایڈورٹائزنگ کی بے مثال مہارت
– پراپرٹی مارکیٹنگ کی مقبول ترین ویب سائٹ
– ملک گیر اور انٹرنیشنل ایڈورٹائزنگ کی سہولیات
– سیلز اور ریکوری کی خدمات
– پاکستان میں کامیاب ترین منصوبوں کی مارکیٹنگ
– مختلف ممالک میں ہزاروں کسٹمرز
– یورپ، امریکہ، کینیڈا اور مڈل ایسٹ میں نمائندگان
– ہزاروں مطمئن خریداروں کا ڈیٹا بیس
– لوکل پراپرٹی ڈیلرز کا نیٹ ورک
– رہائشی اور کمرشل منصوبوں کی تیز ترین خرید و فروخت
– کامیاب منصوبوں کی شرح، سب سے زیادہ
– پاکستان بھر کے بلڈرز کا حتمی انتخاب
– اعلیٰ ترین ٹی وی کمرشلز کی پروڈکشن
– ریسرچ اور سروے کی خدمات
– بلڈرز اور ڈویلپرز کیلئے کامیابی کے پلان
– 24 گھنٹے کام کرنے والی ہیلپ لائنز
– آؤٹ ڈور ایڈورٹائزنگ
– پروفیشنل ماہرین کی بہترین ٹیم
– بین الاقوامی ایکسپوز میں شرکت
111-111-160
www.starmarketingonline.com
KARACHI - ISLAMABAD - LAHORE - PESHAWAR
NOWSHERA - MULTAN - HYDERABAD
MANHILL

AL MASHWAN TRAVEL AND TOURS
From anywhere to anywhere
in the World
We are just a phone call away
021-34545100
0300 8220435
PLAN YOUR UMRAH NOW
JOURNEY OF THE HEART
PACKAGE INCLUDES
VISA | AIR TICKET | ACCOMODATION | GUIDES | GROUND
TRANSPORT | HISTORICAL SITES TOUR IN MAKKAH MUKARRAMA & MADINAH MUNAWARA
More information call / Whatsapp
+92 0300 8220406
+92 0300 8220407
BOOK NOW
almashwan
Address:
Plot No136 Muslim Colony, Shahrah-e-Faisal Rd, near FTC Building, Block B Sindhi Muslim CHS (SMCHS), karachi, Sindh 75350.

Bridging Extremes

Monthly "ATRAAF" Karachi

October 2024

Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com